خوابِ جوانی

ایم۔ اسلم

پیش لفظ

زندگی کی داغ بیل واقعات سے پڑتی ہے۔آپ حوادث کو بھی اس میں شامل کرلیں تو کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ حقیقت میں ہماری زندگی حادثات سے ہی عبارت ہے اور یہی حادثات انسان کو پختہ کار بناتے ہیں۔کمزور طبائع زندگی کی ناکامیوں کا ذمہ دار زندگی کے واقعات کو ٹھہراتی ہیں اور اس نکتہ کو بالکل نظر انداز کر دیتی ہیں کہ واقعات کو ڈھب پر لانے کی باگ ڈور قدرت نے خود ہمارے ہی ہاتھ میں دے رکھی ہے یعنی انسان اپنی قسمت کا خود مالک ہے۔میں اس نظریہ کا قائل نہیں کہ انسان قسمت کے بتائے ہوئے راستہ پر چلتا ہے۔ایک اشرف المخلوقات اور قسمت سے مجبور ......!غلط!اشرف المخلوقات ہونے کا مطلب ہی یہی ہے کہ وہ اپنی تقدیر کا خود ذمہ دار ہو۔اوراق تاریخ ایسے واقعات سے لبریز ہیں کہ معمولی معمولی آدمیوں نے محض عزم اور حوصلہ سے بلند سے بلند مقام حاصل کیے ہیں اور ہمت اور استقلال سے دنیا کے سامنے حیرت انگیز مثالیں پیش کی ہیں۔حکیم مشرق علامہ اقبالؒ نے بھی یہی نظریہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے کہ

؎ نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

آئین قدرت یہ ہے کہ ایک باہمت آدمی ہمت کے ثمر سے کبھی محروم نہیں رہتا۔اور وہ لوگ جو یہ کہہ کر کہ جو قسمت میں ہوگا ہو کر رہے گا اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہتے ہیں نہ کچھ اپنا سنوارتے ہیں نہ کسی دوسرے ہی کو ان کی ذات سے فائدہ ہو سکتا ہے۔اگر نظامِ قدرت پر غور کیا جائے تو یہ نکتہ آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے کہ چلتی کا ہی نام گاڑی ہے۔داناؤں کا کہنا ہے کہ دنیا ایک کھیل یا تماشہ ہے۔لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ یہ تماشہ یا کھیل بنا کیسے؟محض انسان کی تگ ودو سے۔اور اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ ہوتا وہی ہے جو قسمت میں ہو تو پھر انسان کی یہ تگ ودو کیسی؟انسان کی اسی تگ ودو کا دوسرا نام دنیا ہے اور زمانہ اس کا شاہد ہے کہ اس دنیا میں کامیاب صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنی کوششوں میں کسی قسم کی کمی نہیں ہونے دیتے۔یعنی بقول حضرت اقبالؒ؟

؎ گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقشبند
میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں

اور فغاں کی یہی رستخیز حوصلوں کو بلند اور عزائم کو محکم کرتی ہے۔اہل دانش کے نزدیک خرد کا دوسرا نام وسعتِ نگاہ ہے۔وسعت نگاہ کو ہم چاہیں تو ایک قوت بھی کہہ سکتے ہیں۔ایک ایسی قوت جو فہم وادراک کی حدود کو ایک دوسرے سے ملا سکتی ہے اور جسے یہ قوت حاصل ہو دنیا اسے صاحب نظر کہتی ہے۔قوم یا خاندان میں اگر کوئی صاحب نظر ہو تو قوم یا خاندان کو چشم جہاں میں عزت اور وقار حاصل ہوتا ہے اور اس کے تدبر اور تدبیر سے بگڑے ہوئے کام بھی بن جاتے ہیں۔یہ جوہر خدا کی دین ہوتا ہے۔عمر کے ساتھ ساتھ یہ جوہر نشوونما پاتا ہے۔لیکن وہی بات کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔دیکھنے اور سمجھنے والے ابتدا ہی میں اس سے آس اور امید لگائے ہوتے ہیں اور ان کی یہ آس یا امید مشکل ہی سے کبھی ایک خواب پریشاں

ثابت ہوتی ہے۔''خواب جوانی'' بھی ایک ایسے ہی نوجوان کی سرگزشتِ حیات ہے۔جس نے زندگی کی ابتدائی منازل میں ہی اپنے لئے یہ اصول بنا لیا تھا کہ بقول اقبالؒ ؎

تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے

جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

اور اسی اصول پر کاربند ہونے سے وہ اپنے مقصد حیات میں کامیاب ہو جاتا ہے عمر کا وہ حصہ یعنی ابتدائی دور جس میں انسان فکر سے بے پروا رہتا ہے اور مآل اندیشی سے ایک قسم کی نفرت سی ہوتی ہے۔اس نوجوان کیلئے یہی دور دورِ حوادث ہے اور جب ہم ان حادثات پر غور کرتے ہیں اور نوجوان کی عمر پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اسکا ثابت قدم رہنا محض ایک معجزہ ہی معلوم ہوتا ہے۔لیکن یہ کوئی انوکھی مثال نہیں۔دنیا اپنے ہر دور میں اس قسم کے صاحب نظر پیدا کرتی ہی رہتی ہے۔ہم زمانے کی رفتار کو کبھی بدل نہیں سکتے زمانے کی چکی جس طرح روز اول سے چل رہی ہے اسی طرح روز آخر تک چلتی رہے گی۔لیکن بحیثیت ایک اشرف المخلوقات،ہم زمانہ کی رفتار سے فائدہ ضرور حاصل کر سکتے ہیں اور فائدہ حاصل کرنے کیلئے بقول حالی ؎

چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی!

زمانے کا ساتھ دینا پڑتا ہے۔لیکن یہ بے مہر زمانہ قدم قدم پر رکاوٹیں ڈالتا ہے۔یہ فلک کبود چرکے پر چرکے لگاتا ہے۔دنیا اور دُنیا والے درپے آزار رہنے کی قسم کھائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔یار و احباب سے جو اُمیدیں وابستہ ہوتی ہیں پیہم ناخوشگوار واقعات سے ان پر اُداسیاں چھا جاتی ہیں۔تفکرات کی گھٹائیں دل و دماغ پر محیط رہتی ہیں لیکن بلند عزائم والوں کا خون ہمیشہ گرم رہتا ہے اور اسی خون کی گرمی سے ہماری امیدوں کی ڈوبتی ہوئی ناؤ سلامتی کے کنارے پر جا لگتی ہے۔علامہ اقبال نے غالباً ایسے ہی باہمت لوگوں کو یہ سبق دیا ہے کہ

؎ حدیثِ بے خبران ست با زمانہ بساز

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز!

''خواب جوانی'' کا ورق ورق ''زمانہ با تو نسازد'' کی تفسیر ہے۔لیکن جس نوجوان نے ''تو با زمانہ ستیز'' کا سبق پڑھا ہو وہ زمانے کی کب پروا کرتا ہے اور اسی ''تو با زمانہ ستیز'' کے جادو سے ''خواب جوانی'' کی تعبیر خوشگوار نظر آتی ہے اور مات پر مات کھا کر پریشان نہ ہونے والا ہمت نہ ہارنے والا نوجوان ہم چشموں میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

لکھنے والے کے پیش نظر ایک مقصد ہوتا ہے۔ابتدا میں تو محض ایک شوق لیکن پختہ قلم ہونے کے بعد کوئی مصنف محض شوقیہ نہیں لکھتا۔بلکہ اس کے مدنظر ایک پیغام ہوتا ہے۔اس سے بحث نہیں کہ اس پیغام کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔بس اتنا کہنا ہی غالباً کافی ہوگا کہ فکر ہر کس بقدر ہمتِ اوست۔طبیعت اگر سلجھی ہوئی ہو اور تربیت ایسے ماحول میں ہوئی ہو جہاں تربیت کے ذمہ داروں کو اپنے فرض کا احساس ہو تو لکھنے والے کو دنیا سے روشناس ہونے کے بعد اپنے فرض کا احساس ہونے لگتا ہے اور یہی وہ احساس ہے جو اسے سیدھے راستہ پر ڈال دیتا ہے اور قوم و ملت کو اُس کی تحریر سے تفنن کے علاوہ کوئی کام کی بات بھی حاصل ہو جاتی ہے۔اس دور میں لکھنے والوں کا ایک گروہ ''ترقی پسند'' کا دم چھلا اپنے نام کے ساتھ لگانے کا بہت آرزومند نظر آتا ہے۔ ''ترقی پسند'' کے لقب یا نام میں خوبصورتی تو واقعی ہے لیکن فی الحال جاذبیت پیدا نہیں ہوئی اور نہ ہی پیدا ہونے کا کوئی

امکان ہے اور غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ فطرتاً ہر انسان ترقی پسند ہے۔ پیشہ کے لحاظ سے وہ کوئی بھی کام کرتا ہو اپنے کام یا پیشہ میں ترقی کا ہر وقت جو یا نظر آتا ہے اور جب زمانہ ترقی کر رہا ہو تو کیسے ہوسکتا ہے کہ ہمیں ترقی کرنے کی خواہش نہ ہو۔ ادب کوئی انوکھی چیز نہیں۔ ہر ادیب کو قدرتی طور پر یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ ادب کے میدان میں دوسروں سے بازی لے جائے۔ کوئی ناثر ہو یا ناظم اس کی یہی کوشش ہوگی کہ اہلِ نظر میں وہ قدر اور عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ اور اس کا کلام نظم ہو یا نثر قبول عام کی سند حاصل کرے۔ موجودہ دور میں ''ترقی پسند'' بڑے نام کا بت تو ضرور ہے لیکن اندر سے بالکل کھوکھلا۔ ''ترقی پسند'' کہلانے والے گروہ نے خود بھی اور دوسروں سے بھی اپنے متعلق بہت کچھ لکھوایا اور کہلوایا ہے لیکن کیا تماشہ ہے کہ یہ آج تک معلوم نہیں ہوسکا کہ ''ترقی پسند'' سے مطلب کیا ہے۔ ہاں ایک امتیاز اس گروہ کو واقعی حاصل ہے اور اس امتیاز کے لحاظ سے یہ حضرات اگر ''ترقی پسند'' بنتے ہوں تو پھر انکار کی گنجائش نہیں اور وہ امتیاز یہ ہے کہ اس گروہ کی روش ملحدانہ ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس دعوی کی دلیل ان ترقی پسند کہلانے والوں کی نظم اور نثر ہے اور یہ اسی ''ملحدانہ روش'' کا اثر ہے کہ اس ترقی پسند ادبی گروہ کا میلان طبع زیادہ تر فحاشی اور عریانی کی طرف ہے۔ اس گروہ میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔ اور کچھ عورتیں تو تحریر کی بے باکی میں مردوں کے بھی کان کاٹتی ہیں۔

ادب کا صحیح مفہوم قوموں کی تعمیر ہے اور ادب برائے ادب کا دور اگر فرض کر لیا جائے کہ ختم ہو چکا ہے اور اب ادب برائے زندگی کا زمانہ ہے تو زندگی کے لئے صرف وہی ادب مفید ہوسکتا ہے جو زندگی کی تعمیر میں انسان کو مدد دے۔ آپ چاہیں اسے ترقی پسند ادب کہہ لیں۔ لیکن وہ ادب جو ہمارے نام نہاد ترقی پسند دوست پیش کر رہے ہیں اس میں سب سے زیادہ تخریب کا پہلو نظر آتا ہے اور جیسا کہ ابھی کہا جا چکا ہے کہ اس دعویٰ کی دلیل میں ان حضرات کے رشحات قلم پیش کئے جاسکتے ہیں۔ جس طرح تخریبی تنقید سے کوئی مفید مطلب حاصل نہیں ہوسکتا اسی طرح اس قسم کے تخریبی لٹریچر سے بھی پڑنے والے کو سوا اس کے کہ دل میں فاسد خیالات پیدا ہوں کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ادب برائے زندگی کا تو یہ مطلب ہونا چاہئے کہ وہ ادب جو زندگی کو کندن کی طرح چمکا دے۔ جو زندگی کی نئی نئی راہیں کھول دے اور ان نئی نئی راہوں کا دوسرا نام ترقی پسندی ہے لیکن وہ ادب جو یہ ترقی پسند پیش کر رہے ہیں وہ نئی نئی راہیں تو ہمیں دکھاتا ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ یہ راہیں ہمیں اس منزل کی طرف لے جاتی ہیں جہاں جنسی خواہشات کی تکمیل کا سامان ارزاں ہوتا ہے یا ملک و ملت سے غداری۔

اس کتاب کا ہیرو بھی ایک ترقی پسند نوجوان ہے اور یہ داستان اس بات کا بین ثبوت ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں ایک ترقی پسند ہے اور اس کی زندگی دوسروں کے لئے مشعل راہ کا کام دے سکتی ہے۔ اس ناول کے پس منظر میں آپ کو سیاسی جھلکیاں بھی نظر آئیں گی اور میرے خیال میں اس زمانے میں یا اس دور میں جس سے ہم آج کل گزر رہے ہیں۔ کوئی ناول اس وقت تک مکمل نہیں کہلا سکتا جب تک سیاست حاضرہ کا کسی نہ کسی صورت سے اس میں ذکر نہ ہو۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ یہ ایک سیاسی ناول ہے اور مصنف نے اپنا سیاسی نظریہ واضح کرنے کے لئے قلم اٹھایا ہے ''خوابِ جوانی'' ایک رومان ہے اور گو اس میں عام رومانوں کی طرح آپ کو عشق کی گرمیاں اور حسن کی شوخیاں تو شاید کہیں نظر نہ آئیں لیکن صفحہ صفحہ پر زندگی نئی کروٹیں لیتی ہوئی ضرور نظر آئے گی۔ اور زندگی کی اس ہر کروٹ میں آپ کو ایک رومان ملے گا۔ ایک الم انگیز رومان' لیکن اس کہانی کا انجام آپ دیکھیں گے کہ کیسا طرب انگیز رومان ہے۔

(ادارہ)

مولوی دلدار حسین

حرص کی کروٹیں ہر گام پہ توبہ توبہ
چُن لی پلکوں سے چمک زر کی جہاں بھی پائی
اتنی بے ذوقی سے ہر چیز کی کایا پلٹی
کانچ کے ٹکڑوں نے ذروں کی جگہ اپنائی

کسی زمانے میں سادہ لوح دہقانوں میں کسی پیر مہتاب شاہ کی کرامات کے بڑے چرچے تھے اور دور دور سے حاجت منداس کے پاس آتے۔ مہتاب شاہ معتقدوں کو تعویذ لکھ کر دیتا اور تعویذ کا معاوضہ جسے وہ ہدیہ کہتا لوگوں سے حسب حیثیت وصول کرتا۔ جس گاؤں میں سائیں یا پیر مہتاب شاہ رہتا تھا اس کے عقیدت مندوں نے وہاں اس کی رہائش کو ایک پکا مکان بنا دیا تھا۔ یہ مکان جیسے باہر سے خوبصورت تھا ویسے اندر سے بھی خوب آراستہ تھا۔ اعلیٰ نسل کی دو چار بھینسیں اور گائیں تھان پر بندھی نظر آتیں۔ سواری کے لئے دو عمدہ قسم کے گھوڑے بھی تھے۔ رہے نوکر چاکر تو ان کی بھی اس کے یہاں کچھ کمی نہ تھی۔ آپ یوں سمجھئے! سارا گاؤں ہی اس کی خدمت کرتا تھا۔

سائیں مہتاب شاہ سال میں ایک بار اور وہ بھی عموماً سردیوں کے موسم میں شہر بھی جایا کرتا اور یہاں اس کا قیام شہر کی کسی مشہور رنڈی کے مکان پر ہوتا۔ پیر مہتاب شاہ کی کوئی اور کرامت ہو یا نہ ہو لیکن اس کی ایک کرامت تو عام طور پر مشہور تھی۔ یعنی اُس وقت بھی جب کہ اُس کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی اس کی چار بیویاں تھیں اور چاروں ہی مل کر رہتیں۔ چاروں بیویوں نے اپنے اپنے دن مقرر کر رکھے تھے یعنی ان دنوں میں جو نذر نیاز آتی وہ لے لیتیں۔ ایک کو دوسری کی آمدنی سے کچھ سرو کار نہ ہوتا مہتاب شاہ نے جمعرات کا دن تعویذ گنڈا دینے کو مقرر کر رکھا تھا۔ اس روز وہ اپنے ایک خاص حجرے میں آ بیٹھتا اور جس بیوی کی باری ہوتی وہ بھی پاس آ بیٹھتی اور نذر نیاز کے روپے اور کھانے پینے کا سامان سمیٹتی جاتی۔ ان چاروں بیویوں میں سے صرف دو عورتوں کے دو لڑکے تھے۔ بڑے لڑکے کا نام دلدار حسین تھا اور چھوٹے کا دلاور حسین۔ مہتاب شاہ کو دلدار حسین سے بڑی محبت تھی اور غالباً اسی وجہ سے دونوں بھائیوں میں لڑکپن سے ہی بنتی نہ تھی اور خاوند کی اسی طرف داری کی وجہ سے دونوں لڑکوں کی ماؤں میں بھی کبھی جوتی پیزار ہو جاتی۔

سائیں مہتاب شاہ علائق دنیا سے بے زاری کا اظہار کرتے ہوئے بھی پکا دنیا دار تھا۔ جوانی کا عالم تو خیر ہوتا ہی دیوانگی کا زمانہ ہے لیکن اس بڑھاپے میں بھی اس کے سب شوق جوانوں کے شوق تھے مہینے میں کئی ایک بار اس کے ہاں گانے بجانے کی محفل بھی جمتی۔ قوالی بھی ہوتی۔ اس نے مسافروں کے لئے ایک لنگر بھی جاری کر رکھا تھا۔ لیکن اگر کسی چیز سے بے تعلقی تھی تو وہ نماز روزہ تھا اور اپنے عقیدت مندوں کے نقطۂ خیال سے

وہ روحانیت کے اب اس مرتبہ پر پہنچ چکا تھا جہاں نعوذ باللہ نماز اور روزہ بھی انسان کو معاف ہو جاتا ہے۔

پیر مہتاب شاہ کو اپنے دونوں لڑکوں کی تعلیم کا خیال اس وقت آیا جب بڑا بارہ سال کا اور چھوٹا گیارہ برس کا ہو چکا تھا۔ دونوں لڑکے کچھ عرصہ تو گھر پر ہی تعلیم پاتے رہے پھر اس نے انہیں شہر میں بھیج دیا۔ دونوں بھائی ایک ہوسٹل میں رہتے تھے۔ دس بارہ سال تک دونوں لڑکے تعلیم کے لئے گھر سے باہر رہے۔ سال میں دو تین بار جب مدرسہ بند ہوتا تو وہ گاؤں چلے آتے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ان دس بارہ برس میں دونوں نے حاصل کیا کیا دلدار حسین نے تو واقعی تحصیل علم کے لئے بہت کوشش کی اور کچھ نام بھی پیدا کیا۔ لیکن چھوٹے یعنی دلاور حسین نے کوئی تعلیمی اعزاز حاصل کرنے کے بجائے شہر اور مہذب قوموں کے نئے تمدن اور نئی تہذیب کی طرف زیادہ توجہ کی اور ہر نقطۂ نظر سے ماہر عیار آدمی بن گیا۔ دلدار حسین کی شادی بھی شہر ہی میں کہیں ہو گئی اور خوش قسمتی سے اسے ایک تعلیم یافتہ بیوی مل گئی۔ دلاور حسین کا بیاہ گاؤں کی ہی ایک لڑکی سے ہوا لیکن یہ لڑکی شادی کے دو چار سال بعد فوت ہو گئی۔

دونوں بھائیوں میں لڑکپن سے جو مخالفت اور عناد چلا آتا تھا۔ عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا۔ دلدار حسین نیک خصلت بھی تھا اور خوش خلق اور ملنسار بھی۔ اس لئے وہ جہاں جاتا عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا۔ لیکن دلاور حسین چونکہ بدکردار اور تنگ مزاج تھا اس لئے سب اس سے بیزار رہتے لیکن اسے لوگوں کی بے زاری کی کچھ پروا نہ تھی۔ اس نے گاؤں میں بھی اپنے ڈھب کا ایک جتھا بنا لیا تھا اور اپنے یاران سرپل کے ساتھ باپ دادا کی کمائی عیش و عشرت میں برباد کرتا۔

سائیں مہتاب شاہ کے مرنے کے بعد دونوں بھائیوں میں کھلم کھلا جھگڑا شروع ہو گیا اور نوبت مقدمہ بازی تک جا پہنچی۔ آخر جائیداد دونوں میں تقسیم ہو گئی۔ لیکن یہ جائیداد کیا تھی۔ ایک تو وہی پکا مکان اور اس کے علاوہ کچھ تھوڑی سی اراضی۔ اصلی جائیداد تو وہ نذر نیاز کا روپیہ تھا جو پیر مہتاب شاہ کی زندگی میں آتا تھا۔ جب پیر ہی نہ رہا تو روپیہ کہاں سے آتا۔ جب مقدمات ختم ہوئے تو دلدار حسین گاؤں کی رہائش چھوڑ کر شہر میں آ گیا اور دلاور حسین بھی اپنا حصہ فروخت کر کے گاؤں سے چلا گیا۔ اس کے بعد دونوں بھائی پھر کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملے۔

دلدار حسین اب مولوی دلدار حسین کہلاتا۔ اس نے شہر میں سکونت اختیار کر رکھی تھی اس وقت ملک ایک نئی کروٹ لے رہا تھا۔ لوگوں میں ایک سیاسی بیداری پیدا ہو رہی تھی۔ کانگرس ہر قدم پر آگے بڑھ رہی تھی ادھر مسلم لیگ نے ابھی صرف آنکھ ہی کھولی تھی۔ دلدار حسین زمانہ کی نبض خوب پہچانتا تھا۔ اس میں کوئی اور خوبی ہو یا نہ ہو لیکن وہ لسانی اور چرب زبانی میں بہت کمال رکھتا تھا۔ کانگرس چونکہ ملک کی واحد نمائندہ ہونے کی دعویدار تھی اس لئے وہ اپنے ڈھب کے مسلمانوں کی ہمیشہ تلاش میں رہتی اور بہت سے مسلمان اس کے جال میں پھنس بھی چکے تھے۔ دلدار حسین کو سرکاری ملازمت سے شروع سے ہی نفرت تھی۔ وہ قومی کاموں میں بہت دلچسپی لیا کرتا۔ اس وقت وہ مسلم لیگ کے دامن سے وابستہ تھا اور اپنی اسی لسانی یا تقریر کی خوبی کی وجہ سے اس نے عوام الناس میں اپنے لئے ایک خاص جگہ بنا لی تھی۔

دلدار حسین گو عسرت سے ایام زندگی بسر کرتا لیکن اس کے ارادے اور عزائم بہت بلند تھے۔ دنیا میں عزت اور وقار سے رہنے کا ایک ہی گر تھا اور وہ گر کیا تھا "روپیہ پیدا کرو"۔ دلدار حسین بھی اسی فکر میں ہر وقت لگا رہتا لیکن مسلم لیگ کے ساتھ رہ کر اس کی یہ تمنا پوری نہیں ہو سکتی تھی اس لئے اُس نے چپکے چپکے کانگرسی رہنماؤں سے میل ملاقات پیدا کرنے کی کوشش کی اور جیسے کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کانگرس ایسے لوگوں کی ہمیشہ تاک میں

رہتی تھی۔مولوی دلدار حسین بھی چونکہ میدان سیاست میں کچھ نام پیدا کر چکا تھا اس لئے کانگرسیوں نے بھی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور وہ مسلم لیگ سے کٹ کر کانگرس سے جاملا۔اور بڑی شدومد سے کانگرس کا پراپیگنڈا کرنے لگا۔کانگرس میں شامل ہونے سے پیشتر اس کے اہل وعیال گاؤں ہی میں رہتے تھے لیکن اب اس نے بیوی بچوں کو بھی شہر میں اپنے پاس بلوالیا۔ایک قلیل عرصے میں مولوی دلدار حسین کا نام بھی کانگریس کے سرگرم کارکنوں میں نظر آنے لگا۔اس کی مالی حیثیت بھی پہلے سے کچھ بہتر معلوم ہونے لگی اس کی لڑکی اور لڑکے کی تعلیم کا بھی مناسب انتظام ہوگیا۔جیسے جیسے دلدار حسین کی سرگرمیاں یا قوم فروشیاں بڑھتی گئیں کانگرس کا دست کرم بھی دراز ہوتا گیا اور آخر ایک دن وہ بھی آیا جب صوبہ کی کانگرس کمیٹی نے اسے اپنا صدر منتخب کرلیا اور وہی مولوی دلدار حسین جو کبھی جوتے چٹخاتا نظر آیا کرتا تھا اب عزت اور وقار سے رہنے لگا اور اپنی تمام طاقتیں اپنی ہی قوم کی تخریب کیلئے خرچ کرنے لگا آفریں ہے اس کے کانگرسی آقاؤں پر بھی کہ وہ بھی ہر گام پر اس کی اسلام اور قوم فروشی کا کھلے ہاتھ سے اسے معاوضہ دیتے۔اس تمام عرصے میں اس کے سوتیلے بھائی دلاور حسین نے نہ تو اسے کبھی کوئی خط ہی لکھا اور نہ ملنے ہی آیا لیکن مولوی دلدار حسین کو چونکہ صوبے میں کبھی دور بھی کرنا ہوتا تھا۔اس لئے اُسے معلوم تھا کہ اس کا بھائی کہاں ہے اور کیا کرتا ہے لیکن جو کام اس کا بھائی کرتا تھا یا جو پیشہ اس نے اختیار کر رکھا تھا اس کا ذکر چونکہ ابھی قبل از وقت ہوگا اس لئے ہم اسے فی الحال نظر انداز کرتے ہیں۔

پھر وہ زمانہ بھی آیا جب میدان سیاست میں مسلم لیگ کانگرس کی ایک زبردست حریف بن چکی تھی اور سیاسی چالوں میں اپنا لوہا منوا چکی تھی۔لیکن مسلمانوں میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو مسلم لیگ کے ہوتے ہوئے بھی اپنی جدا جدا سیاسی جماعتیں بنائے بیٹھے تھے۔ہر شخص جسے ذرا سی بھی سیاسی اہمیت حاصل تھی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بنانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔مسلمانوں کا سیاسی شعور تو بیشک بیدار ہو چکا تھا لیکن کانگرس کے سرمایہ دار اس سیاسی شعور کو میٹھی میٹھی خواب آور ادویات پلا پلا کر سلانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو دنیا کی خاطر دین بیچنے میں کوئی قباحت محسوس نہ کرتے۔کانگرس ان کا ضمیر ہر قیمت پر خرید رہی تھی بالکل اسی طرح جیسے اُس نے مولوی دلدار حسین کا ایمان اور ضمیر خریدا تھا۔ملک کی فرقہ وار فضا روز بروز خراب ہو رہی تھی اور انگریز کے اس اعلان سے کہ وہ ایک معین وقت پر ہندوستان چھوڑ کر چلے جائیں گے کانگرس مدتوں کی غلامی کے بعد پھر ایک بار حکومت کے خواب دیکھ رہی تھی۔کانگرس کے پاس روپیہ تھا۔کانگرس کی ملک میں خوفناک اکثریت تھی کانگرس کے پاس حصول مطلب کے لئے بے پناہ وسائل تھے ہاں اگر کسی چیز کی کمی تھی تو وہ سیاست تھی۔کانگرس کے سیاستدانوں کی سیاست صرف اتنی ہی تھی کہ جیسے بھی ہو مسلمانوں پر مسلط ہو کر ملک پر حکومت کرے اور مولوی دلدار حسین بھی اس کا ایک سرگرم معاون تھا۔

آقا اور غلام

آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی
جب یہ جمعیت گئی دنیا میں رُسوا تو ہوا

شہر میں اچانک فرقہ وارانہ فساد ہو گیا۔

آج مولوی دلدار حسین کے مکان پر لوگوں کا تانتا سا بندھا ہوا تھا۔ گزشتہ رات کے ہولناک واقعات کی رپورٹیں چاروں طرف سے آ رہی تھیں۔ سب حیران تھے کہ فساد ہو کیسے گیا۔ یہ تو درست تھا کہ شہر کی سیاسی فضا بہت دنوں سے مکدر ہو رہی تھی اور سب جانتے تھے کہ وہ ایک آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ تو کسی کے وہم و گمان بھی نہ تھا کہ یہ آتش فشاں اتنی جلدی پھٹ جائے گا اور فرقہ وارانہ بغض و عداوت کا لاوا بربادی اور تباہی کا ایک ہولناک منظر آنکھوں کے سامنے لا کھڑا کرے گا۔ کچھ خوش بھی تھے کہ چلو کچھ اور نہ سہی اتنا تو معلوم ہو جائے گا کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ لیکن ایک بات کا مولوی دلدار حسین اور ان کی جماعت کے زعما کو بھی اقرار تھا کہ پہل کانگرس ہی کی طرف سے ہوئی تھی اور مسلم لیگ اپنی قوت کے ساتھ ہنگامے کو دبانے اور پھیلنے سے روکنے کی کوشش میں لگی رہی ورنہ جانی نقصان جان اندازہ سے زیادہ ہوتا۔

دن کے بارہ بجے کے قریب مولوی صاحب کے مکان پر جو لوگ بیٹھے صلاح مشورہ کر رہے تھے ان میں ایک بڑی توند والا کہہ رہا تھا۔

"بھگوان جانے! رات کے نعروں نے تو بڑے بڑے جی داروں کے چھکے چھڑا دیئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مُسلے اب آئے کہ آئے"۔

''لیکن نعرے تو کوٹھوں پر لگ رہے تھے''۔ مولوی دلدار حسین نے کہا۔''بازاروں میں تو پولیس کے سپاہی بھاگے بھاگے پھرتے تھے کوئی حملہ کیسے کرسکتا تھا''۔

ایک دبلا پتلا کھدر پوش بولا۔''یہ آگ لگانے کی رسم تو بہت بری نکلی۔ یہ تو قتل وخون سے بھی زیادہ خوفناک ہے۔رات کم ازکم پندرہ بیس مقامات پر شعلے نکل رہے تھے۔اس کا انتظام تو کچھ نہ کچھ ہونا چاہئے''۔

''حکومت ہی کچھ انتظام کرے تو کرے''۔ایک نیلی عینک والے نے کہا۔

''مولوی جی!'' بڑی توند والا بولا۔''آپ آج ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر سے تو ملیں اور ان پر زور ڈالیں کہ سب مسلمان غنڈوں کو فوراً گرفتار کرلیا جائے''۔

''تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی''۔مولوی دلدار نے داڑھی کے بال کھجاتے ہوئے کہا۔''دونوں طرف کے آدمی پکڑے جائیں گے''۔

''لیکن کوشش تو یہی کرنی چاہئے کہ اپنے آدمیوں پر آنچ نہ آنے پائے''۔نیلی عینک والا بولا۔''آپ ہمارے صدر ہیں۔آپ کو تو صبح ہی حکومت کے افسروں سے ملنا چاہئے تھا''۔

مولوی دلدار حسین نے کچھ جواب نہ دیا۔دبلا پتلا کھدر پوش بولا۔''مولوی صاحب اخبارات کے لئے آپ نے کوئی بیان بھی تیار کیا یا نہیں؟''

''اخبار کا نمائندہ تو ابھی تک میرے پاس کوئی آیا نہیں''۔مولوی نے جواب دیا

اور اسی دُبلے پتلے آدمی نے ذرا تلخ لہجے میں کہا۔

''یہ اخبار والوں کا فرض نہیں کہ وہ آپ کے پاس بھاگے آئیں''۔

''تو کیا میں ان کے پاس چل کر جاؤں؟''مولوی نے ذرا وقار کے ساتھ مسکرا کر پوچھا۔

''تو کیا ہم جائیں؟'' دونوں نے کہا۔''جاتی کی حفاظت کے آپ ذمہ دار ہیں ہم نہیں''

''میں کیسے؟''مولوی نے پوچھا۔

''آپ صدر جو ہیں''۔نیلی عینک والا بولا۔اور موٹی توند والے نے کہا۔

''ابھی بہت وقت پڑا ہے۔ایک بیان آپ کی طرف سے آج ہی جاری ہو جانا چاہئے''۔

''اب شہر کی حالت کیا ہے؟''مولوی نے پوچھا۔

''اکے دکے حملے برابر ہو رہے ہیں''۔ایک نے جواب دیا۔

''اور آگ لگنے کے بھی دو تین تازہ واقعات ہو چکے ہیں''۔ایک اور نے کہا۔

مولوی دلدار حسین نے بیٹھے بیٹھے سر ہلا دیا۔ایک نوجوان جو ابھی تک خاموش تھا بولا ''مولوی صاحب! آپ کی یہ خاموشی میری سمجھ میں تو کچھ آتی نہیں۔آخر آپ سوچ کیا رہے ہیں''۔

''میں ہائی کمان سے صلاح مشورہ کئے بغیر کچھ کرنا نہیں چاہتا''۔ مولوی دلدار حسین نے جواب دیا''۔ پہلے ہائی کمان کی پالیسی معلوم ہونی چاہئے شاید وہ اس دنگا فساد کے حق میں نہ ہو''۔

اور ایک منہ پھٹ نے کہا۔'' جناب دو بیڑیوں میں قدم رکھنے کا نتیجہ اچھا نہیں ہوا کرتا''۔

''دو بیڑیوں میں کون قدم رکھتا ہے''۔ مولوی صاحب نے ذرا مسکرا کر پوچھا۔

''آپ اور کون؟'' اسی نے جواب دیا۔

مولوی صاحب پھر ذرا مسکرا دیئے۔ نیلی عینک والا بولا۔

''مولوی جی! ابھی تو امتحان کا وقت ہے۔ رات سے شہر میں خون خرابہ ہو رہا ہے اور آپ ابھی بیٹھے سوچ ہی رہے ہیں۔ اگر آپ سے کام نہیں ہو سکتا تو صاف کہہ دیجئے''۔

''آپ یہ کیوں صاف نہیں کہہ دیتے کہ آپ کی جماعت کو اب مجھ پر اعتماد نہیں''۔ مولوی صاحب نے بھی ذرا غصے سے کہا۔''میں آپ سے ابھی ابھی کہہ چکا ہوں کہ یہ معاملہ بہت نازک ہے اور میں ہائی کمان سے مشورہ کئے بغیر کوئی قدم اٹھانا پسند نہیں کرتا۔ آپ کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ میں ذمہ دار ہوں آپ ذمہ دار نہیں''۔

''اچھی ذمہ داری ہے کہ اس وقت تک ہمارے درجنوں بھائی مارے جا چکے ہیں اور آپ ابھی ہائی کمان سے مشورہ کرنے کو ہی سوچ رہے ہیں''۔ نوجوان آدمی نے جواب دیا۔

''آخر آپ نے صبح سے کسی سے مشورہ کیا بھی؟'' نیلی عینک والے نے پوچھا۔'' ہائی کمان سے پوچھنے کا آپ کو کس نے مشورہ دیا''۔

''دوستوں نے اور کس نے''۔ مولوی نے جواب دیا۔

''تو آپ کب تک ہائی کمان سے مشورہ کریں گے؟'' نیلی عینک والے نے پوچھا۔

''آج کے واقعات دیکھ کر''۔ مولوی نے جواب دیا۔

''اور آپ کسی افسر سے بھی آج نہیں ملیں گے''۔ اسی نے پوچھا۔

''جن لوگوں کا افسروں سے کہنا کچھ مفید ہو سکتا ہے میں نے ان سے ملنے کو کہہ دیا ہے''۔ مولوی نے جواب دیا۔

''کون ہیں وہ لوگ؟'' نوجوان نے پوچھا۔

''اپنی ہی جماعت کے آدمی ہیں''۔ مولوی نے جواب دیا۔

''اپنے گروپ کے یا دوسرے گروپ کے؟'' نوجوان نے پوچھا۔

''تفصیل بتانے کی کیا ضرورت ہے''۔ مولوی نے کہا۔

''اپنی جماعت کے آدمیوں سے آپ کیوں چھپاتے ہیں؟'' نیلی عینک والے نے پوچھا۔

''آپ کیوں پوچھتے ہیں؟'' مولوی نے پوچھا۔

''یہ تو کچھ ٹھیک نہیں''۔ نیلی عینک والا بولا۔''آپ کا فرض ہے کہ آپ جو کچھ کریں ہمارے مشورہ سے کریں''۔

''میں وہی کرتا ہوں جو میں کانگرس کے لئے مفید سمجھتا ہوں''۔ مولوی نے جواب دیا۔

''اگر آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں تو میں ابھی استعفادینے کو تیار ہوں''۔

موٹی توند والا ایک دو بار کھانس کر بولا۔

''مولوی جی! اس میں ناراض ہونے کی کوئی بات نہیں۔ لیکن آپ کو اپنی جماعت کے آدمیوں سے کوئی کام کرنے سے پیشتر مشورہ تو ضرور کرنا چاہئے''۔

''جب ضرورت ہوگی کرلوں گا''۔ مولوی نے جواب دیا۔

''لیکن ہم چاہتے ہیں کہ کوئی کام ہمارے مشورے کے بغیر نہ ہو''۔ نوجوان نے کہا۔''کیونکہ اس وقت قوم کا سوال ہے''۔

''میرا خیال ہے کہ میں نے آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا''۔ مولوی دلدار حسین نے جواب دیا۔''یہ دوسری بات ہے کہ آپ کی قوم کو مجھ پر اعتماد نہ رہا ہو''۔

''نہیں نہیں!'' موٹی توند والا بولا۔''یہ مت فرمایئے آپ! آپ کی خدمات کو ہم میں سے کوئی بھی فراموش نہیں کرسکتا۔ بات صرف اتنی ہے کہ آپ دوسری پارٹی کی باتیں سن کر ذرا جلدی متاثر ہوجاتے ہیں۔ ہیں تو وہ بھی کانگری لیکن آپ کو معلوم ہے کہ وہ ہمارے مخالف ہیں''۔

''میں کسی کی باتیں سن کر متاثر نہیں ہوتا''۔ مولوی دلدار حسین نے جواب دیا۔''صبح دوسری پارٹی کے بھی چند آدمی میرے پاس صلاح مشورہ کے لئے آئے تھے۔ میں نے ان سے بھی یہی کہا تھا کہ میں جب تک ہائی کمان سے مشورہ نہ کرلوں کچھ نہیں کرسکتا''۔

''یہ تو ٹھیک ہے''۔ نوجوان بولا۔''لیکن آپ کم از کم مسلم لیگ والوں کے خلاف ایک بیان تو آج ہی اخبارات میں شائع کروادیں تاکہ بیرونی لوگوں کو یہ معلوم ہوجائے کہ ابتدا مسلم لیگ والوں کی طرف سے ہوئی ہے''۔

''لیکن اگر میں ایک آدھ دن کے بعد کوئی بیان دوں تو اس میں کیا ہرج ہے''۔ مولوی دلدار حسین نے پوچھا۔

''ہرج ہو یا نہ ہو''۔ اسی نے جواب دیا۔''لیکن آپ کو جماعت کا حکم ماننے سے انکار نہیں کرنا چاہئے''۔

''حکم!'' مولوی نے ذرا مسکرا کر کہا۔

اور وہی نوجوان ذرا تیز لہجہ میں بولا۔

''ہاں حکم!'' آپ کانگرس کے ملازم ہیں۔ کانگرس آپ کے تمام اخراجات برداشت کررہی ہے۔ کانگرس کی طفیل آپ کو اقتدار حاصل ہوا ہے۔ عزت ملی ہے۔ آپ کانگرس کے حکم سے کیسے انحراف کرسکتے ہیں''۔

''آپ ذرا تہذیب سے بات کریں''۔ مولوی دلدار حسین نے بھی ذرا غصے سے کہا۔''میں جب تک صدر ہوں آپ مجھے کسی بات پر مجبور نہیں کرسکتے''۔

''لیکن آپ کو صدر بنایا کس نے؟'' نیلی عینک والا بولا۔''ہم نے یا کسی اور نے؟''

''مجھے ہائی کمان کے حکم سے صدر بنایا گیا ہے''۔مولوی نے جواب دیا۔

''اور ہائی کمان کو مشورہ دیا کس نے؟'' اسی نیلی عینک والے نے پوچھا۔''ہم نے یا کسی اور نے؟ ہم جس وقت چاہیں اپنا فیصلہ بدل بھی سکتے ہیں''۔

''گویا آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں''۔مولوی نے غصے سے کہا۔

''جو کچھ بھی آپ سمجھیں''۔دبلا پتلا کانگرسی بولا۔''لیکن اس نازک وقت میں ہم اپنے قومی مفاد کو کسی طرح نظرانداز نہیں کر سکتے''۔

''بہت اچھا میں اس پر غور کروں گا''۔مولوی نے جواب دیا۔

کچھ دیر بعد یہ لوگ اٹھ کر چلے گئے۔آج مولوی دلدار حسین کو پہلی بار اپنی ذلت کا احساس ہوا۔لیکن اسے امید تھی کہ اگر یہ معاملہ کانگرس ہائی کمان تک پہنچا تو جیت اسی کی رہے گی۔

صوبہ کی کانگرس کمیٹی میں بہت دنوں سے اختلاف تھا اور جماعت دو گروہوں میں تقسیم ہو چکی تھی اور بدقسمتی سے مولوی صاحب کا میلان طبع اس گروپ کی طرف تھا جسے مجلس منتظمہ میں اکثریت حاصل نہ تھی اور اکثریت بہت دنوں سے صدر کی طرف سے بدظن ہو چکی تھی اور اس کوشش میں تھی کہ کوئی ایسی صورت پیدا کر دی جائے جو مولوی دلدار حسین خود ہی صدارت سے مستعفی ہو جائے۔

مولوی صاحب جب سے مسلم لیگ سے علیحدہ ہوئے تھے اپنے مسلم لیگی دوستوں سے ان کے تعلقات بھی کچھ برائے نام ہی رہ گئے تھے۔مصیبت یہ آ پڑی کہ اُس زمانے میں مسلم لیگ اور کانگرس میں سمجھوتہ کرانے کی کئی بار کوشش کی گئی' اور ان مواقع پر مولوی دلدار حسین نے بڑی کاوش کے ساتھ مسلم لیگی نقطۂ نظر کی مخالفت کی اور اس مخالفت کا انعام انہیں یہ ملا کہ وہ صدر بنا دیئے گئے۔اور انہوں نے اپنے قول اور عمل سے ثابت کر دیا کہ مسلمانوں کو ملا قسم کے لوگوں سے کبھی کوئی اُمید نہیں رکھنی چاہئے۔

مولوی دلدار حسین جاہ طلب تھا اور دنیا میں عزت سے رہنا چاہتا تھا۔اور عزت سے رہنے کے لئے انسان کو روپے کی ضرورت ہوتی ہے اور روپے ہی کی خاطر مولوی نے اپنا ایمان بھی اور ضمیر بھی ہندوؤں کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔اُنہوں نے تو مسلمان ہوتے ہوئے بھی اپنی ذہنیت بدل ڈالی۔لیکن قوم پرست کانگرس کی ذہنیت وہ کسی ایثار اور قربانی پر بھی بدل نہ سکے۔اور ان کے آقا انہیں ہمیشہ اپنا نوکر ہی سمجھتے رہے اور آج جس شدت کے ساتھ یہ حقیقت اُن پر ظاہر ہوئی شاید اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔

مولوی صاحب کے دل میں اگر سدرمق بھی نورِ ایمان ہوتا یا غیرت ہوتی تو وہ آج ہی اپنے اس عہدے سے مستعفی ہو جاتے لیکن انہوں نے یہ موقع ہاتھ سے کھو دیا۔کیونکہ انہیں امید تھی کہ کانگرس کا وہ گروپ جس کی وہ ہر معاملہ میں جانبداری کیا کرتے تھے ان کا ساتھ دے گا۔لیکن اس کے بعد جو واقعات پیش آئے انہوں نے ثابت کر دیا کہ مولوی دلدار حسین کانگرس ہائی کمان سے جو اُمیدیں لگائے بیٹھا تھا غلط تھیں' سراب تھیں اور اس کے لئے اُسے کچھ زیادہ وقت انتظار بھی نہ کرنا پڑا۔

دوسری رات

گہوارۂ آلام خلش ریز ہے یہ رات
اندوہ فراواں سے جنوں خیز ہے یہ رات
نالوں کے تسلسل سے ہیں معمور فضائیں میں
سرد آہوں سے گرم اشکوں سے لبریز ہے یہ رات
رونے سے مگر آج تن آساں نہیں ہوتی
تسکینِ دل و دیدۂ گریاں نہیں ہوتی

(ن۔م۔راشد)

مولوی دلدار حسین کا مکان جس پر کانگرسی جھنڈا لہراتا تھا ایک ایسے محلے میں تھا جس کے آس پاس غریب مسلمانوں کی ایک مختصر سی آبادی تھی۔ان غریبوں پر مولوی دلدار حسین عموماً دھونس جماتے رہتے کیونکہ یہ سب غریب مسلم لیگ سے وابستہ تھے۔لیکن مولوی صاحب کی بیوی زینب بی بی جو ایک نیک خصلت اور شریف مزاج عورت تھی اپنی غریب پروسنوں کی ہر طرح سے تالیف قلوب کی کوشش کیا کرتی۔زینب بی بی میں جہاں بہت سی خوبیاں تھیں وہاں ایک کمزوری بھی تھی اور اس کی اس کمزوری سے سب نالاں تھے۔وہ ضرورت سے زیادہ باتیں کرتی یعنی ہر بات پر ایک تقریر تیار

رہتی۔ مولوی دلدار حسین کو خدا نے دو بچے بھی عطا کئے تھے ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ لڑکے کا نام شریف حسین تھا اور لڑکی کا نام شریفہ۔ شریف حسین اپنی بہن شریفہ سے عمر میں چار پانچ سال بڑا تھا اور لطف یہ تھا کہ شریف حسین کو اپنے باپ کے سیاسی نظریات سے سخت اختلاف تھا۔ شریف حسین ایک خوبصورت جوان لڑکا تھا اور شریفہ ایک نازک اندام حسین دوشیزہ۔ بچے گاہے بگاہے اپنی والدہ کے ساتھ تھوڑے دنوں کے لئے اپنے وطن یعنی گاؤں بھی چلے جاتے اور گاؤں والے انہیں سائیں مہتاب شاہ کی اولاد سمجھ کر احترام سے پیش آتے۔ ورنہ یوں تو گاؤں میں مولوی دلدار حسین کی ایک معمولی زمیندار سے زیادہ حیثیت نہ تھی۔

چونکہ سارے صوبے کی سیاسی فضا مکدر ہو رہی تھی اس لئے مولوی صاحب نے اپنے اہل وعیال کو بھی اپنے ہی پاس بلا رکھا تھا۔ آج کے دن مولوی دلدار حسین کو بہت مصروفیت رہی۔ انہیں اپنی جماعت کے لوگوں سے معلوم ہو گیا تھا کہ کانگرس کی منتظمہ کمیٹی انہیں صدارت سے استعفیٰ دینے پر مجبور کرے گی۔ شہر سے مخدوش خبریں برابر آ رہی تھیں۔ لوگ مارے بھی جاتے تھے مجروح بھی ہوتے تھے اور مکانات جلائے بھی جا رہے تھے لیکن دونوں طرف کے لیڈر خاموش تھے۔ کسی ملک کی اس سے زیادہ بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ لوگوں کے راہنما ایسے موقعوں پر گھروں میں بیٹھے تماشہ دیکھیں۔

تو خیر! جب شام کے قریب مولوی دلدار حسین زنانے میں آیا تو وہ کچھ متفکر اور پریشان معلوم ہوتا تھا۔ بیوی نے پوچھا

''آج کیا تھا جو آپ نے صبح کا کھانا بھی باہر ہی منگوا لیا؟''

''بس فرصت ہی نہ ملی''۔ مولوی نے جواب دیا۔ ''دن بھر لوگ آتے جاتے رہے''۔

''لیکن میں پوچھتی ہوں لوگوں کے یوں آنے جانے کا مطلب کیا تھا''۔ بیوی بولی۔

''شہر میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ آپ کے پاس آنے جانے والوں کے صلاح مشورہ ہی سے تو ہوا ہو گا۔ جب صلاح ومشورہ سے ایک کام طے پا جائے تو پھر اس پر مزید صلاح ومشورہ کیسا۔ آپ کا وقت بھی ضائع ہوا اور ان کا بھی۔ آخر وقت ضائع کرنے سے کیا حاصل؟''

''یہی تو تمہاری سمجھ کی غلطی ہے''۔ مولوی دلدار حسین نے ذرا مسکرا کر کہا۔

''میری سمجھ کی غلطی کیسے؟'' بیوی نے پوچھا۔

''یہ سمجھ کی غلطی نہیں تو اور کیا ہے''۔ مولوی صاحب بولے۔ ''کہ جس بات کا تمہیں علم نہیں تم اس پر بھی رائے زنی کر رہی ہو''۔

''میرے خیال میں میاں اور بیوی میں کوئی راز نہیں ہوتا''۔ بیوی نے جواب دیا۔ ''جو بات آپ کو معلوم ہے مجھے بھی معلوم ہونا چاہئے۔ یہ اور بات ہے کہ آپ مجھ سے کہیں یا نہ کہیں لیکن میں آپ سے کہے دیتی ہوں کہ آپ کی کوئی بات مجھ سے چھپی نہیں رہ سکتی''۔

''الہام ہوتا ہے گویا تمہیں''۔ مولوی صاحب نے ذرا مسکرا کر کہا۔ ''کب سے وحی اُترنے لگی تم پر؟''

''جب سے یہ شریف حسین جوان ہوا''۔ بیوی نے جواب دیا۔ ''آپ اسے ابھی تک بچہ ہی سمجھتے ہیں۔ گو وہ اس وقت اٹھارہ سال کا ہو گیا ہے لیکن بات بڑی سوچ سمجھ کر کرتا ہے خدا کی قسم میرے شریف میں اس کے نانا کی تمام خوبیاں موجود ہیں''۔

''گویا!'' مولوی صاحب نے ذرا طنزاً کہا۔ ''تمہارے باپ کو بھی الہام ہوا کرتا تھا''۔

''میرے باپ غریب کو تو مرے ایک زمانہ ہوگیا۔ گڑے مردے اکھیڑنے سے کیا حاصل''۔ بیوی نے جواب دیا۔''ایک دنیا مرحوم سے صلاح ومشورہ کرنے آیا کرتی تھی۔ میرا شریف بھی تو اسی کی اولاد ہے۔ اگر وہ دنیا کو نہیں سمجھ سکتا تو پھر اور کون سمجھ سکتا ہے''۔

''لیکن!'' مولوی صاحب نے اچانک ہنس کر پوچھا۔''نانا کی خوبیاں نواسے میں تو آ گئیں لیکن تم ان سے آج تک کیوں محروم رہیں۔ سب سے زیادہ حق تو تمہارا تھا''۔

''جب ایک شوہر اپنی بیوی کو بیوقوف سمجھنے لگے تو اس غریب کے ایسے تمام جوہر لُٹ جاتے ہیں''۔ بیوی نے جواب دیا۔''اگر آپ نے میرا مشورہ مانا ہوتا تو آج آپ اس طرح پریشان بھی نظر نہ آتے''۔

مولوی دلدار حسین نے سر اٹھا کر بیوی کی طرف دیکھا اور کہا۔

''شہر میں جو ہڑبونگ مچ رہی ہے اس سے زیادہ فکر کی اور کیا بات ہوسکتی ہے''۔

''لیکن آپ کو کیا؟'' بیوی نے پوچھا۔''ان کی فکر تو ان لوگوں کو ہونی چاہئے جو اس کے ذمہ دار ہیں''۔

''تمہارے خیال میں اس کی ذمہ دار کانگرس ہے کیا؟'' مولوی نے پوچھا۔

''ایک میرا ہی یہ خیال نہیں!'' بیوی نے جواب دیا۔''ساری دنیا کا یہی خیال ہے۔ خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ابا جان مرحوم کو وہ ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے کہ انسان کو ہر کام سوچ سمجھ کر کرنا چاہئے''۔

''اور باتیں؟'' مولوی نے مسکرا کر پوچھا۔

''میں نے جب ہر کام کہا تو میرے خیال میں بات چیت بھی اس سے باہر نہیں ہوسکتی''۔ بیوی نے جواب دیا۔

''تم نے بھی کبھی سوچ سمجھ کر بات کی''۔ دلدار حسین نے پوچھا۔

''دو بچوں کی ماں ہونے پر بھی اگر کوئی عورت سوچ سمجھ کر بات نہیں کرتی تو پھر دنیا میں نہ سوچ ہے نہ بچار''۔ بیوی نے جواب دیا۔''ابا جان مرحوم کے پاس جب کوئی صلاح ومشورہ کرنے کو آتا تو آپ عموماً مجھ سے بھی پوچھ لیا کرتے۔ کیونکہ میری تعلیم وتربیت اُنہی کے زیرِ سایہ ہوئی تھی۔ لیکن ایک آپ ہیں جنہوں نے میری بات نہ سننے یا سمجھنے کی قسم کھا رکھی ہے میرا شریف گو بچہ ہی تو ہے لیکن آپ اسے بچہ نہ سمجھیں وہ بہت سوچ سمجھ کر بات کرتا ہے اور سوچ سمجھ کر کیسے بات نہ کرے۔ آخر اس کا نانا کون تھا اور آپ کو یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ کس ماں کی آغوش میں اُس کی پرورش اور تربیت ہوئی ہے۔ لیکن خیر! آج تو آپ کو یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ میں جو کچھ کہا کرتی تھی غلط نہیں کہتی تھی۔

''کیا کہا تھا تم نے مجھ سے''۔ مولوی صاحب نے پوچھا۔''تم تو جب کچھ کہنے پر آتی ہو تو اتنی باتیں کہہ دیتی ہو کہ کوئی بات بھی دھیان میں نہیں رہتی۔ کیا کہا تھا تم نے مجھ سے؟''

''کیا ملا آپ کو مسلم لیگ سے کٹ کر؟'' بیوی نے شوہر کی طرف دیکھ کر پوچھا۔''اگر آپ نے میرا مشورہ قبول کیا ہوتا تو آج یہ لوگ اس طرح دیدہ دلیری سے آپ سے گفتگو بھی نہ کرتے۔ میرا شریف حسین ہمیشہ کہا کرتا ہے کہ کانگرس آپ کو اپنا ملازم سمجھتی ہے اور ابا جان مرحوم بھی خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ دنیا میں اگر کوئی کام ذلیل سمجھے جانے کے قابل ہے تو وہ چاکری ہے اور آج آپ نے

خود بھی دیکھ لیا کہ آپ کے ساتھ کام کرنے والے آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔اگر آپ آج مسلم لیگ کے ساتھ ہوتے تو ایک دنیا آپ کا احترام کرتی"۔

"اور ہم کرایہ کے مکان میں اس وقت بیٹھے ہوتے اور تم نے دال چولہے پر چڑھائی ہوتی"۔مولوی نے جواب دیا۔"دس برس مسلم لیگ کا کام کیا لیکن ملا کیا؟ رہنے کو مکان بھی نہ بن سکا۔دنیا میں عزت دولت سے ہوتی ہے۔تم یہاں جب آئی تھیں کوئی تمہیں جانتا بھی نہ تھا کبھی کسی نے تمہیں کسی تقریب پر بھی بلوایا۔کبھی کچھ اچھا کھانے اور اچھا پہننے کو بھی ملا۔وہ وقت بھی یاد ہے جب تمہارے بچے ہر چیز کو ترسا کرتے تھے اور آج تم دیکھ رہی ہو۔رہنے کو اپنا مکان ہے' کیسا عالیشان مکان۔اپنے اور اپنے بچوں کے لباس کی طرف بھی دیکھو ایک دنیا رشک سے دیکھتی ہے۔سب لوگ عزت کرتے ہیں......"

"اور زر خرید سمجھتے ہیں"۔بیوی نے بات کاٹ کر کہا۔

"کسی کے سمجھنے یا کہنے سے کیا ہوتا ہے"۔مولوی نے جواب دیا۔"دنیا کے منہ میں تو گز بھر کی زبان ہے"۔

"مسلمانوں میں بھی کچھ عزت ہے آپ کی؟" بیوی نے پوچھا۔"میرا شریف اکثر مجھ سے کہا کرتا ہے کہ اس کے دوست اسے ہمیشہ یہ طعنہ دیتے ہیں کہ تمہارا باپ ضمیر فروش ہے"۔

"پگلی!" مولوی صاحب نے مسکرا کر کہا۔"دنیا میں صرف وہی لوگ عزت سے رہ سکتے ہیں جو دنیا کا ساتھ دیتے ہیں مفلس اور نادار کا ضمیر بھی کوئی ضمیر ہوتا ہے بھلا؟"

"اور اگر آج ان لوگوں سے آپ کی بگڑ گئی تو"۔بیوی نے پوچھا۔"میرا شریف آج مجھ سے کہتا تھا کہ چونکہ آپ کا اپنے ساتھیوں سے کچھ اختلاف ہے۔اس لئے وہ آپ کو استعفیٰ دینے پر مجبور کریں گے اور میں تو وہ دن اپنے اور اپنے بچوں کے لئے بہت مبارک سمجھوں گی جب آپ پھر ایک بار اپنی جماعت سے مل جائیں گے"۔

"اور ضروریات کے لئے یہ مکان بھی کسی روز رہن رکھ دینگے"۔مولوی نے جواب دیا"چھوڑو یہ قصہ۔دعا کرو آج کی رات خیر سے گزر جائے"۔

"کوئی خاص بات ہے کیا؟" بیوی نے پوچھا۔"ہاں ابا جان مرحوم خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔عموماً کہا کرتے تھے کہ دعا میں بڑی تاثیر ہوتی ہے۔انسان کو جب کوئی مشکل آپڑے تو اسے خدا کو کثرت سے یاد کرنا چاہئے۔مجھے خوب یاد ہے ایک سال قحط سالی کا خوف تھا اور بارش نہ ہونے کے باعث فصل پیدا ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔آخر لوگ جمع ہو کر ایک میدان میں گئے اور سب نے مل کر بڑی عاجزی سے گڑگڑا کر دعا مانگی تو اس روز ایسی بارش ہوئی کہ جل تھل ہو گیا۔تو کوئی خطرہ ہے آج کیا؟"

"تم نہیں سن رہیں کہ صبح سے بیسیوں جگہ آگ لگائی جا چکی ہے"۔مولوی نے ذرا جھلا کر کہا۔"آج نہ کسی کی جان محفوظ ہے نہ مال"۔

"تو پھر آپ نے کیا سوچا"۔بیوی نے پوچھا۔"ہم تو شہر کے ایک طرف پڑے ہیں۔حفاظت یا بچاؤ کا سامان بھی تو گھر میں نہیں۔تم نے تو بندوق تک نہیں خریدی"۔

"تم فکر مت کرو"۔مولوی نے جواب دیا۔"ذرا یہ پڑوس والوں سے کہہ دینا چاہئے کہ ہوشیار رہیں"۔

''اللہ مالک ہے غریبوں کا''۔ بیوی نے جواب دیا۔ ''گو آپ ان لوگوں کو ہمیشہ حقیر سمجھتے ہیں لیکن مصیبت میں یہی لوگ کام آنے والے ہیں۔ ابا جان مرحوم خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ہمیشہ غریبوں سے عزت سے پیش آیا کرتے تھے۔ اور یہ لوگ بھی ان پر جان چھڑکتے۔ میرا شریف بھی ہر وقت ان کی مدد کرتا رہتا ہے اور ان کی دعائیں لیتا ہے''۔

مولوی دلدار حسین نے کچھ جواب نہ دیا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد جب مولوی صاحب سونے کی تیاری کرنے لگے تو اس وقت کچھ جھکڑ سا چل رہا تھا اور گاہے گاہے آگ بجھانے والے انجن کی ٹن ٹن ادھر اُدھر سے سنائی دیتی تھی۔ دوسرے کمرے میں دونوں بھائی بہن بیٹھے ریڈیو سن رہے تھے۔ اچانک شریفہ بولی۔

''مجھے تو آج کچھ ڈر سا لگ رہا ہے۔ صبح سے جگہ جگہ آگ کے شعلے نکل رہے ہیں۔ جانے کتنے بے گناہوں کے گھر جل چکے ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ ابا جان کسی کی سنتے ہی نہیں''۔

''کیا بات ہے؟'' شریف نے پوچھا۔ ''کچھ کہا تھا تم نے ابا جان سے؟''

''میں تو کل سے کہہ رہی ہوں کہ ہمیں کسی اور جگہ چلے جانا چاہئے''۔ شریفہ نے جواب دیا۔

''کسی اور جگہ کہاں؟'' شریف نے پوچھا۔

''کسی محفوظ جگہ!'' شریفہ نے جواب دیا۔ ''کہیں مسلمانوں کے محلے میں''۔

''مسلمان کب ہمیں اپنے محلوں میں جگہ دینے لگے''۔ شریف نے مسکرا کر کہا۔ ''لوگ تو ہمیں اب مسلمان بھی نہیں سمجھتے''۔

''آج دن بھر جو یہ لوگ آتے رہے کیا کہتے تھے ابا جان سے؟'' شریفہ نے پوچھا۔ ''کچھ تم نے بھی سنا؟''

''ابا جان پر ان لوگوں کو اب اعتماد نہیں رہا''۔ شریف نے جواب دیا۔

''تو ابا جان ان لوگوں سے الگ کیوں نہیں ہو جاتے''۔ شریفہ نے پوچھا۔

''کون سمجھائے ابا جان کو''۔ شریف نے آہ بھر کر کہا۔

''گویا اب دونوں طرف سے گئے''۔ شریفہ نے پوچھا۔ ''نہ اِدھر کے نہ اُدھر کے''۔

''کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے''۔ شریف نے جواب دیا۔

''اور اگر کسی نے کوئی شرارت کی''۔ شریفہ نے پوچھا۔

شریف نے بہن کی طرف دیکھا۔ اور شریفہ نے بیساختہ کہا۔ ''اگر کسی نے ہمارے مکان کو آگ لگا دی؟''

''امید تو نہیں''۔ شریف نے کہا۔ لیکن ایسے انداز سے گویا وہ خود بھی کچھ خطرہ محسوس کر رہا ہے۔

''کیا اچھا ہوتا جو ہم آج کل گاؤں میں ہوتے''۔ شریفہ بولی

''کیا رکھا ہے گاؤں میں؟'' شریف نے کہا۔ ''ایک مکان ہی تو ہے بس!''

''شریف!'' شریفہ بھائی کو نام سے ہی مخاطب کرتی تھی۔ ''تم ابا جان سے کہو ہمیں چچا کے پاس بھیج دیں''۔

’’چچا کے پاس‘‘۔شریف نے تعجب سے کہا اور شریفہ نے بھی تعجب ہی سے پوچھا۔’’چچا جان کے پاس بھی کچھ خطرہ ہے کیا؟‘‘

’’جس شخص کو برسوں سے دیکھا بھی نہ ہو اس کے متعلق کوئی کیا کہہ سکتا ہے‘‘۔شریف نے جواب دیا۔

’’لیکن وہ ہمارے چچا تو ہیں آخر‘‘۔شریفہ نے بھولے پن سے کہا......’’جانے ابا جان سے کیوں بگاڑ ہے‘‘۔

’’یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن ابا جان بھی کبھی بھولے سے اس کا ذکر نہیں کرتے‘‘۔

شریف نے جواب دیا۔’’اس کی وجہ ناچاقی کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے‘‘۔

کچھ دیر دونوں بھائی بہن میں اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔

شاید نصف رات گزر چکی تھی۔آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔کبھی بجلی کوندتی۔کبھی بادل کی گرج سنائی دیتی۔ہوا بہت تیز تھی۔مولوی دلدار حسین اور اس کا کنبہ سو رہا تھا۔اچانک لوگوں کے شوروغل سے دلدار حسین کی بیوی کی آنکھ کھل گئی۔لوگ چلا چلا کر مولوی اور شریف کو آوازیں دے رہے تھے۔زینب جلدی سے اٹھی اور کمرے کی کھڑکی کھول کر دیکھنے لگی اُس وقت اُسے مکان کے سامنے کا حصہ جلتا ہوا نظر آیا اور وہ کچھ ایسی حواس باختہ ہوئی کہ دوسروں کو جگانے اور ہوشیار کرنے کے بجائے وہیں کھڑکی کے پاس کھڑی چلانے لگی۔اس کی چیخ پکار سے مولوی اور بچے بھی بیدار ہو گئے اور آگ کے شعلے مکان کے ایک حصے سے نکلتے دیکھ کر دروازے کی طرف بھاگے۔لیکن آگ بدقسمتی سے دروازے کی طرف سے ہی شروع ہوئی تھی اور ان لوگوں کے ہوشیار ہوتے ہوتے چاروں طرف پھیل چکی تھی۔بھاگنے یا بچاؤ کا اب کوئی راستہ نہ تھا۔باہر والے باہر کھڑے چلا رہے تھے اور گھر والے گھر کے اندر اِدھر اُدھر بھاگتے اور چلاتے پھرتے تھے۔آخر باہر والوں نے مل کر مکان کی ایک دیوار گرا کر مولوی اور اس کے کنبے کو نکال لیا لیکن اس کشمکش میں مولوی کے کپڑوں میں بھی آگ لگ چکی تھی اور اس کے جسم کا کچھ حصہ جل چکا تھا۔

شہر میں چونکہ کرفیو لگا ہوا تھا اس لئے اس وقت مولوی دلدار حسین کو ہسپتال پہنچانا مشکل تھا۔آخر انہی لوگوں نے جن سے مولوی صاحب کو کبھی سیدھے منہ بات کرنا بھی گوارا نہ ہوتا انہیں اپنے گھروں میں پناہ دی۔آگ اتنی تیز تھی کہ غریبوں کے دو چار مکان بھی شعلوں کی لپیٹ میں آ کر جل گئے دلدار حسین کا عالی شان مکان اور مکان کے ساتھ تمام ساز و سامان جل کر خاکستر ہو گیا۔آگ بجھانے والے انجنوں کی ٹن ٹن اب بھی کبھی سُنائی دیتی تھی۔لوگ حیران تھے کہ آگ بجھانے والا انجن اس طرف کیوں نہیں آ رہا اور یہ کہ آگ لگی کیسے۔تو جتنے منہ اتنی باتیں!

تقدیر کا پانسہ

اور افسانے ہیں گزرے ہوئے روز و شب کے
خوں ٹپکتا ہے در و بام کی پیشانی سے!
اور ویرانی لپٹ جاتی ہے ویرانی سے
شمعیں بجھتی ہیں دُھواں اُٹھتا ہے
اک نہ اک پردۂ اسرار جہاں اُٹھتا ہے
اور تغیر کے اشارات نہاں پا ہی گئے

(حامد عزیز مدنی)

صرف ایک ہی رات میں مولوی دلدار حسین کی حالت میں وہ خوفناک انقلاب رونما ہوا جو اہل نظر کے لئے ایک داستان عبرت ہو سکتا ہے۔ مولوی صاحب کی دولت جائیداد اثاثہ جو کچھ بھی تھا ان کا عالیشان مکان اور اس کا پرتکلف ساز و سامان تھا اس کے علاوہ پارچہ جات اور زیورات تھے لیکن آج نہ مکان تھا نہ ساز و سامان تھا نہ پارچہ جات رہے نہ زیورات! جو کچھ تھا آگ کی نذر ہو گیا۔ صبح ہوئی تو راکھ کا ایک ڈھیر تھا جسے لوگ خوف زدہ نگاہوں سے سہمی سہمی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ رات کرفیو کی وجہ سے مولوی دلدار حسین کو کوئی طبی مدد نہ پہنچ سکی۔ لیکن دن چڑھتے ہی وہ غریب لوگ جنہوں نے جان پر کھیل کر اس کے کنبے کو آگ سے نکالا تھا مولوی کو چارپائی پر ڈال کر ہسپتال لے گئے۔ دلدار حسین کا لڑکا شریف حسین بھی ساتھ گیا اور جب ملنے جلنے والوں کو اس سانحہ کا علم ہوا تو کچھ لوگ ہسپتال میں مولوی صاحب کی عیادت کو آئے۔ ڈاکٹروں کو مولوی دلدار حسین کے زندہ رہنے کی کچھ زیادہ امید نہ تھی۔ کچھ دردمند اظہار افسوس اور ہمدردی کے لئے مولوی صاحب کی بیوی کے پاس بھی گئے اور انہی میں سے مولوی صاحب کے ایک دیرینہ دوست شیخ کریم بخش نے مولوی صاحب کی بیگم اور بیٹی کو اپنے گھر لے جانا چاہا لیکن مولوی صاحب کی بیگم نے کہا وہ جب تک مولوی صاحب سے اجازت نہ لے کہیں نہیں جا سکتی۔

شیخ کریم بخش بولا۔ ''بھابی! موٹر موجود ہے۔ آپ اور چھوٹی بی بی میرے ساتھ ہسپتال تشریف لے چلیں۔ مولوی صاحب کو دیکھ بھی لیں اور ان سے مشورہ بھی کر لیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ مولوی صاحب سے میرے کیسے مراسم ہیں۔ میں تو آپ اور آپ کے بچوں کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ میں آپ سے کچھ عرض نہیں کر سکتا کہ آپ کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے کتنا صدمہ ہو رہا ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہم وقت پر آپ کی کچھ مدد نہ کر سکے''۔

''قسمت میں جو لکھا تھا وہ ہو گیا''۔ مولوی کی بیوی نے جواب دیا۔ ''خدا کو یہی منظور تھا۔ ہاں اگر آپ مجھے اور میری لڑکی کو ہسپتال لے چلیں تو آپ کی بہت مہربانی ہو گی''۔

''میں حاضر ہوں آپ تیار ہو جائیں''۔ کریم بخش نے کہا۔

''تیاری کیسی''۔ مولوی صاحب کی بیوی ایک آہ بھر کر بولی''۔ انہی لوگوں سے پوچھتی ہوں اگر برقع مل جائے تو اوڑھ لوں گی''۔

دو ایک عورتوں نے اپنے برقعے لا کر پیش کر دیئے اور ماں بیٹی کریم بخش کے ساتھ موٹر میں سوار ہو کر ہسپتال جا پہنچیں۔ مولوی صاحب آنکھیں بند کئے پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ جسم کا نصف حصہ تقریباً جل گیا تھا۔ چہرہ بھی جھلسا ہوا تھا۔ سر اور داڑھی کے بال بھی جل چکے تھے۔

ماں بیٹی خاموش بیٹھی تھیں۔ آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ ایک نرس پاس کھڑی تسلی دے رہی تھی۔ اتنے میں شریف حسین بھی آ گیا اور ماں اور بہن کو دیکھ کر تعجب سے بولا۔ ''اماں! تم کس کے ساتھ آئیں۔

ماں نے بتایا کہ وہ مولوی صاحب کے دوست شیخ کریم بخش کے ساتھ موٹر میں آئی ہیں۔

شریف! تم کہاں تھے؟'' شریفہ نے پوچھا۔ ''ابا کو چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے؟''

''میں ذرا ڈاکٹر کے ساتھ گیا تھا''۔ شریف نے جواب دیا۔

''کیا خیال ہے ڈاکٹر کا؟'' ماں نے پوچھا۔ ''کیا کہتا ہے ڈاکٹر' کوئی خطرہ تو نہیں؟''

شریف حسین کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ اتنے میں مولوی دلدار حسین نے آنکھیں کھولیں اور اپنے بیوی بچوں کی طرف بڑی حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ وہ کچھ دیر اسی طرح ان کی طرف دیکھتا رہا۔

''کیسی طبیعت ہے؟'' بیوی نے پوچھا۔

''شکر ہے!'' مولوی نے بڑی کمزور آواز سے جواب دیا۔ شریفہ باپ کے سینے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ مولوی نے آنکھیں بند کر لیں۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر نے آ کر دیکھا بھالا اور نرسوں کو کچھ ہدایات دے کر چلا گیا۔ یہ لوگ بہت دیر تک مریض کے پاس ہسپتال میں بیٹھے رہے شیخ کریم بخش نے گھر سے انکا کھانا وہیں بھجوا دیا۔ لیکن رات کو یہ لوگ کریم بخش کے مکان پر آ گئے۔ کریم بخش کی بیوی نے بہت ہمدردی اور محبت کا اظہار کیا۔ کریم بخش کی بیوی بولی۔

''بہن! شیخ صاحب مجھ سے ملے بغیر ہی یہاں سے چلے گئے۔ ورنہ میں خود آپ کے پاس آتی۔ آگ لگی کیسے؟''

''یہ تو اللہ ہی جانے''۔ مولوی کی بیوی نے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''کل تک گھر والے تھے۔ آج نہ گھر ہے نہ گھاٹ''۔

''اللہ مولوی صاحب کو شفا دے۔ جس نے پہلے دیا تھا وہی پھر بھی دے گا۔ شیخ کریم بخش کی بیوی نے کہا۔ تعجب تو یہ ہے کہ نگوڑے آگ بجھانے والے کیوں نہ پہنچے۔ ہوسکتا ہے کہ انہیں اطلاع ہی نہ ہوئی ہو''۔

''اطلاع کون دیتا''۔ مولوی کی بیوی زینب بی بی نے جواب دیا۔ ''شہر میں تو کرفیو لگ رہا تھا''۔

''سنا ہے کہ پڑوسیوں نے بڑی جی داری دکھائی اور آپ سب کو بچا لیا''۔ شیخ کی بیوی نے پوچھا۔

''ہاں بُوا!'' اگر یہ لوگ مدد نہ کرتے تو شاید اس وقت ہم بھی زندہ نہ ہوتے۔'' مولوی کی بیوی نے جواب دیا۔ میرے ابا جان مرحوم خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ غریب دل کے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ مجھے یاد ہے ایک بار میرے میکے میں ایک گھر کو آگ لگ گئی تھی پانی کا کچھ ایسا انتظام نہ تھا لیکن آس پاس والوں کی کوشش سے گھر کا اسباب تقریباً سارا بچ گیا۔ دولت یا غربت ہے تو اللہ کی طرف سے لیکن جو ہمدردی غریبوں کے دل میں ہوتی ہے دوسروں میں نہیں ہوتی۔ ابا جان مرحوم خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اپنی اولاد کو ہمیشہ یہی نصیحت کیا کرتے تھے کہ غریبوں سے ہمیشہ مدارات اور تلطف سے ملنا چاہئے کیونکہ وقت پڑنے پر اگر کوئی کام آتا ہے تو غریب ہی کام آتے ہیں''۔

شیخ کی بیوی نے پوچھا۔'' کچھ سامان بچا بھی؟''

''بس یہی تن کے تین کپڑے''۔ مولوی کی بیوی نے جواب دیا۔'' یہ دونوں برقعے جو میرے اور شریفہ کے پاس ہیں یہ بھی پڑوس والوں ہی سے مانگ کر لائی ہوں''۔

''خدا ہی سمجھے ان فساد کرنے والوں سے''۔ شیخ کی بیوی بولی۔'' یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ نہ دن کو چین نہ رات کو آرام''۔

''ایسے دن تو خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے''۔ مولوی کی بیوی بولی۔'' لیکن ایسی حالت میں یوں ہوا ہی کرتا ہے۔ شریفہ کے ابا عموماً مجھ سے کہا کرتے تھے کہ مسلمان جب تک اپنی تنظیم نہ کریں گے اس ملک میں عزت سے نہیں رہ سکتے اور میرے ابا جان مرحوم بھی خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ اکثر کہا کرتے کہ جس قوم میں پھوٹ پڑ جائے۔ وہ اپنا وقار بھی اور عزت بھی کھو بیٹھتی ہے اور آج یہی کچھ ہر جگہ نظر آ رہا ہے۔ مسلمان ایک دوسرے سے اس طرح جدا ہو گئے ہیں جیسے پھول کی پتیاں سوکھ کر ایک دوسرے سے جدا ہو جاتی ہیں اور ایسی ہی باتوں سے آزردہ ہو کر مولوی صاحب کانگرس میں شامل ہو گئے تھے لیکن پھر بھی ان کے دل میں قوم کا درد بھی تھا بلکہ بہت زیادہ تھا۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گی کہ ضرورت سے بھی شاید زیادہ اور اسی وجہ سے ان کے کانگرسی دوست کچھ دنوں سے ان سے کھنچے کھنچے سے رہنے لگے تھے اور مجھے تو پورا یقین ہے کہ اگر یہ حادثہ پیش نہ آتا تو وہ آج کل ہی کانگرس سے علیحدہ ہونے کا اعلان کر دیتے۔ لیکن قسمت نے موقع ہی نہ دیا''۔

شریفہ جو پاس خاموش بیٹھی تھی کبھی ماں کی طرف بھی دیکھ لیتی تا کہ اُسے اس قسم کی بے محل باتوں سے روکے۔ لیکن زینب جب باتیں کرنے بیٹھتی تو اسے منع کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔

''بوا دعا کرو''۔ شیخ کی بیوی بولی۔'' خدا یہ مصیبت کے دن جلدی دور کرے اور دونوں قومیں بھائیوں کی طرح مل جل کر رہیں۔ کیا حاصل اس خون خرابہ سے''۔

''خون خرابہ سے زیادہ خطرناک تو یہ آگ ہے''۔ مولوی کی بیوی نے کہا۔'' یہ رسم تو نئی ہی نکلی ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کو خدا اور رسول کریم نے اس قسم کی حرکتوں سے باز رہنے کی سختی سے تاکید کر رکھی ہے''۔

''یہ تو تب ہے جو کوئی خدا اور رسول کریم کو مانے بھی!'' شیخ کی بیوی نے جواب دیا۔'' یہ جانتے ہوئے سمجھتے ہوئے کہ نہ تو ہندو ہی ہندوستان چھوڑ کر کہیں جا سکتے ہیں اور نہ کوئی ہم مسلمانوں کو اس ملک سے نکال سکتا ہے۔ جانے لوگوں کی عقل پر کیا پردہ پڑ جاتا ہے جو ایک دوسرے کی جان کے

در پے ہو جاتے ہیں۔ اللہ ہی رحم کرے جینا اجیرن ہو رہا ہے آج کل تو"۔

"میں خود کئی روز سے مولوی صاحب سے کہہ رہی تھی کہ ہمیں گاؤں بھیج دیں"۔ مولوی کی بیوی نے کہا۔ "لیکن انہیں یقین تھا کہ ہم لوگ شہر میں بھی ایسے ہی محفوظ ہیں جیسے کسی اور جگہ۔ لیکن ہوا وہی جو تقدیر میں تھا"۔

"گاؤں میں بھی تو مولوی صاحب کی کچھ جائیداد ہوگی"۔ شیخ کی بیوی نے پوچھا۔

"صرف ایک مکان ہے"۔ مولوی کی بیوی نے جواب دیا۔ "مولوی صاحب کی اور ان کے چھوٹے بھائی کی بن نہ آتی تھی۔ وہ بڑا ہوشیار آدمی تھا......"

"اماں!" شریفہ نے اس خیال سے کہ کہیں اس کی ماں دونوں بھائیوں کی مخالفت کی داستان نہ لے بیٹھے بات کاٹ کر کہا۔ "شریف غریب کے پاس تو بستر بھی نہیں۔ رات کیسے کاٹے گا؟"

"کاٹ لے گا جیسے کٹے گی"۔ زینب آہ بھر کر بولی۔ "تن ڈھانپنے کو دوسرا کپڑا تو رہا نہیں۔ بستر کہاں سے لاؤں"۔

"آپ فکر مت کریں"۔ شیخ کی بیوی بولی۔ "شیخ جی اپنا کمبل بچے کو دے آئے تھے"۔

"ہاں!" مولوی کی بیوی نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "اب مانگے تانگے پر ہی گزر کرنی پڑے گی۔ شریفہ کے چچا سے اگر صلح صفائی ہوتی تو کچھ ایسا فکر نہ ہوتا لیکن مولوی صاحب کی اس کی شروع سے ہی نہ بنی۔ پھر وہ اتنا چالاک نکلا کہ باپ کے مرنے کے بعد جو آمدن کی چیز تھی یعنی کھیت اُن پر تو خود قبضہ کر لیا اور ایک مکان اپنے بڑے بھائی کو دے دیا۔ کچھ عرصہ بعد کھیت بھی بیچ ڈالے بس میرے مرحوم خسر کی یادیا ان کی خانقاہ ہے یا وہ ایک مکان جس میں ہم بھی کبھی چار روز جا بیٹھتے ہیں"۔

"بھائیوں میں بگاڑ کیوں رہتا تھا"۔ شیخ کی بیوی نے پوچھا۔

"سگے بھائی تو نہیں تھے"۔ مولوی کی بیوی نے جواب دیا۔ اور شریفہ نے ایک بار پھر موضوع بدلنے کو کہا۔

"شیخ صاحب آتے تو ان سے ابا جان کی خبر ہی معلوم ہو جاتی"۔

"فکر مت کرو بیٹی!" شیخ کی بیوی بولی"۔ وہ مولوی صاحب کو دیکھ کر ہی واپس لوٹیں گے"۔

"اماں!" شریفہ نے کہا۔ "بر قعے تو واپس بھیج دیئے ہوتے"۔

"شریفہ!" ماں ذرا غصے سے بولی۔ کیا بُری عادت ہے تمہاری...... مجھے بات تو ختم کر لینے دو"۔ پھر شیخ کی بیوی کی طرف دیکھ کر۔ "ہاں بہن میں کہہ رہی تھی کہ شریفہ کا باپ اور چچا سگے بھائی نہیں۔ پھر دونوں عورتوں میں بھی آئے دن جوتم پیزار رہتی تھی۔ دلاور کی ماں چاہتی تھی کہ گدی اس کے نام لکھی جائے لیکن میرے خسر کو یہ پسند نہ تھا۔ شریفہ کے ابا ان کے بہت لاڈلے تھے۔ گدی کی جو آمدنی ہوتی تو وہ چاروں عورتوں میں بٹ جاتی......"

"آپ کے خسر کی چار بیویاں تھیں کیا؟" شیخ کی بیوی نے پوچھا۔

"ہاں چار!" مولوی کی بیوی نے جواب دیا۔ "ان کا تعویذ دھاگا بہت چلتا تھا۔ دور دور سے حاجت مند مرادیں مانگنے آتے تھے۔ ہندو

بھی اور مسلمان بھی۔ گو ہم لوگ رہتے تو ایک گاؤں میں تھے لیکن گاؤں میں بھی دنیا بھر کی نعمتیں ہمارے لئے موجود تھیں اور خدمت کرنے کو گاؤں کی عورتیں تھیں اور آج یہ حالت ہے کہ سر چھپانے کو گھر بھی نہیں"۔

"اللہ مالک ہے"۔ شیخ کی بیوی نے کہا۔"جس نے پہلے دیا تھا وہی پھر بھی دے گا"۔

"ہاں! مولوی کی بیوی بولی"۔ دینے والا تو اللہ ہی ہے۔ لیکن ہاتھ پاؤں تو خود ہی ہلانے پڑتے ہیں اور ہاتھ پاؤں ہلانے والا جانے کب ہاتھ پاؤں ہلانے کے قابل ہو۔ مجھے وہ وقت خوب یاد ہے جب شریف کے ابا مسلم لیگ کے لئے لمبے لمبے سفر پیدل کیا کرتے تھے اپنی گرہ سے کھانا' اپنی گرہ سے خرچ کرنا۔ اور ان کی تقریر سننے کے لئے ایک دنیا بیتاب رہا کرتی تھی۔ کبھی چار دن آرام سے گھر بیٹھنا نصیب ہی نہ ہوتا تھا۔ دس روز بعد آئے دو روز رہے اور پھر چلے گئے۔ کبھی مہینہ بھر دورے پر رہتے۔ یہ تو کانگرس کے جانے بھاگ ہی ایسے تھے کہ مولوی صاحب مسلم لیگ سے دل برداشتہ ہو کر کانگرس کا دم بھرنے لگے کیونکہ انہیں پورا یقین تھا کہ وہ کانگرس کے ساتھ رہ کر مسلمانوں کی زیادہ خدمت کر سکیں گے......"

شریفہ جو ماں کی عادت سے واقف تھی بولی۔"جانے کیا وقت ہو گا۔ شیخ صاحب ابھی تک واپس نہیں آئے"۔

"شیخ صاحب عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھ کر آتے ہیں"۔ شیخ کی بیوی نے جواب دیا"اور عشا کی نماز نو بجے ہوتی ہے۔ مسجد گھر کے ساتھ ہی تو ہے"۔

ماما نے اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے شیخانی نے اپنے مہمانوں کے لئے پر تکلف کھانا پکوایا تھا۔ مولوی صاحب کی بیوی آہ بھر کر بولی۔

"ہم یہاں آرام سے بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں اور میرا شریف اپنے ابا کے پاس پریشان بیٹھا ہو گا۔ جانے ہم سے کیا خطا ہوئی جو قدرت نے ہمیں یہ سزا دی"۔

"اوہو!" شیخ کی بیوی بولی۔"بڑی غلطی ہوئی آپ نے پہلے کہا ہوتا تو بچے کا کھانا وہیں ہسپتال بھجوا دیتی"۔

"شہر میں تو کرفیو لگ رہا ہے"۔ شریفہ نے کہا۔

ہاں کرفیو تو لگ رہا ہے۔ لیکن ہمارے محلے میں پولیس کے ایک افسر رہتے ہیں۔ شیخ صاحب سے اُن کے دوستانہ تعلقات ہیں۔ ان کے آدمی جس وقت اور جہاں چاہیں جا سکتے ہیں"۔ شیخ کی بیوی نے کہا۔"شیخ صاحب کو انہوں نے کرفیو کا پاس بھی لے دیا ہے"۔

مہمانوں نے کھانا ختم ہی کیا تھا کہ شیخ صاحب بھی آ گئے۔ بیوی نے پوچھا۔

"مولوی صاحب کیسے ہیں؟"

"حالت اچھی نہیں"۔ شیخ صاحب نے جواب دیا۔

"اللہ رحم کرے۔ شیخانی نے کہا۔

"لڑکا وہیں ہے اس کے کھانے کا کیا انتظام ہو گا؟" بیوی نے پوچھا۔

"ڈاکٹر نے گھر سے منگوا کر کھلا دیا تھا"۔ شیخ نے جواب دیا۔

"مسلمان ڈاکٹر ہو گا؟" بیوی نے پوچھا۔

''نہیں ہندو ہے''۔شیخ نے کہا۔''مولوی صاحب کا بڑا مداح ہے''۔

''ان کی پارٹی کا ہوگا''۔بیوی نے کہا۔

''ہاں ہوگا''۔شیخ نے کہا۔''مولوی صاحب کی بیوی پوچھے تو ان سے کچھ کہنا نہیں''۔

''آپ آئے ہیں تو وہ پوچھیں گی تو سہی''۔بیوی نے کہا۔

''تسلی دے دینا''۔شیخ نے کہا۔''اللہ رحم کرے بیچارے پر''۔

''کیا بنے گا ان غریبوں کا''۔بیوی بولی۔''اور کوئی رشتہ دار بھی تو نہیں۔''مولوی صاحب کا ایک سوتیلا بھائی ہے لیکن اس سے مدت سے بگاڑ ہے''۔

''تم سے کس نے کہا؟''

''مولوی صاحب کی بیوی کہہ رہی تھیں۔''

''مولوی صاحب کا لڑکا ماشا اللہ بہت سمجھ دار ہے۔شیخ نے کہا۔''میں جب ہسپتال سے چلا تو مجھ سے تاکیداً کہا کہ میں اُس کی ماں اور بہن سے مولوی صاحب کی حالت کے متعلق کچھ نہ کہوں۔یوں بھی پکا مسلم لیگی معلوم ہوتا ہے۔اچھا کھانا منگواؤ اب''۔

''شیخ صاحب تو کھانا کھانے لگے اور ان کی بیوی پھر مہمانوں کے پاس آ بیٹھی۔

''کیا خبر لائے ہیں شیخ جی؟''مولوی کی بیوی نے پوچھا۔

''اللہ رحم کرے گا''۔شیخ کی بیوی نے جواب دیا۔

''ابا کو ہوش تو آ گیا ہوگا؟''شریفہ نے پوچھا۔

''ہاں ہوش ہی میں تھے''۔شیخ کی بیوی نے جواب دیا۔

''اماں شریفہ نے ماں سے کہا۔''صبح صبح ہی ہم ہسپتال چلے جائیں گے''۔

''میرا شریف تو باپ کے پاس ہی ہوگا''۔مولوی کی بیوی نے پوچھا۔

''ہاں!''شیخ کی بیوی نے جواب دیا۔''ایک ڈاکٹر نے اپنے گھر سے کھانا منگوا کر کھلا دیا تھا''۔

''کوئی مولوی صاحب کا جاننے والا ہوگا''۔مولوی کی بیوی نے کہا۔''مولوی صاحب میں یہی تو خوبی ہے کہ جو شخص ایک بار ان سے مل لے پھر عمر بھر کے لئے ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے اور مولوی صاحب نے بھی یہ اپنا اصول بنا رکھا ہے کہ اپنا نجی کام خواہ کیسا ہی ضروری ہو دوسرے کے معمولی کام کے لئے ملتوی کر دیتے ہیں۔میرے ابا جان خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ہمیں ہمیشہ یہی نصیحت کیا کرتے تھے کہ اپنا کام چھوڑ کر پہلے دوسرے کا کر دو''۔

کہیں دور سے ایک دھماکے کی آواز سنائی دی۔اور فوراً بعد ہی ''جے ہند'' اور ''پاکستان زندہ باد'' کے نعرے لگنے لگے اور کچھ دیر بعد ٹھا۔ٹھیں۔ٹھیں۔ٹھاں کی آوازیں آنے لگیں

"کہیں بم پھٹا ہے"۔شریفہ نے ذرا سہمی ہوئی آواز سے کہا۔

"شاید فساد ہو رہا ہے کہیں!" شریفہ کی ماں نے کہا۔

"دنیا پاگل ہوگئی ہے"۔شیخ کی بیوی نے کہا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔شیخ کی بیوی اٹھی اور بولی۔

"میں ابھی آتی ہوں"۔

شیخ کی بیوی چلی گئی۔شریفہ بولی۔

"اللہ ابا کو جلدی صحت دے دے تو ہم گاؤں چلے جائیں"۔

"گاؤں میں دل لگے گا تمہارا؟" ماں نے پوچھا۔

"لگے یا نہ لگے۔لیکن میں تو شہر میں رہنے کا کبھی نام بھی نہ لوں گی"۔شریفہ نے جواب دیا۔

"چپ چاپ سی ہوگئی ہے"۔شریفہ کی ماں نے کہا۔

"ہاں پولیس کی فائرنگ سے ڈر کر لوگ بھاگ گئے ہوں گے"۔شریفہ بولی۔

ٹن!ٹن!ٹن! آگ بجھانے والے انجن کی آواز آئی۔

"کہیں آگ لگی ہے"۔شریفہ نے کہا

"اللہ رحم کرے"۔شریفہ کی ماں نے کہا۔

شیخ کی بیوی آ گئی اور بولی۔

"ایک محلے میں ابھی ابھی بم پھینکا گیا تھا۔خدا کا شکر ہے کوئی زخمی نہیں ہوا"۔

"پولیس نے گولیاں تو بہت چلائیں"۔شریفہ نے کہا۔

"ہاں پولیس کی گولیوں سے کچھ لوگ گھائل ہوئے ہیں"۔شیخ کی بولی نے جواب دیا۔

"کہیں آگ لگی ہے"۔مولوی کی بیوی بولی۔بازار سے آگ بجھانے والے انجن کی ٹن ٹن کی آواز آتی تھی"۔

"شیخ صاحب کہتے ہیں کہ صبح سے بارہ چودہ مقامات پر آگ لگی ہے۔بعض گھروں سے اسلحہ بھی ملا ہے"۔شیخ کی بیوی نے کہا۔

"جانے ان لوگوں کو اسلحہ کہاں سے مل جاتا ہے؟ مولوی کی بیوی نے پوچھا۔

"ریاستوں سے"۔شیخ کی بیوی نے کہا۔"شیخ صاحب کا خیال ہے کہ اگر مسلمانوں کے پاس پندرہ فیصدی اسلحہ بھی ہوں تو مخالفوں کو کبھی سامنے آنے کا حوصلہ نہ ہو"۔

"تو مسلمان اسلحہ کیوں نہیں لے لیتے"۔شریفہ نے پوچھا۔

"مسلمان کو اسلحہ کہاں سے ملیں"۔شیخ کی بیوی نے جواب دیا"۔یہاں مسلمانوں کی ایک ریاست ہے سو وہ بھی نہ ہونے کے برابر۔پھر

مسلمان کے پاس روپیہ بھی تو نہیں جو کہیں سے خرید سکے۔ دوسروں کے پاس دولت بھی ہے اور اپنی ریاستیں بھی ہیں۔ یہی پٹیالہ' نابھہ' کپورتھلہ وغیرہ"۔

مسلمانوں کے پاس اللہ کا نام تو ہے"۔ مولوی کی بیوی نے کہا اور شیخ کی بیوی نے جواب دیا۔

"بوا یہ اللہ کے نام ہی کی تو برکت ہے کہ آج دشمن اس ہڑ بونگ میں بھی ہر جگہ مسلمانوں سے دب رہا ہے"۔

"دبے کیسے نہیں"۔ مولوی کی بیوی بولی۔ میرے ابا جان خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اکثر کہا کرتے تھے کہ اسلام کے ابتدائی زمانے میں ایک مسلمان دس کفار کے برابر ہوتا تھا۔ لیکن جب اسلام کو غلبہ حاصل ہوا اور جگہ جگہ اسلامی سلطنتیں قائم ہو گئیں اور فتنہ و فساد مٹ گیا تو پھر یہ اعلان ہوا کہ ایک مسلمان دو کفار کے برابر ہے۔

"تو گویا!" شریفہ بولی۔ "ہم دس کروڑ مسلمان بیس کروڑ غیر مسلموں کے برابر ہوئے"۔

"شریفہ!" ماں نے کہا "تم سے کس نے کہا کہ ہم یہاں صرف دس کروڑ ہیں"۔

"سبھی تو کہتے ہیں"۔ شریفہ نے جواب دیا۔

"سب غلط کہتے ہیں"۔ ماں نے جواب دیا "تمہیں یاد نہیں جب مردم شماری ہوئی تھی تو ہمارے محلے کے اکثر آدمیوں کے نام ہی نہیں لکھے گئے تھے اور تمہارے ابا جان نے بھی ایک روز بتایا تھا کہ دوسری قوم کے کچھ محرر فرضی نام لکھتے ہوئے پکڑے گئے تھے اور تمہارے نانا مرحوم خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ اس ملک میں ہم گیارہ کروڑ کے لگ بھگ ہیں۔ لیکن تمہاری تو کچھ عادت ہو گئی ہے کہ ہمیشہ اپنی قوم کی تعداد کم ہی بتاؤ گی"۔

"شیخ صاحب کا بھی یہی خیال ہے کہ ہم دس کروڑ سے زیادہ ہیں"۔ شیخ کی بیوی نے کہا۔

"اللہ ہمیں اور بڑھائے"۔ مولوی کی بیوی بولی۔ "شریفہ! تم نماز کے بعد اُمّت کی تعداد بڑھنے کی ضرور دعا کیا کرو۔ میرے ابا جان مرحوم خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ہمیشہ یہ دعا کیا کرتے تھے"۔

کچھ دیر تک عورتوں میں اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر سونے کی تیاری ہونے لگی۔ کوئی بارہ بجے کے قریب شیخ صاحب کا ٹیلی فون بجنے لگا۔

شیخ صاحب کے پلنگ کے پاس ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ گھنٹی کی آواز سن کر اُن کی آنکھ کھل گئی۔

"ہیلو!"

"ہیلو!"

"کون ہیں آپ؟"

"میں ہسپتال سے بولتا ہوں"۔

"فرمائیے!"

''مولوی دلدار حسین کا انتقال ہو گیا ہے''۔

''کب؟ کس وقت؟''

''ابھی!''

''اناللہ وانا الیہ راجعون''۔ بیساختہ اُس کے منہ سے نکلا اور وہ سر تھام کر بیٹھ گئے۔ پھر انہوں نے دوسرے کمرے میں جا کر بیوی کو جگایا۔

''کیا ہے؟''

'' اُٹھو!''

''خیر تو ہے!'' بیوی نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔ ''کہیں پھر بم پھٹا کیا؟''

''مولوی صاحب کا انتقال ہو گیا ہے''۔ شیخ نے بیوی کے پاس پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ارے انتقال!'' بیوی نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا۔ مر گئے بے چارے''۔

''ہاں مر گئے''۔ شیخ صاحب نے غمزدہ آواز سے جواب دیا۔

کچھ دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ ''آپ کو کیسے خبر ملی''۔ بیوی نے پوچھا۔

''ہسپتال سے ٹیلی فون ہوا تھا''۔

''کب؟''

''ابھی ابھی!''

''شریف نے ٹیلی فون کیا ہو گا''۔

''نہیں''۔ شیخ نے جواب دیا۔ ''ڈاکٹر نے''۔

''تو میں''۔ بیوی نے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مولوی صاحب کی بیوی سے کہوں جا کر''۔

''کہنا ہی ہو گا''۔ شیخ نے جواب دیا۔

''ہائے توبہ!'' بیوی ایک آہ بھر کر بولی۔ ''کیا بنے گا ان غریبوں کا''۔

''جو اللہ کو منظور ہو گا''۔ شیخ نے کہا۔

بیوی بولی۔ ''میرے خیال میں تو اس وقت انہیں سونے دیں صبح کہہ دیں گے''۔

''نہیں!'' شیخ نے کہا۔ ''یہ مناسب نہیں''۔

''لیکن وہ اس وقت ہسپتال تو جا نہیں سکتیں''۔ بیوی نے کہا۔

''ہسپتال جانے کی ضرورت ہی اب کیا ہے''۔ شیخ نے کہا۔

''لاش یہاں آئے گی کیا؟'' بیوی نے پوچھا۔

''لائی ہی ہوگی''۔شیخ نے کہا۔

''تو پھر میں جاؤں؟'' بیوی اُٹھتے ہوئے بولی۔''مر مٹے غریب جیتے جی!''

''ہاں جاؤ!'' شیخ نے کہا۔''تسلی دلاسہ دینا''۔

دونوں ماں بیٹی مزے سے سو رہی تھیں شیخ کی بیوی نے مولوی کی بیوی کو جگایا وہ گھبرا کر اٹھی اور بولی۔''آگ لگ گئی کیا؟''

''نہیں!'' شیخ کی بیوی نے جواب دیا۔''ہسپتال سے ابھی ابھی ٹیلی فون آیا تھا''۔

''کیا؟'' مولوی کی بیوی نے خوفزدہ آواز سے پوچھا۔''میرے شریف نے کیا ہوگا''۔

''نہیں!'' مولوی کی بیوی نے کہا۔''ڈاکٹر نے!''

''ڈاکٹر نے؟'' مولوی کی بیوی کا دل دھڑکنے لگا۔

''اللہ کی مرضی''۔شیخ کی بیوی نے ہولے سے کہا۔

''کیا ہوا؟'' مولوی کی بیوی نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔'' کچھ بتایئے تو سہی!''

''مولوی صاحب کا انتقال ہوگیا ہے۔شیخ کی بیوی نے کہا۔مولوی کی بیوی نے چیخ ماری شریفہ بھی جاگ پڑی اور دونوں عورتوں کو روتے دیکھ کر بولی۔''اماں! کیا ہوا؟''

''تمہارے ابا مر گئے شریفہ''۔ماں نے بیٹی کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔''ہم لٹ گئے شریفہ!'' دونوں ماں بیٹی رو رہی تھیں اور شیخ کی بیوی رو بھی رہی تھیں اور تسلیاں بھی دے رہی تھی۔

خانماں برباد

آنکھوں میں اشک اشک میں خونِ جگر لئے
کس کو بتاؤں آج کدھر جا رہا ہوں میں
دنیا کے رنج و غم ہیں مرے ہمدم و انیس
موجوں کے پیچ وخم میں بہا جا رہا ہوں میں

(راحت)

شیخ کریم بخش صبح صبح ہی مولوی دلدار حسین کی لاش ہسپتال سے لے آئے ریڈیو کے ذریعہ ان کے انتقال کی خبر ان کے جاننے والوں کو معلوم ہو چکی تھی اور یہ بھی اعلان کر دیا گیا تھا کہ جنازہ شیخ کریم بخش کے مکان سے اُٹھایا جائے گا۔ مرحوم کے بہت سے ملنے والے وقت پر شیخ کریم بخش کے مکان پر پہنچ گئے ان میں ہندو بھی تھے' سکھ بھی تھے اور مسلمان بھی۔ مسلمانوں کے قبرستان میں مولوی دلدار حسین مرحوم کو دفن کیا گیا۔ اس موقع پر کانگرس نے تمام اخراجات ادا کرنے چاہے لیکن مرحوم کے لڑکے شریف حسین نے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا۔ کفن دفن کے تمام اخراجات مرحوم کے دوست شیخ کریم بخش نے اپنی جیب سے ادا کئے اور لوگ افسوس اور فاتحہ خوانی کے لئے بھی شیخ کے مکان پر ہی آتے رہے۔

یہ بھی قدرت کا کھیل تھا کہ کل تک جو لوگ عزت و آبرو سے زندگی بسر کر رہے تھے آج دوسروں کے دست نگر تھے۔ گھر برباد ہو گیا تھا نہ کوئی جائیداد تھی نہ اثاثہ بس ایک خدا کی ذات تھی۔ تین دن گزرنے کے بعد کانگرس نے پھر ایک بار مولوی دلدار حسین کی بیوہ اور بچوں کو مرحوم کی خدمات کے عوض کچھ رقم پیش کرنی چاہی لیکن ان کے صاحبزادے شریف حسین نے پھر ایک بار شکریہ کے ساتھ کسی قسم کی مدد یا معاوضہ لینے سے انکار کر دیا۔ اس غیور نوجوان کے اس فیصلہ پر یار و اغیار نے تحسین و آفرین کہی۔

آخر جب کچھ فرصت ہوئی تو مولوی صاحب کی بیوہ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ ایک روز صبح صبح اپنے مکان پر جو اب خاکستر کا ڈھیر تھا گئی۔ ڈھیر کے پاس دو تین گدھے کھڑے ایک دوسرے سے کلیلیں کر رہے تھے۔ پانچ سات مرغ اور مرغیاں راکھ کرید رہی تھیں ایک کوا جلی ہوئی دیوار پر بیٹھا کائیں کائیں کر رہا تھا۔ مکان کی صرف دو دیواریں کھڑی تھیں۔ باقی جلے ہوئے سامان اور اینٹوں کا ایک انبار تھا جسے دیکھ کر دل میں ہول اُٹھتا۔ مولوی دلدار حسین کی بیوہ خاکستر کے ایک ڈھیر کے پاس بیٹھ گئی اور رونے لگی۔ شریفہ بھی ماں کے پاس بیٹھی رو رہی تھی اور شریف حسین حسرت بھری نگاہوں سے جلے ہوئے گھر کو دیکھ رہا تھا۔

پڑوس والیوں کو جب ان کے آنے کی خبر ہوئی تو بہت سی عورتیں فوراً آ گئیں۔ کچھ مرد بھی ذرا فاصلے پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ سب عورتیں

مولوی دلدار حسین کی بیوہ اور بیٹی کے پاس کھڑی رو رہی تھیں اور مرد شریف حسین سے اظہار ہمدردی کر رہے تھے۔ کچھ عورتوں کے اصرار سے مولوی صاحب کی بیوہ اور بیٹی ایک عورت کے گھر آ بیٹھیں۔ شریف حسین کے لئے گھر والے نے دھوپ میں چار پائی ڈال دی۔

زینب اور اس کی بیٹی شریفہ خاموش بیٹھی تھیں اور سب عورتیں بول رہی تھیں۔

''یہ شرارت کسی دشمن کی ہے''۔

'' اُس روج دن بھر لالے لوگ مولوی صاحب کے پاس آتے رہے تھے''۔

'' ہوا ہونی ہو کر رہتی ہے''۔

''توبہ ہے! آگ تو آسمان کی کھبر (خبر) لاتی تھی۔ سولے (شعلے) دیکھ دیکھ کر دل بیٹھا جاتا تھا''۔

''شکر کرو جانیں بچ گئیں''۔

اور مردوں میں سے ایک شریف حسین سے کہہ رہا تھا۔

''مولبی جی! آپ اگر حکم دیں تو ہم ملبہ اُٹھا دیں''۔

''ہاں بھائی اٹھانا تو چاہئے''۔ ایک اور نے کہا۔ ''شاید کوئی بچی کھچی چیز مل ہی جائے''۔

''مشکل ہے''۔ ایک اور نے کہا۔ ''ہم نے تو جندگی میں ایسی آگ کبھی دیکھی ہی نہیں''۔

''آگ لگی کیسے؟''

''کسی دشمن کا کام ہے''۔

''ہاں! ہے تو کوئی دشمن ہی۔ جو پہلے دروازے ہی کو جلایا''۔

''لیکن مولبی جی تو پھرستہ (فرشتہ) تھے ہم نے تو کبھی سنا نہیں جوان کی بھی کسی سے دشمنی ہو''۔

''یہ تو مت کہو تم۔ مسلمان تو کبھی ناراج تھے''۔

''میرے یار چھوڑ دیہ باتیں کوئی کام کی بات کرو۔ ملبہ تو جرور اٹھانا چاہئے۔ میرا دل کہتا ہے کچھ نہ کچھ تو جرور بچ گیا ہوگا''۔

''تو پھر اٹھاتے کیوں نہیں''۔

''حاکم سے اجاجت لینی ہوگی''۔ ایک بوڑھے نے کہا۔ ''کیوں چھوٹے مولبی جی!''

''بڑے میاں!'' شریف حسین بولا۔ ''مجھے تو کچھ علم نہیں''۔

''ابھی کامیٹی (کمیٹی) کا جمادار آئے گا اس سے پوچھ لیں گے''۔

''ہاں ٹھیک ہے، اُسے جرور خبر ہوگی''۔

''چھوٹے مولبی جی! آپ کوئی پھکر نہ کریں۔ ہم سب آپ کے گلام ہیں۔ اجاجت مل جائے تو ہم سب ملبہ کھد اٹھا دیں گے اور رتی بھر چیز بھی آپ کی کھدمت میں پہنچ جائے گی''۔

ایک بوڑھا جس کے کپڑے اوروں سے ذرا اجلے تھے بولا۔

''چھوٹے مولبی جی! ہم گریب لوگ ہیں۔لیکن آپ کو پسند ہو تو میرا گھر حاجر ہے۔جب تک نیا مکان بنے بڑی کھسی سے گریب کے گھر رہیں''۔

''بڑی مہربانی ہے تمہاری بڑے میاں''۔شریف حسین نے احسان مند نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

اتنے میں شیخ کریم بخش موٹر پر آ گیا۔شریف حسین تعظیم کے لئے کھڑا ہو گیا۔دوسرے لوگ بھی کھڑے ہو گئے

''آپ پیدل کیوں چلے آئے''۔شیخ نے پوچھا۔موٹر موجود تھا۔موٹر کیوں نہ نکلوالیا''۔

''بس ایسے ہی چلے آئے''۔شریف حسین نے جواب دیا۔

''میرے خیال میں آج ملبہ اُٹھانے آدمی آ جائیں گے''۔شیخ کریم بخش نے کہا۔

''کون بھیجے گا آدمی!''شریف نے پوچھا۔

''میں نے سیکرٹری سے بات چیت کی تھی''۔شیخ کریم بخش نے جواب دیا۔''کمیٹی ہی کے آدمی آئیں گے۔لیکن کسی کو نگرانی ضرور کرنی چاہئے''۔

اس پر وہی بوڑھا جس نے رہنے کو اپنا گھر پیش کیا تھا بولا۔

''چھوٹے مولبی جی۔ملبہ اُٹھانے کا کام ہم خود کریں گے اور نگرانی بھی کریں گے۔جو کچھ نکلے آپ کی دولت ہے''۔

''تو بڑے میاں!''شیخ نے کہا۔''اجرت کا فیصلہ کرلو۔تم لوگ ہی کام پر لگ جاؤ''۔

''واہ ساب!بوڑھے نے ذرا ناراضگی سے کہا۔''کھوب بات کہدی آپ نے۔اپنا ہی گھر ہے۔کسی گیر(غیر) کا تو نہیں۔کھدا کی کسم! ہماری تو مولوی جی کے بچوں کے لئے جان بھی حاجر ہے اور آپ مجدوری کا کہہ رہے ہیں''۔

''شاباش!''شیخ نے مسکرا کر کہا۔

''ہمیں تو پیاسوس(افسوس) ہے کہ ہم کچھ کھدمت نہ کر سکے''۔ایک اور شخص نے کہا۔

اور شریف حسین بولا۔

''تم لوگ اگر مدد نہ کرتے تو شاید ہم زندہ باہر بھی نہ نکل سکتے''۔

''مدد کرنے والا تو وہ کھدا ہے جی!ہم گن گار(گنہگار) لوگ ہیں''۔

تو کچھ دیر بعد یہی فیصلہ ہوا کہ یہی لوگ ملبہ اٹھائیں۔

ادھر جب مولوی دلدار حسین مرحوم کی بیوہ اور بیٹی واپس جانے کو تیار ہوئیں تو ایک عورت نے کہا۔

''بی بی جی!گو ہم کسی کارن نہیں لیکن ہم آپ کی کھادم(خادم) ہیں جب جرورت ہو ہمیں بلوالیں''۔

''خدا کے بعد اب تم بہنوں کا تو مجھے آسرا ہے''۔مولوی مرحوم کی بیوہ نے آبدیدہ ہو کر کہا۔

ایک اور بولی۔''اب مہربانی کر کے نیا مکان جلدی بنوالیں آپ۔ہم تو یہ دو چار روز میں ہی آپ کے لئے اُداس ہو گئے''۔

''جو خدا کو منظور ہے''۔مولوی کی بیوہ نے دوپٹہ سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

اور ایک عورت نے ذرا دبی زبان سے کہا۔

''بی بی جی! دس بیس روپے کی جرورت ہو تو حاجر ہیں''۔

''ضرورت ہو گی تو لے لوں گی''۔مولوی مرحوم کی بیوی نے جواب دیا۔

اور ایک محبت سے شریفہ کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی۔

''بیٹی! صبر کرو۔اللہ بے نیاج ہے۔سب کام ٹھیک ہو جائیں گے''۔

اور ایک جوان لڑکی جو شریفہ کی ہم عمر معلوم ہوتی تھی شریفہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی۔''پھر کب آؤ گی؟''

شریفہ کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے وہ اپنے دوپٹہ سے شریفہ کی آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی۔''رو نہیں! شکر ہے اللہ نے جندگی بچا لی''۔

شریف آیا اور بولا۔''اماں! اب آؤ چلیں۔شیخ جی موٹر لے کر آئے ہیں''۔

سب عورتیں موٹر تک ساتھ آئیں اور جب یہ لوگ سوار ہوئے تو کئی ایک کے آنسو نکل آئے اور زینب حسرت سے اپنے برباد شدہ گھر کو دیکھتی ہوئی اور آہیں بھرتی ہوئی بیٹے اور بیٹی کے ساتھ موٹر میں سوار ہو کر چلی گئی۔

اگلے روز مولوی صاحب کے پڑوسیوں نے ملبہ اٹھانے کا کام شروع کر دیا۔شریف حسین صبح صبح وہاں چلا جاتا۔تین چار روز ملبہ اٹھانے میں لگ گئے۔سوائے پیتل تانبے کے چند ظروف کے باقی سب سامان جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ایک ٹرنک میں کچھ نوٹ تھے کچھ زیورات تھے۔نوٹ تو راکھ ہو چکے تھے اور زیورات بھی پگھل کر سیاہ ڈھیلہ سا بنے ہوئے تھے۔آفرین ہے ملبہ اٹھانے والوں پر جو چیز بھی ملتی شریف حسین کو لا کر دیتے۔اور شریف ماں کو لا کر دے دیتا۔صبر شکر یا رونے کے سوا وہ غریب اور کیا کر سکتی تھی۔شیخ اور اس کی نیک دل بیوی ان مصیبت کے ماروں کی ہر وقت دلجوئی کرتے رہتے۔جب ملبہ اٹھانے کا کام ختم ہو چکا تو تینوں بیٹھ کر آئندہ کے لئے صلاح مشورہ کرنے لگے۔

شریفہ کی رائے تھی کہ وہ اپنے چچا کے پاس چلے جائیں اور ماں بھی کچھ نیم رضامند معلوم ہوتی۔لیکن شریف حسین اس تجویز کے خلاف تھا۔اُس نے کہا۔

''اماں! کس منہ سے اور کس چچا کے پاس جائیں جس نے بھول کر کبھی یاد بھی نہیں کیا''۔

''یہ تو سچ ہے''۔ماں نے جواب دیا۔''لیکن بیٹا ناخن سے گوشت جدا نہیں ہو سکتا۔اسے جب اپنے بھائی کے مرنے اور ہمارے تباہ ہونے کی خبر ملے گی تو ضرور ہماری مدد کریگا وہ اگر ناراض تھا تو اپنے بھائی سے تھا ہم سے تو نہ تھا''۔

''تم چاہتی ہو کہ ہم چچا کی خیرات پر گزر کریں''۔شریف حسین نے پوچھا۔

''اپنوں سے مدد لینا خیرات تو نہیں''۔ماں نے جواب دیا۔''پھر یہ بھی تو دیکھنا ہے کہ گزر کیسے ہو گی۔نقد ایک پیسہ نہیں ہمارے پاس۔یہ

دو ایک زیور بیچ کر بھی کیا بنے گا۔کوئی چار پانسو روپے سے زیادہ دے گا بھی نہیں''۔

''اماں! میرے خیال میں تم یہ چیزیں فروخت کر دو اور شریفہ کو ساتھ لے کر گاؤں چلی جاؤ''۔شریف حسین نے کہا۔

''اور تم؟'' ماں نے پوچھا۔''تم کہاں جاؤ گے؟ کیا کرو گے؟''

''شاید شیخ صاحب کی کوشش سے مجھے کہیں ملازمت مل جائے''۔شریف حسین نے جواب دیا۔

''تم کچھ پڑھے ہوتے تو شاید یہ ممکن بھی ہوتا''۔ماں نے کہا۔''مجھے یاد ہے میری شادی سے پہلے ہمارے کنبے میں ایک نوجوان لڑکا تھا۔اس نے انٹرنس تک تعلیم پائی تھی اور تمہارے نانا خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اسے بڑی مشکلوں سے چٹھی رسانوں میں بھرتی کروا سکے تھے۔پھر یہ فسادات جانے کب ختم ہوں۔میں تمہیں اکیلا چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی''۔

''لیکن یہ بھی تو ٹھیک نہیں کہ ہم شیخ صاحب کے یہاں یوں پڑے رہیں''۔شریفہ نے کہا۔

''میں کب یہاں پڑے رہنے کو کہہ رہی ہوں''۔ماں نے جواب دیا۔''میں بھی تو اسی فکر میں ہوں کہ ہم ان لوگوں کو زیادہ تکلیف نہ دیں۔آج سات آٹھ روز ہو گئے یہاں آئے۔کوئی کب تک بٹھا رکھے گا ہمیں؟''

''اسی لئے تو میں نے کہا تھا کہ چچا جان کے پاس چلے جائیں''۔شریفہ نے کہا۔''اور نہیں تو سر چھپانے کا آسرا تو ہو جائے گا اور شاید ان کی کوشش سے شریف کے لئے کاروبار کی بھی کوئی صورت نکل آئے''۔

''تم دونوں چچا کے پاس جانے کو کہہ رہی ہو''۔شریف بولا۔''لیکن اگر اُس نے ٹکا سا جواب دے دیا پھر۔پھر کہاں جاؤ گی۔کیا کرو گی؟''

''کہتے تو تم بھی ٹھیک ہو''۔ماں نے جواب دیا۔''لیکن امید نہیں وہ ایسا کورا نکلے''۔

''تمہیں یاد نہیں اماں!'' شریف حسین نے کہا۔''جب ابا جان مرحوم کی مالی حالت بہت خراب تھی اور تم نے ان سے کہا تھا کہ بھائی سے کچھ روپے قرض منگوا لو۔تو انہوں نے کیا جواب دیا تھا؟''

''ہاں مجھے یاد ہے''۔ماں نے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''میں بھلا یہ واقعہ کیسے بھول سکتی ہوں۔میں نے جب اُن سے بھائی سے قرض لینے کو کہا تو وہ میری طرف غصے سے دیکھ کر بولے کہ میں بھیک مانگ لوں گا لیکن بھائی سے قرض نہیں لوں گا''۔

''تو اماں!'' شریف حسین نے جواب دیا۔''میں بھی اسی باپ کا بیٹا ہوں۔مجھ سے بھی یہ ذلت گوارا نہ ہو گی۔خواہ تم ناراض کیوں نہ ہو جاؤ''۔

''تو پھر گاؤں ہی چلنے کی صلاح ہے کیا؟'' ماں نے پوچھا۔

''اور کوئی صورت بھی تو نہیں''۔شریف حسین نے جواب دیا۔''پیٹ بھر کھانے کو نہ ملے گا تو بھوکے بھی تو نہ مریں گے۔پھر اپنا گھر بھی تو ہے اور خانقاہ کی آمدن کا چوتھا حصہ بھی ہے۔گو میں نذر نیاز کا روپیہ لینا پسند نہیں کرتا''۔

''اور یہاں جو مکان کی زمین ہے اس کا کیا بنے گا؟'' شریفہ نے پوچھا۔

''زمین کوئی اٹھا کر نہیں لے جائے گا''۔شریف حسین نے جواب دیا اور ماں آب دیدہ ہو کر بولی۔

''میرا دل تو یہ چاہتا ہے کہ یہیں کہیں جھونپڑی ڈال لوں''۔

شریفہ کی آنکھوں سے بھی آنسو گرنے لگے۔ان لوگوں میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ شیخ کی بیوی آ گئی۔شیخ کی بیوی شریف سے پردہ کرتی تھی وہ اُٹھ کر باہر چلا گیا۔کچھ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد مولوی صاحب کی بیوہ زینب نے کہا۔

''بوا !آپ نے ہم پر جو احسان کیا ہے ہم مرتے دم تک اس سے سبک دوش نہیں ہو سکتے۔اب ایک مہربانی اور بھی کریں''۔

''فرمائیے!''

''مکان کے ملبہ میں سے کچھ ظروف اور کچھ زیورات پگھلے ہوئے ملے ہیں۔آپ شیخ صاحب سے کہیں کہ انہیں فروخت کرا دیں۔کیونکہ ایک آدھ روز تک ہم گاؤں واپس چلے جائیں گے''۔

''وہ تو آپ جس وقت چاہیں فروخت ہو سکتے ہیں لیکن گاؤں جا کر آپ کیا کریں گے''۔شیخ کی بیوی نے پوچھا۔

''اور کوئی جگہ بھی تو نہیں''۔شریف کی ماں نے جواب دیا۔

''یہ بھی تو آپ کا ہی گھر ہے''۔شیخ کی بیوی نے کہا۔

''خدا آپ کو سلامت رکھے!آپ کے احسان تو ہم مرتے دم تک نہیں بھول سکتے''۔

شریفہ کی ماں نے جواب دیا۔''آخر ایک روز تو ہمیں کہیں جانا ہی ہے۔میرا تو خیال تھا کہ میں بچوں کو ان کے چچا کے پاس لے جاؤں۔لیکن میرا شریف نہیں مانتا''۔

''اگر کچھ آپ کی خدمت کی ہے تو یہ احسان نہیں بلکہ اپنا فرض ادا کیا ہے۔میرے خیال میں تو آپ جب تک خدا کوئی بہتر صورت پیدا نہ کر دے غریب خانہ پر ہی قیام رکھیں۔کم از کم جب تک یہ فساد ختم نہ ہوں آپ کو کہیں دوسری جگہ نہیں جانا چاہئے''۔

''گاؤں تو شہر سے کچھ زیادہ محفوظ ہوگا''۔شریفہ کی ماں بولی۔''پھر روکھی سوکھی جو مقدر میں ہے مل ہی جائے گی۔وہاں اپنا مکان بھی ہے''۔

''لیکن آپ نے اتنی جلدی چلے جانے کا ارادہ کیوں کر لیا''۔شیخ کی بیوی نے پوچھا اور شریفہ کی ماں آبدیدہ ہو کر بولی۔

''اور اب رہیں کس کے لئے۔مجھے وہ دن آج تک یاد ہے جب مرحوم دن بھر معماروں کے کام کی نگرانی کیا کرتے تھے انہیں اپنا مکان بنوانے کا اتنا شوق تھا کہ سب قومی کام بھی بھولے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔جب مکان بنا تو جہاں کہیں بھی جاتے مکان کی آرائش کے لئے کوئی نہ کوئی چیز ضرور لے آتے شریفہ کو ریڈیو کا شوق تھا۔اسے ریڈیو لا دیا۔شریف حسین کو نئی بائیکل لے دی۔بمبئی گئے تو ہم سب کے لئے بڑے خوبصورت پارچہ جات لائے۔خدا جنت نصیب کرے وہ تو جیتے جی ہم لوگوں کے لئے تھے۔اور میری قسمت دیکھو مجھ نگوڑی کو ان کی خدمت کرنے کا بھی موقع نہ ملا......''

شریفہ کی آنکھوں سے بھی آنسو گر رہے تھے اور شیخ کی بیوی بھی متاثر نظر آتی تھی۔شریفہ کی ماں دوپٹہ سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

''شریف حسین کو اعلیٰ تعلیم کے لئے ولایت بھیجنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ اور آج جانے دل میں کیا آیا کہ ہم سب کو چھوڑ کر خود ہی منہ چھپا کر چلے گئے اور اگر شیخ صاحب نہ ہوتے تو شاید غریب کو کفن بھی خیرات ہی کا ملتا''۔

''بوا !'' شیخ کی بیوی دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''صبر کرو۔ ماشاءاللہ تمہارا بیٹا جوان ہے۔ وہ کمائے گا اور سب کے دلدر دور ہو جائیں گے''۔

''ہاں!'' شریفہ کی ماں ایک آہ بھر کر بولی۔ ''مجھ رانڈ کا وہی تو ایک سہارا ہے۔ ابھی ابھی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں شریفہ کے ساتھ گاؤں چلی جاؤں وہ شیخ صاحب سے کہے گا کہ اسے کہیں ملازم کرا دیں۔ لیکن کون ماں ہوگی جو ان حالات میں اپنے بچے کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلی جائے''۔

''شریف حسین یہاں رہنا چاہے تو سر آنکھوں پر''۔ شیخ کی بیوی نے جواب دیا ''رہی ملازمت تو جب تک حالات استوار نہیں ہوتے ملازمت کا ملنا بہت مشکل ہے۔ شیخ صاحب ایک روز مجھ سے کہہ رہے تھے کہ جب تک مسلمان تجارت کی طرف توجہ نہیں کریں گے ان کی بدحالی دور نہیں ہو سکتی۔ کاروبار میں بڑی برکت ہے۔ اگر خدا کام چلا دے''۔

کچھ دیر اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر شریفہ کی ماں نے کہا۔

''تو آپ یہ سونا چاندی جو کچھ بھی ہے لے جائیں اور شیخ صاحب سے کہیں کہ کسی کی معرفت فروخت کرا دیں''۔

''آپ کو معلوم ہے کہ آج کل بازار سنسان پڑے ہیں۔ سب کاروبار بند ہے۔ آپ کو اگر کچھ روپے کی ضرورت ہے تو میں پیش کر دیتی ہوں''۔ شیخ کی بیوی نے کہا۔ ''فرمایئے! کتنے روپے چاہئیں؟''

''یوں نہیں!'' شریفہ کی ماں نے جواب دیا۔ ''آپ سونے چاندی کی ملی جلی یہ ڈلی اپنے پاس رکھ لیں اور کم سے کم ایک سو روپیہ مجھے بطور قرض دے دیں۔ جب یہ فروخت ہو جائے تو اپنی رقم کاٹ کر باقی روپیہ مجھے گاؤں بھیج دیں۔ گاؤں میں ڈاک خانہ بھی ہے آپ میرے شوکت حسین کے نام روپیہ بھیج سکتی ہیں''۔

''آپ اصرار کرتی ہیں تو میں یہ ڈلی امانت کے طور پر رکھ لیتی ہوں۔ روپے جتنے آپ چاہیں لے لیں''۔

گاؤں جانے سے ایک روز پیشتر مولوی دلدار حسین مرحوم کی بیوہ اور لڑکا لڑکی اپنے پڑوسیوں سے رخصت ہونے گئے۔ غریب پڑوسی آج بھی بڑی آؤ بھگت سے پیش آئے اور طرح طرح سے ہمدردی اور محبت کا اظہار کرتے رہے۔

شریفہ کی جن لڑکیوں سے ملاقات تھی رخصت کے وقت بھینچ بھینچ کر اس سے ملیں۔ گاؤں جانے سے پیشتر شیخ کریم بخش نے ان خانماں بربادوں کے لئے اپنی گرہ سے دو دو جوڑے کپڑوں کے بنوا دیئے تھے۔ جس روز انہیں وطن جانا تھا شیخ صاحب انہیں سوار کرانے اسٹیشن پر آئے اور اپنی جیب سے ٹکٹ خرید کر دیئے۔ غریب پڑوسیوں میں سے بھی دو چار آدمی الوداع کہنے اسٹیشن پر موجود تھے۔

گاؤں

یہاں سرگوشیاں کرتی ہے ویرانی سے ویرانی
فسردہ شمع اُمید و تمنا لو نہیں دیتی!
یہاں کی تیرہ بختی پر کوئی رونے نہیں آتا
یہاں جو چیز ہے ساکت ہے کروٹ تک نہیں لیتی

(اختر الایمان)

مولوی دلدار حسین مرحوم کی بیوہ اور بچوں کے پہنچتے ہی گاؤں والوں کو مولوی صاحب کے مرنے کی خبر ہوگئی اور گاؤں والے فاتحہ کے لئے آنے لگے۔ ادھر عورتوں کا تانتا سا بندھ گیا۔ اور زینب غریب کو ہر آنے والی کو شروع سے یہ داستان الم سنانی پڑتی۔ آج کا سارا دن اسی دھندے میں گزرا۔ کتنے نیک دل، کیسے شریف، یہ سادہ لوح دہقان تھے۔ کسی کے کہے بغیر ہی ان لوگوں نے ان بیکسوں کے کھانے پینے کا انتظام کر دیا کوئی دس پندرہ سیر آٹا دے گیا۔ کسی نے گھی بھیج دیا۔ کوئی دال لے آئی، کسی نے گڑ اور شکر بھیج دی۔ کوئی دال لے آئی، کسی نے گڑ اور شکر بھیج دی۔ کوئی اُپلوں کے دو ٹوکرے ڈال گئی۔ کسی نے گڑوی بھر دودھ بھیج دیا۔ تینوں کے لئے صاف ستھرے بستر بھی آ گئے۔ کوئی پانی بھر کر رکھ گئی۔ ایک خوفناک مصیبت کے بعد یہ گھر اور گاؤں ان کے لئے جنت بن گیا اور کئی روز کی بے چینی، ڈر اور خوف کے بعد انہیں سکھ کا سانس لینا نصیب ہوا۔

پیر مہتاب شاہ کے عرس میں دو چار روز باقی تھے۔ خانقاہ کے متولی عرس کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ لنگر کے لئے آس پاس کے گاؤں سے ضرورت کی چیزیں آ رہی تھیں۔ جیسے کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں خانقاہ پر جو چڑھاوا چڑھتا تھا اس کا چوتھا حصہ مولوی دلدار حسین مرحوم کو ملتا تھا۔ عرس تین دن رہتا۔ قوالی بھی ہوتی، ختم بھی ہوتا۔ لنگر بھی تقسیم ہوتا رہتا۔ نیزہ بازی، گھوڑ دوڑ اور کشتیاں بھی ہوتیں۔ عقیدت مند دور دور سے آتے۔ تین دن ایک میلہ سا لگا رہتا۔

عرس کے دنوں میں جب زائروں کو معلوم ہوا کہ سائیں مہتاب شاہ مرحوم کا پوتا بھی گاؤں میں موجود ہے تو وہ اس سے بڑی عقیدت سے ملے اور جو کوئی بھی ملتا کچھ نذر بھی پیش کرتا عورتیں مولوی دلدار حسین مرحوم کی بیوہ اور بیٹی کی ''زیارت'' کرتیں اور نذر پیش کرتیں۔ اور دعا کی طالب ہوتیں۔ ان لوگوں کو جب مولوی دلدار حسین مرحوم کے گھر کے جل جانے کا علم ہوا تو اکثر نے نیا مکان بنانے کے لئے چندہ کے طور پر کچھ رقم پیش کی اور بعض نے واپس جا کر بھیجنے کا وعدہ کیا لیکن شریف حسین نے اس قسم کی مدد لینے سے انکار کر دیا۔ تو یہ تین دن گاؤں میں خوب چہل پہل رہی اس کے بعد پھر وہی گاؤں اور وہی گاؤں کی خاموشیاں اور اداسیاں تھیں۔ گاؤں والوں کا خیال تھا کہ شریف حسین شاید اپنے دادا کی گدی سنبھالے گا۔ اور

اکثر لوگ خود بھی یہی چاہتے تھے لیکن شریف حسین اس قسم کی گھٹیا باتوں سے بہت بلند تھا۔اس کے عزائم ارادے کچھ اور ہی تھے لیکن ان عزائم اور ارادوں کی باگ ڈور تو کاتبِ قدرت کے ہاتھ میں تھی۔

بہرکیف گاؤں میں آ جانے سے اتنا تو ضرور ہوا کہ یہ لوگ فکر معاش سے آزاد ہو گئے لیکن کہاں وہ شہر کی زندگی اور کہاں یہ ایک چھوٹا سا گاؤں' یہاں کا تمدن' یہاں کی تہذیب' یہاں کی معاشرت شہر والوں سے یک سر مختلف تھی۔دل لگتا تو کیسے لگتا۔شریفہ کسی وقت گاؤں کی لڑکیوں کے ساتھ کھیتوں کو نکل جاتی۔بیریوں میں بیر آئے ہوئے تھے۔سب لڑکیاں مل کر بیر کھاتیں اور جھولیاں بھر بھر کر گھر لاتیں۔لیکن شریف حسین گاؤں والوں سے کچھ علیحدہ علیحدہ ہی رہتا۔وہ صبح و شام کھیتوں کی طرف نکل جاتا اور گھوم گھام کر وقت کاٹتا۔لیکن گاؤں والوں میں بھی ایک زندگی تھی۔شہر والوں کی طرح یہ لوگ بھی دن بھر زندگی کے دھندوں میں لگے رہتے۔کوئی بھیڑوں کے ریوڑ لے کر میدانوں کی طرف چلا جاتا۔گاؤں کے لڑکے دن بھر اپنے مویشی ادھر اُدھر چراتے پھرتے۔کوئی گادھی پر بیٹھا رہٹ چلاتا۔کوئی کندھے پر کسی رکھے کھیتوں کو پانی دینے میں منہمک نظر آتا۔کہیں ہل چل رہا ہے کوئی بیلوں کو چارہ ڈال رہا ہے کوئی کھیتوں کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔کنویں پر عورتوں کے جمگھٹے لگے ہوئے ہیں۔کوئی پانی بھر رہی ہے کوئی مٹکے صاف کر رہی ہے۔کوئی جگت پر بیٹھی میلے کپڑے دھو رہی ہے۔کام بھی ہو رہا ہے اور باتیں بھی اور کبھی دو تین مل کر گیتوں کی تانیں بھی اڑانے لگتیں۔کوئی چرخہ لئے سوت کات رہی ہے۔کوئی چکی پیس رہی ہے کوئی گیہوں صاف کر رہی ہے کوئی پھٹے کپڑوں میں پیوند لگا رہی ہے۔کوئی بچے کو جھولے میں ڈالے لوریاں سنا رہی ہے اور کوئی گھرکیاں دے رہی ہے۔

زندگی! جدھر دیکھو زندگی! فکر سے آزاد زندگی آلام سے بے پروا زندگی' فرقہ وارانہ فساد سے پاک زندگی۔لیکن ان پناہ گزینوں کے نقطۂ نگاہ سے ایک بے کیف زندگی تھی۔ایسی زندگی جس کی نہ کوئی قدر تھی نہ قیمت!

بھلا یہ بھی کوئی زندگی تھی کہ خانقاہ کی آمدن پر زندگی کے دن بسر کئے جائیں اور آمدن بھی معمولی سی۔وقت اسی طرح گزر رہا تھا اور یہ لوگ شہر کے حالات سے بالکل بے خبر تھے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے اور کیسے گزر رہی ہے۔گاؤں میں آٹھویں دن ڈاکیہ ڈاک لاتا تھا گاؤں کا ایک جولاہا جو کپڑا بھی بنتا تھا ڈاک بابو کا کام بھی کرتا اور اس کے عوض اُسے دس روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ڈاک خانہ کا بابو لوگوں کے خط ان کے گھروں پر خود ہی پہنچا دیا کرتا۔اور گاؤں والے بھی اس خدمت کے عوض فصل کے موقع پر کچھ اناج اُسے دے دیا کرتے۔ایک روز ڈاک بابو شریف حسین کے پاس آیا اور سلام علیکم کہہ کر پاس بیٹھ گیا۔

''کوئی خط ہے کیا؟'' شریف حسین نے پوچھا۔

''خط بھی ہے اور منی آرڈر بھی''۔ڈاک بابو نے تھیلے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

اس نے ایک لفافہ اور ایک منی آرڈر فارم نکال کر شریف حسین کو دیا۔خط اور روپے شیخ کریم بخش نے بھیجے تھے۔شیخ کے خط سے معلوم ہوتا تھا کہ فتنہ و فساد تقریباً ختم ہو چکا ہے اور اب گناہگار اور بے گناہ دونوں پر مقدمات بنائے جا رہے ہیں۔شیخ نے وہ زیور جو اس کی ماں شیخ کی بیوی کو دے آئی تھی فروخت کر کے روپے بھیجے تھے۔شریف خط اور روپے لے کر ماں کے پاس گیا۔اور روپے اس کے سامنے رکھ دیئے۔

''یہ روپے کہاں سے آئے؟'' ماں نے پوچھا۔

''شیخ کریم بخش نے بھیجے ہیں''۔شریف نے جواب دیا۔

''اور وہ روپے جو میں اُن سے قرض لائی تھی''۔ماں نے بیٹے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''وہ تو انہوں نے نہیں کاٹے''۔شریف نے جواب دیا۔

''لکھا کیا ہے؟''ماں نے پوچھا۔

شریف نے شیخ کا خط ماں کو دے دیا۔

''نہیں!نہیں!''زینب بولی۔''شیخ جی کے روپے واپس لوٹا دینے چاہئیں''۔

''ہاں!ہاں!ضرور''۔شریف حسین نے کہا۔

''تو آج ہی منی آڈر کردو''۔ماں نے کہا۔

''کوئی ایسی جلدی نہیں''۔شریف نے کہا۔''آج سے ساتویں روز یہاں سے ڈاک جائے گی''۔

''دیکھا!''ماں بولی۔''جو کچھ میں کہتی تھی وہی شیخ جی نے بھی لکھا ہے نا''۔

''کیا لکھا ہے؟''شریفہ نے پوچھا۔

''وہ بھی یہی چاہتے ہیں کہ ہمیں تمہارے چچا دلاور حسین کے پاس چلے جانا چاہیے''۔

''میں تو یہ کب سے کہہ رہی ہوں''۔شریفہ بولی۔''لیکن کوئی میری سنے بھی''۔

''اپنے اپنے ہی ہوتے ہیں''۔ماں نے کہا۔''کب تک یہاں گاؤں میں پڑے رہیں گے۔''ابھی تو یہ لوگ بڑی عزت سے پیش آتے ہیں لیکن کون جانے کل کیا پیش آئے۔ان لوگوں کے لئے ہماری بپتا تو ایک کہانی ہوگئی ہے۔میرے ابا جان خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ اپنے مصائب کا ہر کسی سے ذکر نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اس میں شکایت کا پہلو نکلتا ہے۔مخلوق کو اپنے خالق سے شکایت' توبہ!خدا ہم سب کو اپنی پناہ میں رکھے۔بندے کی کیا مجال جو اسے اپنے خالق سے شکایت یا گلہ ہو''۔

''شریف بھائی!''شریفہ بولی۔''کیا خیال ہے تمہارا؟ کچھ تم نے بھی سوچا۔

''ہاں!''زینب اس ہاں کو لمبا کر کے بولی۔''اب ہمارے قافلے کی مہار تمہارے ہاتھ میں ہے بیٹا!تم جدھر کا رخ کرو گے۔ہم پیچھے ہوں گے۔داناؤں کا قول ہے کہ قوم کا سردار جو کچھ کہے دوسروں کو وہی کرنا چاہئے۔اب باپ کی جگہ شریف تم ہو...... بتاؤ اب کیا صلاح ہے تمہاری؟''

''میں کیا بتاؤں اماں!......''شریف حسین نے ماں کی طرف دیکھ کر جواب دیا''۔کاش میں تم دونوں کی کچھ خدمت کرسکتا''۔

''تو اب کون کر رہا ہے؟''ماں نے پوچھا۔''خدا کے سوا اب ہمیں تمہارا ہی تو سہارا ہے۔اولاد اسی وقت کے لئے تو ہوتی ہے۔اسی لئے داناؤں نے اولاد کو عصائے پیری بھی کہا ہے تمہارے ہوتے ہوئے ہمیں کوئی فکر نہیں۔ہاں یہ ٹھیک ہے کہ تم نے ابھی دنیا کا کچھ دیکھا نہیں اور تمہیں کچھ تجربہ بھی نہیں۔بیٹا!میں تمہاری ماں ہوں اور دنیا کا مجھے کچھ تجربہ بھی ہے۔خدا نے چاہا تو تمہیں کبھی کوئی غلط مشورہ نہ دوں گی''۔

''تو پھر تم کیا چاہتی ہو؟''شریف حسین لا نے پوچھا۔

"تو پھر وہی بات!" ماں نے کہا۔ "تم یہ بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو؟" کیا مرضی ہے تمہاری؟"

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا"۔ شریف حسین نے جواب دیا۔ "لیکن مجھ سے یہاں مجاوروں کی طرح خانقاہ کی نذر نیاز کی روٹیاں بھی نہ کھائی جاسکیں گی۔ خانقاہ کے متولی کو ابھی سے یہ خوف ہو رہا ہے کہ میں اُسے کسی روز ہٹا نہ دوں۔ کیا ذلیل زندگی ہے یہ بھی"۔

اور شریفہ بولی۔

"مجھے تو تعجب ہے کہ تم اپنا وقت کیسے کاٹ رہے ہو۔ نہ کہیں آنا نہ کہیں جانا نہ کوئی ملنے والا' نہ دوست نہ ساتھی"۔

"تو پھر کیا کروں میں؟" شریف نے بہن کی طرف دیکھ کر کہا...... "کہاں سے لاؤں دوست اور ساتھی!"

"اسی لئے تو میں کہتی ہوں کہ چلو دلاور حسین کے پاس چلے چلیں۔ کوئی غیر نہیں آخر تمہارا چچا ہے۔ کیسے ہوسکتا ہے کہ اُسے ہمارا پاس خاطر نہ ہو۔ میں تو دن بھر گھر بیٹھی بیٹھی اُکتا جاتی ہوں اور جب یہ گاؤں والیاں آتی ہیں تو بس مغز چاٹ لیتی ہیں باتیں' باتیں' باتیں' نہ کوئی مطلب' نہ معنی میرے ابا جان خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ خدا اپنے بندوں کو کبھی کڑے امتحان میں ڈال دیا کرتا ہے اور بندے کی شان یہ ہے کہ وہ ہر طرح سے اس امتحان میں پورا اُترنے کی کوشش کرے اور خود تمہارے ابا جان خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اکثر کہا کرتے تھے کہ ہر سختی کے بعد آرام اور ہر آرام کے بعد سختی آتی ہے تمہیں تو معلوم نہیں تمہارے ابا جان مرحوم کی شروع شروع میں مالی حالت بہت خراب تھی پھر خدا نے فراغت دے دی اور میرے سب شوق پورے ہونے لگے۔ پھر خدا نے یہ دن بھی دکھایا اچھا شکر ہے۔ ناچیز انسان شکر کے سوا اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ ہر حال میں شکر ہے۔ ہر حال میں شکر۔ انسان......"

شریف حسین جو یہ تقریر خاموش بیٹھا سن رہا تھا بات کاٹ کر بولا۔

"اماں!" "تو پھر تمہاری یہی صلاح ہے کہ ہم چچا کے پاس چلے جائیں"۔

"وقت کا تقاضا بھی تو یہی ہے بیٹا!" ماں نے جواب دیا۔ "تم جو کچھ سمجھ رہے ہو اور سوچ رہے ہو میں سب سمجھتی ہوں۔ لیکن اس کے سوا کوئی اور راستہ بھی تو نہیں۔ خدا جب دن پھیرے گا تو اپنا گھر بنا لیں گے"۔

"خیر......!" شریف حسین نے پھر بات کاٹ کر کہا۔ "وہ تو دیکھا جائے گا جب وقت آئے گا۔ میرے خیال میں ہمیں پہلے چچا دلاور حسین کو ایک خط لکھ کر اُن کا عندیہ معلوم کرنا چاہئے کہ ہمارا ان کے پاس جانا انہیں پسند بھی ہے یا نہیں۔ پھر یہ بھی تو ٹھیک معلوم نہیں کہ وہ آج کل ہیں کہاں؟"

"اماں!" شریفہ بولی۔ "شریف بھائی ٹھیک کہتا ہے۔ پہلے خط ڈال دو...... دیکھیں کیا جواب دیتے ہیں"۔

"تو پھر لکھ دو بیٹا شریف!" ماں نے کہا۔

"نہیں!" شریف نے کہا۔ "تم لکھو اماں!"

"ہاں اماں تمہیں ہی لکھنا چاہئے"۔ شریفہ نے کہا۔

تو اس صلاح و مشورہ کے بعد مولوی دلدار حسین مرحوم کی بیوہ نے اپنے دیور دلاور حسین کو خط لکھا۔

لیکن ابھی ڈاک نکلنے میں پورے سات روز تھے۔

آخر خدا خدا کر کے ڈاکیہ پھر گاؤں میں آیا۔شریف حسین نے سو روپے جو اس کی ماں شیخ کریم بخش کی بیوی سے قرض لائی تھی منی آرڈر کر دیئے اور ایک خط لکھ کر ان کی نوازشات کا بہت شریفانہ طور پر شکریہ ادا کیا اور دلاور حسین کے متعلق جو انہوں نے فیصلہ کیا تھا اس سے بھی اُسے آگاہ کر دیا۔

ڈاکیہ چلا گیا اور اب یہ لوگ خط کے جواب کا انتظار کرنے لگے۔

جواب

کون ہو محرم حیاتِ الم
غیر تو غیر دوست بھی برہم

مولوی دلدار حسین مرحوم کی بیوہ زینب کو اپنے دیور دلاور حسین کو خط لکھے بہت روز ہو چکے تھے۔ ڈاکیہ جو صرف ہفتہ میں ایک بار آتا تھا تین بار ہو کر چلا گیا تھا۔ لیکن خط کا جواب ابھی تک نہیں آیا تھا۔ گو گاؤں والے ویسے ہی عقیدت مند تھے اور دوسرے تیسرے کسی نہ کسی جانب سے کھانے پینے وغیرہ کا سامان آ جاتا۔ لیکن زینب سمجھتی تھی کہ یہ ناؤیوں پار نہ لگے گی۔ جوان بیٹا اور وہ بے کار۔ جوان بیٹی اور اس کے بیاہ کا فکر۔ نہ کوئی مستقل آمدنی نہ اثاثہ لے دے کے ایک یہی دلاور حسین تھا جس کے خط پر اُس کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔ زینب اس سے بے خبر نہیں تھی کہ دلاور حسین کی اپنے مرحوم بھائی سے کبھی بن نہ آئی۔ اور اس کا مرحوم شوہر کبھی بھولے سے بھی اس کا نام نہ لیتا تھا۔ برسوں گزر جاتے اور دلاور حسین اپنے بڑے بھائی کو گو دونوں کی عمر میں صرف سال بھر کا ہی فرق تھا' خط نہ لکھتا۔ مدت تک تو مولوی دلدار حسین کو یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ دلاور حسین ہے کہاں اور کیا کرتا ہے۔ لیکن جب مرحوم کو قومی کاموں کے سلسلے میں شہر بہ شہر پھرنا پڑا اور دوسرے صوبوں میں جانے کا موقع ملا تو اس وقت اسے اپنے بھائی کے حالات معلوم ہوئے۔ جس شہر میں دلاور حسین رہتا تھا مولوی دلدار حسین مرحوم کو وہاں جانے کا کئی بار موقع ملا لیکن دلاور حسین بھولے سے بھی اپنے بھائی سے ملنے نہ آئے اور مرحوم کی غیرت کو بھی گوارا نہ ہوا کہ وہ خود اس کے پاس چل کر جاتے۔ اتنے شدید اختلافات کے باوجود زینب کو یہ اُمید تھی کہ دلاور حسین ہزار کورا سہی لیکن جب اپنے مرحوم بھائی کے اہل وعیال کی کسمپرسی کی خبر سنے گا تو سب اختلافات بھول جائے گا۔ اور وہ اور اس کی اولاد اس کے زیرِ سایہ آرام سے زندگی بسر کر سکیں گے۔ ماں دن بھر انہی خیالات میں کھوئی رہتی اور شریف حسین اس فکر میں رہتا کہ وہ کسی طرح کچھ کمانے کے قابل ہو جائے۔ لیکن گاؤں میں رہتے ہوئے تو وہ جو کچھ بھی سوچتا اور ارادے باندھتا وہ شیخ چلی کے ارادے ہی ہوتے۔ اس نے دو ایک بار شیخ کریم بخش کو بھی اپنے متعلق کچھ لکھا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ملک کے حالات کچھ ایسے ہو رہے تھے کہ شیخ کریم بخش ایسا نیک نفس انسان بھی اس کی کچھ مدد نہ کر سکا۔ شریف حسین کی حالت کا اندازہ کچھ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ کبھی وہ دن بھی تھے کہ وہ تقریباً ہر روز شام کا وقت اپنے دوستوں کے ساتھ کسی ریسٹورانٹ یا سینما میں گزارتا۔ اسے اس سال ایف اے کے امتحان میں شامل ہونا تھا۔ لیکن فسادات کے باعث وہ امتحان میں بھی شامل نہ ہو سکا۔ اور اس کے بعد کنبے پر جو افتاد پڑی اس سے ہمارے ناظرین بخوبی واقف ہیں تو ایک ایسا نوجوان جسے کبھی دنیا کی نعمتیں اور آسائشیں میسر تھیں اب ایک چھوٹے سے گاؤں میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ جہاں نہ کوئی دوست تھا نہ تفریح کا سامان۔ خدا بھلا کرے شیخ کریم بخش کا اس نے شہر سے کچھ کتابیں اپنے ایک آدمی کے ہاتھ اسے بھجوا دی تھیں۔ یہی کتابیں اب اس کی مونس تنہائی تھیں۔ ہاں گاؤں کی بود و باش سے اس کی طبیعت میں

ایک شاندار تغیر رونما ہو چلا تھا۔شریف حسین جو کبھی نماز کے نام سے بھی بدکتا تھا اب پکا نمازی بن گیا تھا۔اور گاؤں کے چھوٹے بڑے ادب سے اسے پیر جی یا شاہ جی کہتے تھے اور گاؤں والوں کی اگر کوئی بات اسے ناپسند تھی تو صرف یہی تھی۔وقت اسی طرح گزر رہا تھا اور اب ایک دو روز میں ڈاکیہ پھر آنے والا تھا۔اور یہ لوگ پھر بڑی بیتابی سے خط کے جواب کا انتظار کرنے لگے تھے۔آخر ایک روز دوپہر کے وقت ڈاکیہ آیا۔سب سے پہلے شریفہ نے اسے مکان کی چھت پر سے دیکھا۔ڈاکیہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا گاؤں کی طرف آ رہا تھا۔اُس نے پیٹھ پر چمڑے کا ایک تھیلا ڈال رکھا تھا ہاتھ میں ایک بلم تھی اور بلم کے ساتھ گھنگھرو بندھے ہوئے تھے۔شریف حسین دھوپ میں کھاٹ ڈالے کوئی کتاب دیکھ رہا تھا شریفہ بھاگی بھاگی آئی اور بولی۔

''شریف بھائی!ڈاکیہ آ گیا۔

''کوئی خط آیا؟''شریف حسین نے کتاب پر سے نگاہ ہٹا کر بہن کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا

''یہ تو تم جا کر دیکھو!شاید آیا ہی ہو''۔شریفہ نے جواب دیا۔

''کیا فائدہ جانے سے''۔شریف حسین نے جواب دیا۔''کوئی خط ہوگا تو وہ خود ہی دے جائے گا''۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟''شریف نے مسکرا کر پوچھا۔

''کیا؟''شریفہ نے پوچھا۔

''تمہیں بھی یہ امید ہے کہ خط کا جواب آئے گا''۔شریف حسین نے پوچھا۔

''کوئی وجہ نہیں کہ جواب نہ آئے''۔شریفہ نے کہا۔''آج صبح امی مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ آج خط کا جواب ضرور آئے گا۔اٹھو اب''۔

شریف حسین بہن کے اصرار سے ڈاک دیکھنے چلا گیا۔اس وقت ڈاک کھل رہی تھی۔دو تین آدمی ایک چٹائی پر بیٹھے تھے۔جب شریف حسین آیا تو ایک آدمی نے اٹھ کر اس کے بیٹھنے کو کھاٹ ڈال دی اور کہا۔

''پیر جی!یہاں بیٹھئے''۔

''ارے میاں!''شریف حسین نے کھاٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔''میں تو ایک گنہگار آدمی ہوں۔مجھے پیر مت کہا کرو''۔

اور وہی آدمی مسکرا کر بولا۔

''آپ سیّد ہیں۔سیّدوں کی اولاد ہیں۔ہمارے پیشوا ہیں۔آپ کو پیر کیسے نہ کہیں''۔

اور ایک اور نے کہا۔

''آپ کا جہاں قدم پڑتا ہے وہیں برکت ہوتی ہے''۔

ڈاک بابو خط گن رہا تھا کیونکہ اسے ڈاکیہ کی بہی پر یہ لکھنا ہوتا تھا کہ اسے ڈاک کے تھیلے سے کیا کیا ملا؟

''کوئی میرا خط بھی ہے''۔شریف حسین لا نے پوچھا۔

''ہاں پیر جی!''ڈاک بابو خطوط میں سے ایک نیلے رنگ کا لفافہ نکال کر بولا۔

''یہ لیجئے''۔

یہ خط اسی کے نام تھا۔لیکن وہ تحریر نہیں پہچان سکتا تھا۔شریف حسین خط لے کر گھر کو لوٹا۔اور لفافہ کھول کر خط نکال کر دیکھنے لگا۔یہ اس کے چچا دلاور حسین کا خط تھا۔جو اُس نے اس کی ماں کو لکھا تھا۔

بھابی صاحبہ!

تسلیم۔کئی روز سے آپ کا خط آیا رکھا تھا۔لیکن کام دھندے کے باعث جواب دینے میں دیر ہوگئی۔

بھائی دلدار حسین کے مرنے کی خبر اور جو حالات آپ نے لکھے مجھے یاد پڑتا ہے میں نے کسی اخبار میں آپ کا خط آنے سے بہت روز پیشتر دیکھے تھے۔میرا خیال ہے کہ اگر آپ کو ضرورت مجبور نہ کرتی تو شاید آپ کو مجھے خط لکھنا بھی گوارا نہ ہوتا۔تعجب ہے کہ دلدار حسین مرحوم تو تمام عمر مجھ سے الگ الگ رہا لیکن آپ نے مجھے کیسے قابل اعتماد سمجھ لیا۔بہر کیف! اس حسن ظن کا شکریہ

لیکن میں حیران ہوں کہ آپ کا بیٹا شریف حسین کیوں ابھی تک بے کار بیٹھا وقت ضائع کر رہا ہے شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ بیٹا بھی باپ کے نقش قدم پر چلنے کا ارادہ رکھتا ہو۔جس عورت کا بیٹا جوان ہوا سے فکر اور پریشانی کیسی؟ معاف فرمایئے! ہوسکتا ہے کہ میرے الفاظ میں آپ کو تلخی کی بو آئے لیکن محبت کا تقاضا یہی ہے کہ میں جو کچھ کہوں لاگ لپیٹ کے بغیر کہوں۔آپ اپنے بچوں سمیت میرے پاس آنا چاہتی ہیں۔مجھے تو کوئی اعتراض نہیں لیکن اتنا خوف ہے کہ میں آپ کے بیٹے شریف حسین کی کچھ زیادہ مدد نہ کرسکوں گا۔ایک ایسے شخص کے بیٹے کو کون منہ لگائے گا جس کا باپ عمر بھر قوم سے غداری کرتا رہا۔ہاں! آپ نے یہ بالکل درست فرمایا کہ میں بدقسمتی سے آپ کے بچوں کا چچا ہوں۔اس لئے آپ کا اور آپ کے بچوں کا مجھ پر بھی کچھ حق ہے۔حق ہے اور ضرور ہے اور صرف اسی چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ کو یہاں آنے کو لکھ رہا ہوں۔آپ جب چاہیں بچوں کو ساتھ لے کر آجائیں۔مجھ سے جو خدمت ہوسکے گی کروں گا۔

آپ کا خیر اندیش

دلاور حسین

شریف حسین چچا کا یہ خط پڑھتے ہوئے گھر کی طرف آرہا تھا لیکن ہاتھ کانپ رہا تھا۔غصے سے یا ندامت سے؟ یہ خدا کو معلوم ہوگا۔جب وہ گھر آیا تو اس کی ماں اور بہن دونوں نے پوچھا۔

''خط کا جواب آگیا؟''

شریف حسین نے خط ماں کو دے دیا۔زینب خط پڑھنے لگی۔شریفہ بھی اُچک اُچک کر دیکھنے لگی۔شریف حسین کھاٹ پر دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گیا۔کبھی بیٹھے بیٹھے وہ منہ سے سیٹی بجانے لگتا۔اس کی ماں خط کچھ اس انہماک سے پڑھ رہی تھی گویا وہ اُسے حفظ کرنا چاہتی ہے۔آخر اس نے خط بند کر کے لفافے میں ڈالا اور بولی۔

''شکر ہے۔خط کا جواب تو آگیا''۔

''پڑھ لیا؟'' شریف حسین نے پوچھا۔

''ایک ایک لفظ چار چار بار''۔ ماں نے جواب دیا۔

''ہو گئی تسلی؟'' شریف حسین نے پوچھا۔

''تم ابھی نا تجربہ کار ہو بیٹا!'' ماں نے ذرا مسکرا کر کہا۔ ''یہ باتیں تم نہیں سمجھ سکتے''۔

شریف حسین نے ماں کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔ صرف شریفہ نے اتنا کہا۔

''یہ بھی شکوہ شکایت کا کوئی وقت تھا بھلا''۔

''تم دونوں ابھی نا تجربہ کار ہو''۔ ماں نے جواب دیا۔ ''جس کے دل میں درد ہوتا ہے وہ لگی لپٹی کبھی نہیں رکھتا۔ شکوہ کر لیا دل صاف ہو گیا''۔

شریف نے اب اور بھی تعجب سے ماں کی طرف دیکھا۔ وہ ایک آہ بھر کر بولی۔ ''تمہارے ابا جان خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ کچھ ضدی سے آدمی تھے وہ دلاور سے عمر میں بڑے تھے اور میرے ابا جان خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ از خورداں خطا واز بزرگاں عطا۔ چھوٹے ہمیشہ خطا کرتے ہیں اور بڑے معاف کر دیتے ہیں۔ لیکن مرحوم ہمیشہ اپنی بات پر اڑے رہے اور میں کبھی توجہ بھی دلاتی تو مجھے بھی ڈانٹ دیا کرتے ورنہ جہاں تک مجھے معلوم ہے دلاور حسین برا آدمی نہیں اور اگر ایسا ہو بھی تو ہمیں کسی کے خانگی معاملات سے کیا واسطہ۔ وہ دوسروں کیلئے برا ہو سکتا ہے۔ لیکن اپنی اولاد کے لئے نہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ایک بھائی کی اولاد بھی دوسرے بھائی کی اولاد سمجھی جاتی ہے۔ ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ دلاور حسین کو جو شکایت اپنے مرحوم بھائی سے تھی اس کا گلہ اگر ہم سے نہ ہو تو اور کس سے ہو''۔

شریف حسین اسی طرح سر جھکائے بیٹھا یہ کتھا سن رہا تھا۔ ماں نے پوچھا۔

''تم کیا سوچ رہے ہو؟''

''میں یہ سوچ رہا ہوں کہ نہ تم خط لکھتیں نہ ہم یہ باتیں سنتے''۔ شریف نے جواب دیا۔

''شریف!'' ماں نے ذرا غصے سے کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے میں ابھی ابھی جو کچھ کہہ رہی تھی تم نے سنا نہیں''

''سب سن رہا تھا''۔ شریف نے جواب دیا۔

''خاک سن رہے تھے تم''۔ ماں ذرا غصے سے بولی۔ ''جانے تمہیں ہو کیا گیا ہے''۔

''کیا کیا میں نے؟'' شریف نے پوچھا۔

''یہ تم نے اپنی ماں کی مخالفت کرنا کہاں سے سیکھ لیا''۔ ماں نے کہا۔ ''تمہارے ابا جان مرحوم خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے جب تک زندہ رہے کبھی میری کوئی بات نہ ٹالتے۔ میں اگر رات کو دن کہوں تو دن کہتے تھے اور دن کو رات کہوں تو رات! شریف بیٹا! میری دنیا اب تم سے ہے اگر تم ہی کو مجھ سے اختلاف ہونے لگا تو پھر مجھے بھی یہ ماننا پڑے گا کہ واقعی میری دنیا لٹ گئی''۔

یہ کہنے کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ شریف نے مسکرا کر کہا۔

''اماں یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ کب میں نے اختلاف کیا تم سے؟''

اور شریفہ بھی بھائی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بولی۔ ''اماں! تم تو ایسے ہی بگڑ جاتی ہو شریف بھائی نے تو کچھ کہا ہی نہیں''۔

''چپ رہ لڑکی''۔ ماں نے دوپٹہ سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تمہاری خطا نہیں۔ میرے ابا جان خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ یہ بیسویں صدی سب سے برا زمانہ ہے نہ کسی کو خدا کا خوف نہ رسول کا' نہ بڑوں کا لحاظ نہ چھوٹوں سے محبت۔ دوست احباب دشمن سب ایک لاٹھی سے ہانکے جاتے ہیں''۔

''اماں!'' شریفہ نے ہنس کر کہا۔ ''تو کیا کوئی دشمن سے بھی پیار کرے''۔

''ہاں!'' ماں نے جواب دیا۔ ''میرے ابا جان خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ہمیشہ یہی تاکید کیا کرتے تھے کہ داناؤں کا یہ قول کبھی مت بھولنا کہ دوستوں سے محبت کرو اور دشمن سے مہربانی سے پیش آؤ۔ اگر اس اصول پر تم بھی چلے تو ہمیشہ خوش رہو گے''۔

''پھر کیا فیصلہ کیا تم نے؟'' شریفہ نے پوچھا۔

''کیسا فیصلہ؟'' ماں نے پوچھا۔

''چچا کے پاس چلنے کا!'' شریفہ نے کہا۔

''یہ بھی کوئی سوچنے کی بات ہے بھلا''۔ ماں نے جواب دیا۔ ''ایک ماں کو یہ کیسے گوارا ہو سکتا ہے کہ وہ خاموش بیٹھی اپنی جان سے پیارے بچوں کی عمر ضائع ہوتی دیکھے۔ اب سوچنا کیا ہے تمہارے چچا نے لکھا ہے کہ آ جاؤ''۔

''شریف بھائی!'' شریفہ بولی۔ ''کچھ تم بھی تو کہو''۔

''اگر اماں کی یہی صلاح ہے تو مجھے کیسے انکار ہو سکتا ہے''۔ شریف نے بہن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں اتنی بات میں ضرور کہوں گا کہ چچا کو یوں جلی کٹی کہنا اور وہ بھی اس مصیبت کے وقت مناسب نہ تھا''۔

''پھر وہی نادانوں ایسی بات''۔ ماں نے مسکرا کر کہا۔ ''شریف! کوئی گلہ کرتا ہے تو اپنوں ہی سے کرتا ہے''۔

''یہ گلہ تو نہیں''۔ شریف نے جواب دیا۔

''پھر کیا ہے؟'' ماں نے پوچھا۔

''چچا نے تو گالیاں دی ہیں۔ جلے دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں''۔ یہ کہتے ہوئے شریف کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''چلو یونہی سہی''۔ ماں نے محبت سے کہا۔ ''چچا ہی تو ہے کوئی غیر تو نہیں۔ تم کل تانگہ یا جو کچھ ملے اس کا انتظام کر لو۔ پرسوں جمعہ ہے اور مبارک دن ہے''۔

''تو پرسوں کو چلنا ہے''۔ شریفہ نے پوچھا۔

''اس سے پہلے کیسے جا سکتے ہیں''۔ ماں نے جواب دیا۔ ''آج سامان باندھیں گے تو پرسوں تک جانے کے قابل ہو سکیں گے''۔

گاؤں میں دو مہینے سے کچھ اوپر رہنے کے بعد مولوی دلدار حسین مرحوم کی بیوہ اور بچے دلاور حسین کے پاس جانے کی تیاری کرنے لگے۔

دلاور حسین

جہاں کی روش ہے بہت ظالمانہ
ریا ہرنفسوں ہے دغا ہر فسانہ
نہ کر پھر بھی یہ شکوۂ عامیانہ
کہ آنکھیں دکھاتا ہے مجھ کو زمانہ
زمانے کو آنکھیں دکھاتا گزر جا !

(جوش)

دلاور حسین پیر مہتاب شاہ کا دوسرا لڑکا تھا اور اپنے بڑے بھائی دلدار حسین مرحوم سے صرف ایک سال چھوٹا تھا۔ لیکن دونوں کی طبیعت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ دلاور حسین صاف گو اور فراخ حوصلہ تھا اور دلاور حسین کی چالیں بہت گہری ہوتیں۔ اس کے دل کی بات معلوم کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ لیکن وہ دوسروں کے راز بڑی چالاکی سے معلوم کرتا۔ باپ نے جب دونوں بھائیوں کو تعلیم کے لئے شہر بھیجا تو وہاں بھی دلاور حسین نے چند لڑکوں کا ایک گروہ بنا لیا تھا۔ اس گروہ کا صرف یہ کام تھا کہ دوسرے لڑکوں کو موقع بے موقع دق اور پریشان کرے۔ پیر مہتاب شاہ دونوں کو

کھلے ہاتھ سے روپیہ دیتا تھا جوان کی تعلیم اور شہری ضروریات کے لئے ضرورت سے زیادہ ہوتا لیکن دلدار حسین کا روپیہ مہینہ ختم ہو جانے سے پہلے ہی ختم ہو جاتا اور اسے دوسروں سے قرض لینا پڑتا لیکن دلاور حسین بلا ضرورت ایک پیسہ بھی خرچ نہ کرتا۔ اکثر لڑکے اس سے قرض لے لیتے لیکن وہ اپنے بھائی کو کبھی ایک پیسہ بھی قرض نہ دیتا۔

پیر مہتاب شاہ کے بیمار ہو جانے کے باعث دونوں لڑکے گاؤں واپس آ گئے۔ باپ کی بیماری نے طول کھینچا۔ دلدار حسین تو ایک فرمانبردار بیٹے کی طرح باپ کی تیمارداری میں لگا رہتا۔ لیکن دلاور حسین کے لچھن ہی کچھ اور تھے۔ اسے گاؤں کی لڑکیوں کو تاکنے جھانکنے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد دلدار حسین چونکہ بڑا تھا اسلئے اُسکی دستار بندی کی رسم بڑے اہتمام سے ہوئی۔ لیکن دلاور حسین کی ماں کی کوشش سے جو ایک بہت ہوشیار اور چالباز عورت تھی عین دستار بندی کے روز پیر مہتاب شاہ کے کچھ مریدوں اور عقیدت مندوں نے جو دور دور سے آئے تھے دلاور حسین کی دستار بندی کی رسم بھی ادا کر دی جس کا مطلب یہ تھا تا کہ باپ کی گدی کا صرف دلدار حسین ہی وارث نہیں بلکہ دلاور حسین بھی حق دار ہے۔

باپ کے مرنے کے تھوڑے روز بعد ہی دونوں بھائیوں میں کھلم کھلا بگاڑ شروع ہو گیا اور گاؤں میں دو جماعتیں پیدا ہو گئیں۔ ایک دلدار حسین کی مددگار تھی اور دوسری دلاور حسین کی معاون۔ بھائیوں کے جھگڑے میں کئی بار دونوں جماعتوں میں بھی جھگڑا فساد ہوا۔ اور عدالت تک نوبت پہنچی۔ لیکن دلاور حسین کی بدچلنی نے اس کا کام بگاڑا۔ گاؤں والے بہت جلد اس سے ناراض ہو گئے۔ ممکن تھا کہ یہ لوگ دلاور حسین سے کچھ بدسلوکی بھی کرتے لیکن پیر مہتاب شاہ کے عقیدت مند ہونے کے باعث وہ خاموش رہے لیکن ان کی اس خاموشی کا مطلب دلاور حسین غلط سمجھا اور وہ اپنی حرکت سے باز نہ آیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گاؤں والوں نے اس کا ایسا قافیہ تنگ کیا کہ آخر اسے گاؤں بھی چھوڑنا پڑا۔ دونوں بھائیوں میں چونکہ مقدمہ چل رہا تھا اس لئے لوگوں نے مل ملا کر عدالت میں درخواست دے کر ثالث مقرر کروا لئے۔ اور ثالثوں نے دونوں بھائیوں میں پیر مہتاب شاہ کی جائیداد تقسیم کر دی۔ جائیداد کیا تھی ایک مکان اور کچھ زمین۔ زمین تو دلاور حسین کو مل گئی۔ کیونکہ کچھ زمین مہتاب شاہ نے اپنی زندگی میں ہی اس کی ماں کے حق مہر میں لکھ دی تھی اور مکان دلدار حسین کو ملا اور اس نقصان کی تلافی ثالثوں نے اس طرح کی کہ مہتاب شاہ کی خانقاہ کا دلدار حسین کو متولی تسلیم کر لیا یعنی جو چڑھاوا یا نذر نیاز کہیں سے آئے وہ سب بلا شرکت غیرے دلدار حسین کو ملے۔

مہتاب شاہ کے مرنے کے کوئی چھ ماہ بعد دلاور حسین کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ دلدار حسین کی ماں خاوند کی زندگی ہی میں مر چکی تھی۔ ماں کے مرنے کے بعد دلاور حسین نے وہ زمین جو اس کے حصے میں آئی تھی کسی زمیندار کے پاس فروخت کر دی اور گاؤں سے چلا گیا۔ اس کے بعد جیسا کہ ہمارے ناظرین کو معلوم ہے دونوں بھائیوں کی پھر کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ دلاور حسین کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس کا بھائی مسلمانوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے تو وہ طرح طرح سے اس کے خلاف جہاں بھی وہ ہوتا پراپیگنڈا کرتا رہتا اور جب دلدار حسین مرحوم مسلم لیگ سے علیحدہ ہو کر کانگرس کے ساتھ شامل ہو گیا تو دلاور حسین پہلے سے بھی زیادہ اسے بدنام کرنے لگا۔ اور طرح طرح سے پریشان کرتا رہا لیکن یہ ایک علیحدہ داستان ہے اور ہمارے موجودہ موضوع سے اس کا تعلق نہیں۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ اس پر اب پردہ ہی پڑا رہے۔

یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ دلاور حسین نے جب گاؤں کو خیر باد کہا تو اس کی مالی حالت اس وقت بہت خراب تھی۔ لیکن ایک مدت کے بعد جب ہم نے اسے پھر ایک بار دیکھا تو اس کا ٹھاٹھ امیرانہ تھا۔ اور شہر کے شہدوں اور غنڈوں پر بھی اس کی دھونس تھی۔ اس وقت وہ ایک قمار خانے کا

مالک تھا۔لیکن ایک روز قمار خانے میں کوئی شخص قتل ہوگیا اور دلاور حسین بھی قانون کی گرفت میں آ گیا۔اور کچھ عرصہ بہت پریشان رہا۔سزا سے تو وہ بچ گیا لیکن اس کا کاروبار بالکل تباہ ہوگیا اور وہ شہر چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا اور بہت روز تک اس کا کہیں پتہ نہ ملا۔لیکن ایک روز وہ ایک بالکل نئے روپ میں نظر آیا۔اس وقت وہ شکل صورت' رنگ ڈھنگ اور طریق نشست و برخاست سے ایک پیر بنا ہوا تھا اور اپنے ہتھکنڈوں سے دنیا کو خوب لوٹ رہا تھا۔جہاں جاتا پانچ سات مرید ساتھ ہوتے۔ایسے مرید جو چالبازیوں میں شیطان کے بھی کان کاٹیں۔یہ لوگ اپنے پیر کی کرامات کا کچھ اس انداز سے پراپیگنڈا کرتے کہ لوگ خود بخود اس کے جال میں پھنسنے کو چلے آتے۔اتفاق سے ایک اچھے گھرانے کی ایک جوان لڑکی بھی اس کے چنگل میں پھنس گئی۔لیکن کچھ روز بعد ایسے واقعات پیش آئے کہ پیر دلاور حسین کو ایک بار پھر روپوش ہونا پڑا اور اس کے چیلے چانٹے بھی اس سے علیحدہ ہوگئے۔صرف ایک آدمی جس کا نام عزیز تھا اور جسے وہ گاؤں سے ساتھ لایا تھا اس کے ساتھ رہا۔عزیز میں کوئی اور خوبی ہو یا نہ ہو لیکن ایک بات ضرور تھی کہ وہ ضرورت سے زیادہ کبھی بات نہ کرتا۔دلاور حسین جو کچھ کرتا تھا عزیز دیکھتا تو تھا لیکن دیکھنے والے کو یہی معلوم ہوتا جیسے اس نے کچھ نہیں دیکھا۔

اس واقعے کے بعد دلاور حسین کی نقل وحرکت پر پھر ایک بار پردہ پڑا رہا۔لیکن پانچ سات سال بعد جب ہم نے اسے پھر دیکھا تو وہ ایک بڑے بارونق شہر میں ایک بہت مشہور ہوٹل کا مالک تھا اور شہر میں اس کی ساکھ بھی اچھی تھی۔یہ تو معلوم نہیں کہ وہ لڑکی کیا ہوئی لیکن عزیز اس وقت بھی اس کے ساتھ تھا۔لیکن اب وہ کچھ بہرہ ہوگیا تھا جان بوجھ کر یا واقعی' یہ عزیز ہی کو معلوم ہوگا۔پرانے خادم کے بہرہ ہوجانے کا دلاور حسین کو نہ کوئی فکر تھی نہ پروا بلکہ وہ خوش ہی تھا۔

دلاور حسین نے جہاں تک ہمیں علم ہے شادی نہیں کی۔اس کا دین ایمان جو کچھ تھا روپیہ تھا۔وہ روپیہ حاصل کرنے کے لئے ذلیل سے ذلیل کام کرنے سے بھی گریز نہ کرتا...... پرلے درجے کا بدقماش' تنگ دل' حسد گھٹی میں' تنگ مزاج' پکا عیار! اور کاروباری آدمی ہوتے ہوئے بھی بہت روکھا پھیکا۔کسی پر رحم کرنا یا کسی کی حاجت روائی کرنا اس کے مذہب میں حرام تھا۔گو وہ اب بڑھاپے کی منزل میں قدم رکھ چکا تھا لیکن دولت سمیٹنے کی دھن ویسی ہی تھی۔اور ایک سخت گیر آدمی ہونے کے باوجود مطلب نکالنے کے لئے پرلے درجے کا خوشامدی بھی بن جاتا۔کہا جاتا تھا کہ وہ سود پر روپیہ بھی قرض دیتا تھا۔لیکن صرف ایسے نوجوانوں کو جو صاحب حیثیت ہوں۔یہ ہے اس شخص کی تصویر جس کی مدد کے بھروسے پر اس کے بھائی دلدار حسین مرحوم کی بیوہ اور اس کے بچوں نے ایک طویل سفر اختیار کیا تھا۔

دلاور حسین کو اس کی بھاوج نے اپنے آنے کی اطلاع دے دی تھی۔چنانچہ جس روز اسے اپنے دونوں بچوں کے ساتھ وہاں پہنچنا تھا اس سے ایک روز پہلے دلاور حسین نے اپنے ملازم عزیز کو بلا کر کہا......

"عزیز......!"

"جناب!"

"کل ایک عورت اور اُس کے دو بچے یہاں آئیں گے"۔دلاور حسین نے کہا۔"سن لیا"۔

"نہیں!" عزیز نے کہا۔

دلاور حسین نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔عزیز بولا

''آپ کو معلوم ہے کہ میں بہرہ ہو گیا ہوں۔اس لئے آپ کو جو کچھ کہنا ہو ذرا بلند آواز سے کہئے''۔

''میں کہہ رہا ہوں''۔دلاور حسین نے کہا۔''کل ایک عورت اور اس کے دو بچے یہاں آئیں گے۔سن لیا''۔

''ہاں سن لیا!''عزیز نے کہا۔''پوچھیں تو کہہ دوں گا کہ آپ یہاں نہیں ہیں''۔

دلاور حسین نے حقارت سے عزیز کی طرف دیکھا اور کہا۔

''تم نے یہ کیسے جانا کہ میں ملنا نہیں چاہتا''۔

''میں نے کئی بار دیکھا ہے کہ جب کوئی سائل آپ سے ملنا چاہتا ہے تو آپ مجھ سے یہی کہا کرتے ہیں''۔عزیز نے جواب دیا۔

''اور تم نے یہ کیسے جانا کہ مجھ سے ملنے والے کوئی سائل ہی ہیں''۔دلاور حسین نے پوچھا۔

''کیونکہ عورت کے ساتھ دو بچے بھی تو ہیں''۔عزیز نے جواب دیا۔

دلاور حسین نے اسی طرح حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں اُن سے کہہ دینا کہ میں دو دن کے لئے کہیں باہر چلا گیا ہوں۔سن لیا؟''

''ہاں سن لیا''۔عزیز نے کہا۔''اور اگر وہ دو دن کے بعد پھر آ گئے؟''

''تو پھر میں خود سمجھ لوں گا۔تمہیں کچھ واسطہ نہیں''۔دلاور حسین نے کہا۔''ہاں ایک بات اور سنو!ممکن ہے وہ کچھ رشتہ داری جتائیں اور یہاں مکان پر قیام کرنا چاہیں تو انہیں یہاں قدم بھی نہ رکھنے دینا۔سن لیا؟''

''آخری بات نہیں سنی؟''عزیز نے جواب دیا۔

''ابے اُلو کے پٹھے''۔دلاور حسین غصے سے بولا۔''اگر وہ مکان پر ٹھہرنا چاہیں تو ہرگز مت ٹھہرنے دینا۔اب تو سن لیا؟''

''ہاں سن بھی لیا اور سمجھ بھی گیا......''عزیز نے کہا۔

''کیا سمجھ گئے؟''دلاور حسین نے پوچھا۔

''آپ کے کوئی رشتہ دار آنے والے ہیں اور آپ ان سے ملنا نہیں چاہتے''۔عزیز نے کہا۔''یہی بات ہے نا؟''

دلاور حسین نے کچھ جواب نہ دیا۔پھر کچھ سوچ کر بولا۔

''اگر ہو سکے تو یہ بھی معلوم کرنا کہ کہاں ٹھہرے ہیں؟''

''انہی سے پوچھ لوں گا''۔عزیز نے کہا۔

''نہیں!''دلاور حسین نے کہا۔''ان سے مت پوچھو بلکہ اس طرح معلوم کرو کہ انہیں خبر تک نہ ہو''۔

''کوشش کروں گا''۔عزیز نے جواب دیا۔

''جاؤ''۔

عزیز چلا گیا۔ اور دلاور حسین اپنے کمرے میں ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ کبھی تیز قدم اُٹھاتا۔ کبھی رُک رُک کر چلتا پھر وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی پیشانی پر شکن پڑے ہوئے تھے اور وہ کچھ اس طرح کوئی چیز دیکھ رہا تھا جیسے کوئی دور کی چیز دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ کبھی وہ بیٹھے بیٹھے مسکرا دیتا۔ کبھی آنکھیں بند کر لیتا۔ پھر کھول کر دیکھنے لگتا۔ کبھی بیٹھے بیٹھے بڑبڑانے لگتا۔

''آنے کا تو یوں لکھ دیا گویا میں ان کی پیشوائی کو سٹیشن پر موجود رہوں گا۔...... تیس چالیس سال...... ہاں تیس چالیس سال کتنی جلد گزر گئے...... ایک دنیا بدل گئی...... مجبور نہ ہوتے تو کب خط لکھتے تھے مجھے...... مجبوری! مجبوری! یہ مجبوری سب کچھ کرواتی ہے۔ انسان سے سب کچھ منواتی بھی ہے...... بھائی کی اولاد...... حق...... کیسا حق؟...... کس کا حق......؟ گویا میں نے جو کچھ پیدا کیا ہے' انہی کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور میرے بعد یہی میرے وارث بنیں گے وارث...... (ایک قہقہہ)...... دلاور حسین کے وارث؟ کون؟ دلدار حسین کی اولاد! ہرگز نہیں' قیامت تک نہیں!...... میری ایک کوڑی کے وارث نہیں ہو سکتے!...... میں نے یہ دولت اس لئے پیدا نہیں کی کہ میرے مرنے کے بعد دلدار حسین کی اولاد قابض ہو کر عیش کرے! بھاوج! زینب! بھاوج! دلدار حسین کی بیوہ اسے امید ہوگی کہ اس سے میں نکاح کر لوں گا...... نکاح! (قہقہہ) پھر ایک اور (قہقہہ) کیسا عجیب خیال ہے...... دلاور حسین زینب سے شادی کرے گا (قہقہہ) شاید اسی لئے دلاور حسین نے ابھی تک بیاہ نہیں کیا (قہقہہ) لڑکی؟...... کیا نام تھا لڑکی کا؟ شریفہ! ہاں شریفہ!...... شریف اور شریفہ! اب تم دونوں اپنے چچا کی نوازشات کے لئے تیار ہو جاؤ۔ دلاور حسین کی نوازشات!...... (قہقہہ) پھر ایک لمبا سانس لے کر، رنگ ہیں زمانے کے......! پرانے حساب چکانے کا وقت آ گیا!...... لیکن دلاور حسین تو ایک کے دس لیا کرتا ہے۔ دنیا تو وہ جانتا ہی نہیں' شریف ماشاء اللہ جوان لڑکا ہے۔ ماں کو کتنا ناز ہوگا اپنے جوان شریف پر......! شریف! معلوم ہے کچھ تمہیں کہ تمہاری قسمت میں کیا لکھا ہے؟...... چچا کی شفقت اور ہمدردی اور مدد کا مستحق! شریف...... دلدار حسین کا بیٹا شریف! آنے دو......''

یہ آخری دو الفاظ اس نے اس زور سے کہے کہ عزیز نے جو کمرے کے باہر ایک سٹول پر بیٹھا ہوا تھا دروازہ کھول کر پوچھا۔

''کسے آنے دوں؟''

''دور ہو جاؤ چلے جاؤ''۔ دلاور حسین نے غصے سے کہا۔

''کون دور ہو جائے۔ کون چلا جائے؟ عزیز نے تعجب سے پوچھا۔

''تم!'' دلاور حسین نے غصے سے کہا۔

''؟'' عزیز نے کہا۔ ''دور ہو جاؤں چلا جاؤں میں؟''

''میں کہتا ہوں چلے جاؤ باہر!'' دلاور حسین نے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

عزیز باہر چلا گیا اور دلاور حسین کرسی سے اُٹھ کر پھر ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

کچھ دیر بعد اس نے پھر آواز دی۔

''عزیز!''

عزیز نے دروازہ کھول کر ذرا سا اندر جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے بلایا تھا آپ نے؟''

''اندر آؤ''۔

عزیز اندر چلا گیا۔

''عزیز! دلدار حسین مر گیا ہے''۔ دلاور حسین نے کہا۔

عزیز نے بڑے تعجب سے دلاور حسین کی طرف دیکھا۔ دلاور حسین بولا۔

''اس کے مکان کو آگ لگ گئی تھی اور وہ باہر نکلتے نکلتے جل گیا''۔

عزیز کا سر خود بخود جھک گیا۔

''بڑا لیڈر بنا پھرتا تھا''۔ دلاور حسین مسکرا کر بولا

لیکن عزیز نے بات کاٹ کر پوچھا۔

''آپ پرسہ دینے جائیں گے''۔

''میں پرسہ دینے جاؤں گا......؟'' دلاور حسین نے ذرا حقارت سے کہا...... ''کیا بک رہے ہو تم؟''

''انتقال ہوئے کے روز ہوئے؟'' عزیز نے پوچھا۔

''ہو گئے دو تین مہینے''۔

''آپ کو کب خبر ملی؟''

''میں نے ایک اخبار میں پڑھا تھا''۔دلاور حسین نے جواب دیا۔''خس کم جہاں پاک''

''خدا بخشے بڑی خوبیوں کا انسان تھا''۔عزیز نے کہا۔

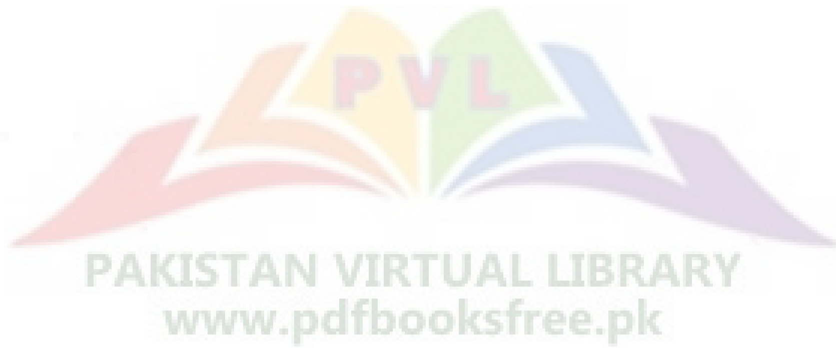
''خوبیوں کا انسان نہ ہوتا تو چھ مہینے کا جیل تمہیں بھی کیسے ہوتا''۔دلاور حسین نے مسکرا کر کہا

''جو ہو چکا سو ہو چکا!اب اس کا ذکر کیا''۔عزیز نے غم انگیز لہجے میں کہا۔

''معاف کر دیا کیا؟''دلاور حسین نے مسکرا کر پوچھا۔

''ہاں معاف کر دیا۔خدا بھی انہیں معاف کرے''۔عزیز نے جواب دیا۔

دلاور حسین تعجب سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔دونوں کچھ دیر خاموش رہے۔روشندان کے پاس کبوتروں کا ایک جوڑا آپس میں دانہ بھر رہا تھا۔شفق کی سرخی در و دیوار پر شہابی رنگ سے ہولی کھیل رہی تھی۔



ملاقات

طنز، خاموشی احباب سے رستا ہے ابھی
خون اُمید کا ہر خواب سے رستا ہے ابھی'
اک اندھیرا شب مہتاب سے رستا ہے ابھی
میں نے ہر صبح کی کرنوں سے شکایت کی ہے
کتنے سنسان سویرے ہیں تجھے کیا معلوم !

اور جتنے سنسان سویرے گزشتہ چند دنوں میں مولوی دلدار حسین مرحوم کی بیوہ کے مشاہدے میں آئے وہ تو ابھی ابتدا ہی تھی۔ وہ تو اس خیال سے گاؤں سے چلی تھی کہ اس کے مرحوم شوہر کا بھائی اس کا اور اس کے بچوں کا سرپرست اور محسن ثابت ہوگا۔ لیکن کاش اسے یہ بھی معلوم ہوتا کہ اس کا حسنِ ظن اسے بھیڑیئے کی بھٹ کی طرف لے جارہا ہے۔ بھیڑیئے کے بھٹ سے ہمارے ناظرین کو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ واقعات خود ہی یہ بتادیں گے کہ دلاور حسین' صرف دلدار حسین کے کنبے کے لئے ہی نہیں بلکہ ان سب لوگوں کے لئے جنہیں اس سے کچھ واسطہ پڑتا تھا کسی نہ کسی صورت میں بھیڑیئے کا بھٹ ہی ثابت ہوتا۔ بغلی گھونسا یا مار آستیں !

دلاور حسین کو جب سے یہ معلوم ہوا تھا کہ اس کے مرحوم بھائی کے اہل وعیال اس کے دست نگر ہیں وہ اسی وقت سے ان بیکسوں کی تخریب کے منصوبے باندھ رہا تھا۔

زینب کو امید تھی کہ اس کا دیور دلاور حسین ان کی پیشوائی کے لئے سٹیشن پر موجود ہوگا چنانچہ جب گاڑی سٹیشن پر آئی تو وہ سر نکال کر باہر دیکھنے لگی۔ شریف اور شریفہ نے چونکہ ابھی تک اپنے چچا کو دیکھا نہیں تھا اس لئے جو شخص بھی ان کے پاس سے گزرتا' وہ اسے کچھ خوف اور کچھ دلچسپی سے دیکھنے لگتے۔ کچھ مسافر اُتر رہے تھے' کچھ سوار ہورہے تھے۔ اور زینب ابھی تک اپنی جگہ پر بیٹھی ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

''اماں!'' شریف حسین بولا۔ ''اب تم بھی اُترو''۔

''تعجب ہے تمہارا چچا کہیں نظر نہیں آتا''۔ ماں نے کہا۔

''تم اُترو تو سہی''۔ شریف نے کہا۔ ''چچا کہیں ہوگا تو آجائے گا''۔

شریف حسین نے قلی کو آواز دے کر سامان وغیرہ اتروایا اور تینوں سٹیشن سے باہر آگئے۔ ماں بولی۔

''شریف! یہ جو اتنے موٹر کھڑے ہیں۔ دیکھو تو ان میں سے کوئی تمہارے چچا کا بھی ہو۔ موٹر تو اس نے ضرور بھیجا ہوگا۔ شوفر کو بیٹھے بیٹھے

کچھ نیند آ گئی ہو تو میں کچھ کہہ نہیں سکتی"۔

شریف نے ماں کے کہنے سے دو تین شوفروں سے پوچھا۔لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔اس کی ماں اور بہن اسباب کے پاس ایک دیوار سے لگی کھڑی تھیں۔شریف واپس آ گیا۔

"مل گئی موٹر؟"

"نہیں"۔شریف نے جواب دیا۔

"تعجب ہے تمہارے چچا نے موٹر بھی نہیں بھیجا۔کہیں تم نے غلط تاریخ تو نہیں لکھ دی تھی"۔ماں نے پوچھا۔

"میں نے تو نہیں لکھا تھا"۔شریف نے جواب دیا۔"جو کچھ لکھا تھا تم نے ہی لکھا تھا"۔

"تو تھوڑی دیر اور انتظار کر لیں"۔ماں نے کہا۔

"کس کا؟"شریف نے پوچھا۔

"تمہارے چچا کا"۔ماں نے جواب دیا۔"شاید اس کی گھڑی کا وقت ٹھیک نہ ہو اور گھر سے چلتے چلتے دیر ہو گئی ہو"۔

"شریف بھائی!"شریفہ بولی۔"کیا فائدہ یہاں کھڑے رہنے سے۔تانگہ منگواؤ"۔

"کہاں چلنا ہے؟"شریف نے ماں سے پوچھا۔

"اپنے گھر"۔ماں نے جواب دیا۔لیکن جب شریف نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا کر بولی۔

"بیٹا!تمہارے چچا کا گھر بھی تو اپنا ہی گھر ہے۔توبہ ہے!ہمارے یوں اچانک پہنچ جانے سے کیسی پریشانی ہو گی غریب کو"۔

شریف نے آواز دے کر تانگہ منگوایا۔جب سامان رکھا گیا اور یہ تینوں سوار ہو گئے تو تانگے والے نے پوچھا کہ وہ کہاں چلے۔

"کوئی ہوٹل ہے یہاں؟"شریف حسین نے پوچھا۔

"کئی ہوٹل ہیں!"تانگے والے نے چند ایک کے نام بتائے۔

"کوئی ایسی جگہ بتاؤ جہاں شریف لوگ قیام کرتے ہوں اور خرچ بھی کم ہو"۔شریف حسین نے کہا۔

"تو یوں کیجئے"۔تانگے والا بولا۔"سرائے کے متصل کچھ بھٹیارے رہتے ہیں۔ان کے پاس کچھ بالا خانے بھی ہیں۔وہاں لے چلتا ہوں آپ کو"۔

"چلو!"شریف حسین نے کہا۔

"نہیں!نہیں!"شریف حسین کی ماں جو اس وقت تک خاموش بیٹھی تھی بولی۔"سیدھے اپنے چچا کے یہاں چلو"۔

"اماں!"شریف نے کہا۔"پہلے کہیں ٹھکانے سے سامان لگا لینے دو۔پھر جیسے کہو گی اسی طرح کریں گے۔کبھی کسی کی بات مان بھی لیا کرو"۔

اور شریفہ نے کہا۔

''شریف بھائی! چچا کے ہاں چلنے میں کیا ہرج ہے؟''

شریف حسین نے تانگے والے کو پتہ بتایا۔ اور وہ تانگہ ہانکنے لگا۔ اور لمبا چکر کاٹ کر ایک چوک میں انہیں لے آیا اور ایک عمارت کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

''لیجئے! وہ رہا گرین ہوٹل''۔

یہ ایک اچھی خوبصورت عمارت تھی۔ بازار کے چوک میں فوارہ چل رہا تھا بازار میں لوگوں کی خاصی بھیڑ بھاڑ تھی۔ موٹر۔ ٹریم۔ بسیں۔ تانگے۔ چھکڑے۔ سبھی ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر آ جا رہے تھے۔

''آپ گرین ہوٹل میں ٹھہریں گے''۔ تانگے والے نے پوچھا۔ ''لیکن یہ تو بہت مہنگا ہوٹل ہے''۔

''تم یہاں ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں''۔ شریف حسین نے تانگے سے اُترتے ہوئے کہا۔

شریف حسین جب تانگے سے اُترنے لگا تو ماں نے ہولے سے کہا۔

''دیکھو بیٹا! چچا کو بڑے ادب سے سلام کرنا''۔

شریف نے کچھ جواب نہ دیا اور ہوٹل کی طرف چلا گیا۔ اور وہاں پہنچ کر ایک نوکر کو بلا کر پوچھا۔

''سید دلاور حسین یہیں رہتے ہیں کیا؟''

''کیا کام ہے آپ کو؟'' نوکر نے پوچھا۔

''مجھے اُن سے ملنا ہے''۔ شریف حسین نے جواب دیا۔

''یہ پیچھے کی طرف چلے جایئے''۔ نوکر نے ہاتھ سے ایک گلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ ادھر رہتے ہیں''۔

''گھر پر ہی ہوں گے؟'' شریف حسین نے پوچھا۔

''ہاں! ہاں!'' نوکر نے جواب دیا۔ ''ابھی گئے ہیں۔ وہاں اُن کا ملازم عزیز ہوگا اس سے پوچھ لیجئے گا''۔

''تم ان کے ملازم نہیں!'' شریف حسین نے پوچھا۔

''انہی کا ملازم ہوں''۔ نوکر نے جواب دیا۔ ''لیکن میں ہوٹل میں کام کرتا ہوں''۔

شریف حسین نے جیب سے ایک دونی نکال کر اُسے دی۔ دونی لیتے ہی نوکر کا رویہ بدل گیا۔ اور وہ شریف حسین کو ساتھ لے کر ہوٹل کے پچھواڑے آیا۔ ایک مریل سا آدمی جس کے سر کے بال تقریباً سفید ہو رہے تھے ایک دریچہ میں سے باہر سر نکالے جھانک رہا تھا۔ نوکر نے آواز دی۔

''ارے میاں عزیز! ذرا نیچے تو آؤ''۔

''کیا ہے؟'' عزیز نے اوپر سے ہی پوچھا۔

''یہ صاحبزادے شاہ جی سے ملنے آئے ہیں''۔

عزیز نیچے آ گیا اور شریف سے پوچھا۔

''آپ کو شاہ جی سے ملنا ہے؟''

''ہاں!'' شریف نے جواب دیا۔

''آپ کہاں سے آئے ہیں؟'' عزیز نے دو ایک بار آنکھیں جھپکا کر پوچھا۔

شریف حسین نے گاؤں کا نام بتا دیا۔ عزیز نے شریف کی طرف سر سے پاؤں تک دیکھا۔

''آپ اکیلے ہی ہیں کیا؟'' عزیز نے پوچھا۔

''نہیں!'' شریف حسین نے جواب دیا۔ ''میری والدہ اور بہن بھی ہے۔ شاہ صاحب ہیں؟''

''نہیں!'' عزیز سر ہلا کر بولا۔ ''وہ تو ابھی ابھی چلے گئے ہیں''۔

'' شہر سے باہر کیا؟''

''ہاں شہر سے باہر''۔ عزیز نے جواب دیا۔

''کب آئیں گے؟'' شریف نے پوچھا۔

''یہی دو ایک روز تک''۔ عزیز نے آنکھیں جھپکا کر کہا۔

جب شریف واپس جانے لگا تو عزیز نے پوچھا۔

''آپ کہاں ٹھہریں گے؟''

''سرائے میں اور کہاں؟'' شریف حسین نے اندرونی الجھن چھپاتے ہوئے جواب دیا۔ اور واپس آ کر تانگے والے سے سرائے کو چلنے کو کہا۔

جب تانگہ چلا تو ماں نے پوچھا

''چچا ملے نہیں کیا؟''

''وہ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں''۔

وہ باہر کہاں؟'' ماں نے پوچھا۔

''میں کیا جانوں''۔ شریف نے کہا۔

''کب گئے؟''

''ابھی! ابھی!''

''ابھی! ابھی؟''

''ہاں ابھی ابھی''

''کس سے پوچھا تھا''۔ماں بولی۔''کسی نے ایسے ہی نہ کہہ دیا ہو۔بڑے آدمیوں کے نوکر ملنے والوں کو یونہی ٹال دیا کرتے ہیں''۔

'' اُن کے نج کے نوکر سے پوچھا تھا''۔شریف نے جواب دیا۔

''تو تم نے کہا ہوتا کہ میں سید دلدار حسین مرحوم کا بیٹا سید شریف حسین ہوں''۔ماں نے کہا

شریف حسین جو ماں کی عادت سے واقف تھا چپکا ہو رہا۔کچھ دیر بعد تانگہ ایک سرائے کے پاس آ کر رک گیا۔کچھ بے رونق سی جگہ تھی۔ سرائے کے باہر بھٹیاروں کی دو چار دوکانیں تھیں۔

''یہی سرائے ہے؟''شریف حسین نے پوچھا۔

''جی ہاں!''تانگے والا نیچے اُترتے ہوئے بولا۔''آیئے ان لوگوں سے کسی خالی مکان کا پوچھ لیجئے''۔

''بھیا تم ہی تکلیف کرو ذرا''۔شریف حسین نے کہا۔تانگے والا بھٹیاروں سے پوچھنے چلا گیا۔ماں بولی۔

''شریف یہ کیا کیا تم نے۔تمہارے چچا سنیں گے تو بہت ناراض ہوں گے۔اسے تو وہ اپنی توہین سمجھیں گے کہ ہم بھٹیاروں کے مکان پر مقیم ہیں۔مجھے پورا یقین ہے نوکر نے تم سے جو کچھ کہا جھوٹ کہا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے''۔شریف حسین نے جواب دیا۔

''شریف بھائی!''شریفہ بولی۔''تو تم چچا سے کیوں نہ ملے''۔

''معلوم ہوتا ہے چچا ہم سے ملنا نہیں چاہتا''۔شریف نے ذرا مسکراتے ہوئے کہا۔

تانگے والے نے آواز دی۔

''میاں!ذرا ادھر آیئو''۔

شریف نے پاس جا کر پوچھا۔''کیا ہے؟''

تانگے والے نے ایک بالا خانے یا بیٹھک کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا۔''وہ مکان خالی ہے۔دیکھنا ہو تو دیکھ لو۔اس کے سوا اور کوئی مکان خالی نہیں''۔

''چلو دیکھتے ہیں''۔شریف نے کہا۔

یہ مکان ایک بھٹیارن کا تھا۔اس نے ساتھ ہو کر مکان دکھایا۔صرف دو کمرے ایک باورچی خانہ اور غسل خانہ تھا۔خاصہ ہوادار مکان تھا۔ باورچی خانے میں پانی کا نل بھی تھا اور مکان میں بجلی بھی تھی۔

''کیا کرایہ ہے؟''شریف حسین نے پوچھا۔

''پندرہ روپے ماہوار''۔بھٹیارن نے جواب دیا۔بجلی اور پانی کا خرچ علیحدہ ہوگا۔پڑوس میں سب شریف آدمی بستے ہیں۔ایسے ویسوں کو تو ہم دیتے بھی نہیں۔ابھی دو روز ہوئے کھالی ہوا ہے۔ایک بڑے جمیندار رہتے تھے۔کرایہ پیشگی ہوگا''۔

شریف حسین نے مکان لے لیا اور ایک مزدور منگوا کر سامان رکھوا لیا لیکن مکان میں نہ کوئی چٹائی تھی نہ چارپائی۔یہ دونوں چیزیں بھی

بھٹیارن سے کرایہ پر مل گئیں۔ اتنا ہی غنیمت تھا کہ بجلی کی روشنی بھی تھی اور پانی کا نل بھی۔ کھانا پکانے کا کچھ مختصر سا سامان یہ لوگ احتیاطاً گھر سے لے آئے تھے۔ ورنہ وہ بھی نیا خریدنا پڑتا۔ پانی کیلئے دو گھڑے بھی بھٹیارن سے نقد قیمت پر مل گئے اور کھانا بھی بھٹیارن کے ہاں کا ہی پکا ہوا منگوا لیا گیا۔

جب ذرا اطمینان ہوا تو پھر تینوں میں صلح مشورہ ہونے لگا۔

شریفہ نے کہا۔

"مجھ سے بھٹیارن کے ہاں کا پکا ہوا کھایا نہ جائے گا۔ ہر چیز باسی معلوم ہوتی تھی"۔

"پھر کیا کیا جائے؟" شریف حسین نے پوچھا۔

"پانچ سات روز کا سامان بازار سے لے آؤ۔ برتن ساتھ ہیں خود پکا لیا کریں گے"۔ شریفہ نے کہا۔

ماں ذرا مسکرا کر بولی۔

"تم دونوں بالکل ناتجربہ کار ہو۔ میرا تو خیال ہے رات کا کھانا ہوٹل سے آئے گا"۔

دونوں نے تعجب سے ماں کی طرف دیکھا وہ کہنے لگی۔

"میں کچھ جھوٹ نہیں کہہ رہی۔ میرے خیال میں کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ یا ہوسکتا ہے کہ شریف ہی ٹھیک بات نہ سمجھ سکا ہو۔ جوان لڑکے ہوتے ہی جلد باز ہیں"۔

"کیا جلد بازی کی میں نے اماں؟" شریف حسین نے پوچھا۔ ہوٹل والے نوکر نے کہا کہ شاہ جی ابھی اُٹھ کر مکان پر گئے ہیں۔ لیکن جب گھر کے ملازم سے پوچھا تو اس نے کہا کہ ابھی ابھی شہر سے کہیں باہر چلے گئے ہیں۔ اب تم خود غور کرو کہ میں نے یہاں آنے میں جلد بازی کی یا ہمارے چچا جان ہی ہم سے ملنا نہیں چاہتے"۔

"بیٹا!" ماں بولی۔ "تم نہیں سمجھتے۔ نوکر یونہی کہہ دیا کرتے ہیں۔ بڑے آدمیوں کے نوکر ذرا خوشامد پسند ہوتے ہیں۔ تمہارے ابا جان مرحوم خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے کہا کرتے تھے کہ اگر کسی بڑے آدمی سے کچھ کام ہو تو اس کے نوکر کو خوش کرنا چاہئے......"

"تو ہاتھ جوڑ دیتا کیا"۔ شریف حسین نے بات کاٹ کر کہا۔

"میں نے کب ہاتھ جوڑنے کو کہا"۔ ماں نے کہا۔ "میں تو کہہ رہی ہوں کہ ذرا ترکیب سے کام لیا ہوتا"۔

"ہوٹل کے نوکر کو دونی دی تھی تو وہ مکان پر لایا تھا۔ شریف حسین نے کہا اور ماں خوش ہو کر بولی"۔

"شاباش بیٹا! بہت اچھا کام کیا تم نے۔ اسی طرح اگر گھر کے نوکر کو بھی ایک دونی تھما دی ہوتی تو اس وقت یہاں بھٹیارن کے مکان پر ہونے کے بجائے ہم تمہارے چچا کے مکان پر عزت اور آرام سے بیٹھے ہوتے"۔

"اماں!" شریفہ نے کہا۔ "اب یہ بحث چھوڑو گی بھی۔ پہلے رات کے کھانے کا کچھ کرو"۔

"میں تو کہہ رہی ہوں کہ رات کا کھانا تمہارے چچا کے ہاں سے آئے گا"۔ ماں نے جواب دیا

"اور جو نہ آیا؟" شریفہ نے پوچھا۔

''آئے گا کیسے نہیں''۔ماں نے کہا۔''میرے خیال میں تو تمہارے بھائی کے واپس آ جانے سے نوکر ڈر رہا ہوگا کہ کہیں اسے نوکری سے ہی جواب نہ مل جائے''۔

''وہ کیوں؟''شریفہ نے ذرا مسکرا کر پوچھا۔

''تمہارے چچا نے جانے سے پیشتر نوکروں سے ضرور تاکید کر دی ہوگی کہ جب ہم آئیں تو ہمیں عزت اور آرام سے مکان کے بہترین حصہ میں اُتارا جائے۔میرے خیال میں تو نوکر کم بخت یا تو اپنے آقا کا حکم بھول گیا ہے یا اُس نے شریف حسین کو پہچانا ہی نہیں''۔

''ماں نے جواب دیا''۔

شریفہ خاموش ہو رہی اور ماں نے کہا۔

''ہاں احتیاطاً بھٹیارن کو بلا کر کہہ دیتے ہیں کہ کھانا ذرا اچھا پکائے''۔

''لیکن دو چار روز کا سامان کیوں نہ منگوا لیا جائے''۔شریفہ نے پھر اپنی بات پر زور دیا۔پھر بھائی سے۔

''شریف بھائی!کیا خیال ہے تمہارا؟''

شریف نے کچھ جواب نہ دیا ماں بولی۔

''شریف تم کیا سوچ رہے ہو کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ''۔

لیکن پیشتر اس کے کہ شریف کچھ کہے بھٹیارن آ گئی اور سلام کر کے کہا۔

''بی بی جی!رات کے کھانے پر کوئی خاص چیز پکے گی تو ابھی سے پھرما دیں۔

''بھٹیارن!''شریفہ بولی''آج تو تمہارا کھانا بہت خراب تھا''۔

بھٹیارن نے ذرا تعجب سے پوچھا۔''کیا نکس (نقص) تھا میرے کھانے میں۔میرے یہاں کا کھانا تو دور دور جاتا ہے اور آپ نے آتے ہی نکس بتا دیا۔جیسے پائے میری دکان پر پکتے ہیں سارے شہر میں نہیں پکتے''۔

''تو آج پائے پکیں گے کیا؟''شریفہ نے پوچھا۔

''آج رکھے ہیں' کل صبح ملیں گے''۔بھٹیارن نے جواب دیا۔''اور آپ دیکھیں گے آٹھ بجے کے بعد ایک ہڈی بھی باقی نہیں رہے گی''۔

کسی نے کچھ جواب نہ دیا۔بھٹیارن نے پوچھا۔

''آپ یہاں درگاہ پر حاجری دینے آئے ہوں گے''۔

''کس بزرگ کی درگاہ ہے یہاں؟''شریف حسین کی ماں نے پوچھا۔

''بڑے بجرگ (بزرگ) کی درگاہ ہے بی بی جی!دور دور سے لوگ آتے ہیں اور مرادیں لے کر جاتے ہیں''۔بھٹیارن نے جواب دیا۔

نیچے سے کسی نے بھٹیارن کو آواز دی اور وہ سلام کر کے نیچے چلی گئی۔

آج کا دن بھی گزرا اور اگلا روز بھی۔ گو اس اثنا میں شریف حسین کی ماں نے ہر چند چاہا کہ شریف پھر ہوٹل پر جا کر دریافت کرے لیکن اُس نے صاف کہہ دیا کہ وہ دو روز تک کہیں نہیں جائے گا۔ لیکن وہ اپنے ماں کے اس خیال کو نہ بدل سکا کہ ان کے چچا کو جب یہ معلوم ہوگا کہ اس کے مرحوم بھائی کے اہل وعیال کسی بھٹیارن کے مکان پر پڑے ہیں تو وہ بہت ناراض ہوگا اور اُسے اپنی ہتک سمجھے گا۔

تیسرے روز صبح ایک بزرگ صورت آدمی سرائے کے پاس تانگے پر سے اُترا اور سرائے میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ سرائے سے نکل کر بھٹیاروں کے پاس آیا اور ایک کو پاس بلا کر پوچھا۔

''یہاں کسی مکان میں کوئی نئے آدمی تو نہیں آئے''۔

''دو روج ہوئے آئے تھے''۔ بھٹیارے نے جواب دیا۔ ''کریمن بھٹیارن کے کوٹھے پر ٹھہرے ہیں۔ یہ بغل میں تیسری دکان ہے کریمن کی۔ اس سے پوچھئے آپ''۔

یہ پوچھنے والا دلاور حسین تھا۔

کریمن دکان پر بیٹھی چھالیا کاٹ رہی تھی۔ دلاور حسین نے پاس جا کر پوچھا۔

''تمہارا نام کریمن ہے؟''

''ہاں حُجور مجھے ہی کریمن کہتے ہیں''۔

''تمہارے مکان پر کون لوگ ٹھہرے ہیں؟'' دلاور حسین نے پوچھا۔

''کوئی پردیسی ہیں''۔ کریمن نے جواب دیا۔

''نام معلوم نہیں؟'' دلاور حسین نے پوچھا۔

''ایک جوان لڑکا ہے۔ اس کا نام شریف ہے''۔ کریمن نے جواب دیا۔

''کس کرایہ پر مکان دیا ہے تم نے؟'' دلاور حسین نے پوچھا۔

''پندرہ روپے ماہوار پر''۔ کریمن نے جواب دیا۔

''بجلی اور نل بھی ہے؟'' دلاور حسین نے پوچھا۔

''دُنوں (دونوں) ہیں''۔ کریمن نے کہا۔ ''ان کا کرایہ علیحدہ ہے''۔

''کوئی نوکر بھی ہے ساتھ؟''

''نہیں!''

''کرایہ کے روپے لے لئے یا ابھی لینے ہیں؟'' دلاور حسین نے پوچھا۔

''نقد پیشگی لے لئے''۔ کریمن نے جواب دیا۔

''اوپر جانے کا راستہ کدھر ہے؟'' دلاور حسین نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ پچھواڑے میں سیڑھیاں ہیں''۔کریمن نے جواب دیا۔

دلاور حسین پچھواڑے کی طرف چلا گیا اور سیڑھیاں چڑھ کر دروازے پر دستک دی۔

''کون ہے؟''اندر سے شریف حسین نے پوچھا۔

''میں دلاور حسین ہوں''۔باہر سے دلاور حسین نے کہا۔

دلاور حسین کا نام سن کر زینب اور شریفہ بھی دوپٹے سنبھال کر بیٹھ گئیں۔شریف حسین نے دروازہ کھول دیا اور دلاور حسین کو دیکھ کر ادب سے سر جھکا کر کہا۔

''چچا جان آداب عرض کرتا ہوں''۔

''جیتے رہو''۔دلاور حسین نے جواب دیا۔اور اندر آ گیا۔''شریفہ نے بھی اُٹھ کر اور ہاتھ ماتھے تک لا کر کہا۔''چچا جان آداب عرض کرتی ہوں''۔

''جیتی رہو''۔دلاور حسین نے ایک کھاٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔زینب رونے لگی۔

''بھابی!''دلاور حسین بولا۔''صبر کرو''۔

شریف اور شریفہ ماں کے پاس خاموش بیٹھے تھے اور دلاور حسین کسی بڑے ماہر نفسیات کی طرح کبھی شریف کی طرف اور کبھی شریفہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔زینب دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

''دلاور حسین تم نے تو ہمیں ایسے بھلا دیا کہ بس توبہ ہی بھلی۔تمہارے مرحوم بھائی خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے یہی حسرت دل میں لئے ہوئے اللہ کو پیارے ہوئے۔دنیا میں اختلاف ہوا ہی کرتے ہیں لیکن......''

''لیکن''دلاور حسین بات کاٹ کر بولا۔''میرے پاس کچھ زیادہ وقت نہیں اس لئے اس ذکر کو تم رہنے دو بھابی۔کچھ کام کی بات کرو''۔

''ہم دو روز سے یہاں پڑے ہیں تم کہاں چلے گئے تھے؟''زینب نے پوچھا۔

''میرے خیال میں یہ نہ تو تمہیں ہی مجھ سے پوچھنا چاہئے اور نہ مجھے بتانے کی ضرورت ہے''۔دلاور حسین نے خشک سا جواب دیا۔

''کم از کم ہمارے کہیں رہنے کا انتظام تو کر دیا ہوتا''۔زینب نے کہا۔''تمہارے نوکر نے تو سیدھے منہ بات ہی نہیں کی''۔

''بھابی!''دلاور حسین نے پھر کہا۔''میرے پاس وقت بہت کم ہے۔کوئی کام کی بات کرو۔یہ لڑکا کیا کرتا ہے؟''

''کیا کرتا ہے بیچارے نے''۔زینب نے جواب دیا۔تعلیم پا رہا تھا جو یہ مصیبت ہم پر ٹوٹ پڑی''۔

''کب سے بیکار بیٹھا ہے؟''دلاور حسین نے پھر پوچھا۔

''جب سے اس کا باپ اللہ کو پیارا ہوا''۔زینب نے دوپٹے سے آنسو خشک کرتے ہوئے جواب دیا۔

''گویا آوارہ پھرتا ہے؟''دلاور حسین نے کہا۔

شریف نے ذرا غصے سے اس کی طرف دیکھا۔لیکن زینب نے مسکرا کر کہا۔

''بیٹا! چچا کی بات کا برا نہیں مانا کرتے''۔

دلاور حسین بولا۔''لیکن میں پوچھتا ہوں کہ اس کے باپ کو قوم سے غداری کرنے کا اتنا صلہ بھی نہ ملا کہ یہ لڑکا ہی کہیں ملازم ہو جاتا۔ دنیا بھی گئی اور عاقبت بھی خراب ہوئی''۔

''چچا جان!''شریف نے کہا۔''آپ کم از کم ابا جان مرحوم کے متعلق ایسے الفاظ استعمال نہ کریں''۔

''کیوں نہ کہوں؟ کیسے نہ کہوں؟''دلاور حسین نے غصے سے کہا۔''تمہارا باپ قوم فروش تھا اور قوم فروش کو تمام دنیا قوم فروش ہی کہے گی۔ لیکن مجھے تعجب تو یہ ہے کہ اس نے جس قوم کے لئے اپنی قوم سے غداری کی اُس کے مرنے کے بعد تم سے کیوں کوئی اچھا سلوک نہ کیا؟''

''دلاور حسین!''زینب بولی۔''تم میرے شریف کو نہیں جانتے۔ کانگرس نے تو کچھ مدد کرنی چاہی تھی لیکن میرے شریف نے صاف انکار کر دیا۔ اور شاید تم یہ سن کر خوش ہو گے کہ تمہارا بھتیجا پکا مسلم لیگی ہے''۔

''پھر تو بہت بے وقوف ہے''۔دلاور حسین نے طنزاً مسکرا کر کہا۔''اسے اپنے باپ کی غداری کا معاوضہ ضرور لے لینا چاہئے تھا اور وہی کام کرنا چاہئے تھا جو اس کا باپ عمر بھر کرتا رہا''۔

''اس غریب کو تو خدا نے مہلت ہی نہ دی''۔زینب نے ایک بار پھر دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔''وہ تو دو ایک روز میں کانگرس کی صدارت سے استعفا دینے والے تھے''۔

''بہت روپیہ کما لیا ہوگا''۔دلاور حسین نے مسکرا کر کہا۔''لیکن حرام کی کمائی کبھی رہتی نہیں''۔

"چچا جان!" شریف حسین بولا۔ "لیکن ابا جان مرحوم کو یوں بار بار کوسنے سے آپ کا مطلب کیا ہے۔ ہم آپ کے پاس اس لئے نہیں آئے کہ آپ ہمارے منہ پر ہمارے ابا جان کو گالیاں دیں"۔

"بھابی!" دلاور حسین مسکرا کر بولا"۔ بہت چالاک ہے تمہارا لڑکا!"

"انجان جو ہوا"۔ زینب نے جواب دیا۔

"اب تم چاہتی کیا ہو بھابی؟" دلاور حسین نے پوچھا

"میں جو کچھ چاہتی ہوں تمہیں بھی معلوم ہے"۔ زینب نے جواب دیا۔ "اب ان دونوں کا باپ سرپرست یا جو کچھ سمجھو صرف تم ہو۔ ان کے لئے جو کچھ کرنا ہے اب تمہیں نے کرنا ہے۔ شاید تمہیں یہ معلوم نہ ہو کہ ہمارے پاس نہ کوئی جائیداد ہے نہ اثاثہ ہے۔ ہماری کل کائنات اس وقت تین چار سو روپے ہیں۔ خدا کے بعد اب تمہارا ہی آسرا ہے"۔ یہ کہتے ہوئے زینب کی آنکھوں میں پھر آنسو چھلکنے لگے۔

"میرے خیال میں جب تم پندرہ بیس روپے ماہوار کا مکان کرایہ پر لے سکتی ہو تو تمہیں میری مدد کی بھی کیا ضرورت ہو سکتی ہے"۔ دلاور حسین نے کہا۔ "پھر خانقاہ کی آمدن بھی تو ہے۔ میرے خیال میں تو تمہارے لڑکے کو دادا کی خانقاہ کا کام سنبھال لینا چاہئے تھا"۔

"دلاور حسین!" زینب بولی۔ "تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ تم سے تو اتنا بھی نہ ہوا کہ کسی کو سٹیشن پر ہی بھیج دیتے یا ہمارے ٹھہرنے کا کوئی انتظام کر دیتے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ دنیا کا خون اتنا سپید ہو چکا ہے۔ میں کرایہ کا مکان لے کر نہ رہتی تو کیا بازار میں جاڈیرا لگاتی۔ دو روز سے ہم تمہارے بلاوے پر یہاں آئے بیٹھے ہیں لیکن تم سے اتنا بھی نہ ہوا کہ ایک وقت کا کھانا ہی بھجوا دیتے۔ خیر! شکر ہے تم نے جلے دل کے پھپھولے تو پھوڑ لئے"۔

"بھابی!" دلاور حسین نے جواب دیا۔ "تم میرے بلوائے یہاں نہیں آئیں۔ تم نے آنے کو لکھا تھا۔ میں نے بھی لکھ دیا آ جاؤ۔ جب تمہاری مالی حالت اچھی نہیں تھی تو تمہیں سرائے میں ایک کوٹھری لے لینی چاہئے تھی۔ یہ بیس پچیس روپے جو تم نے مکان پر ضائع کئے تمہارے کسی اور کام آتے لیکن معلوم ہوتا ہے تمہیں روپے کی کوئی قدر نہیں اور ہو بھی کیسے سکتی ہے۔ جب گھر بیٹھے غیروں کے یہاں سے تمہاری سب ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ میں تو دلدار حسین کو بڑا ہوشیار سمجھتا تھا۔ لیکن......"

"چچا جان!" شریف نے غصے سے کہا۔ "معاف فرمائیے میں اپنے ابا جان کے متعلق کوئی بات نہیں سننا چاہتا"۔

دلاور حسین سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"تو ہاں میں کہہ رہا تھا کہ میں دلدار حسین کو بڑا ہوشیار سمجھتا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ جب تک زندہ رہا خود کو بھی دھوکہ دیتا رہا اور دوسروں کو بھی۔ خیر جو ہو چکا سو ہو چکا۔ اگر تمہیں یہاں رہنا ہے اور تم یہ چاہتی ہو کہ میں تمہاری اور تمہارے بچوں کی کچھ مدد کروں تو پھر تم کو وہی راستہ اختیار کرنا ہو گا جو میں تمہارے لئے تجویز کروں۔ لیکن یہ سن لو کہ اگر تم نے میری مرضی کے خلاف کوئی کام کیا تو مجھے تم سے اور تمہاری اولاد سے کچھ سروکار نہ ہو گا سن لیا بھابی؟"

یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور دروازے کے پاس جا کر بولا۔

''یہ مکان چھوڑ دو اور مستقل طور پر سرائے میں ایک کوٹھری لے لو اور گزرے ہوئے دنوں کی باتیں بھولنے کی کوشش کرو۔ میں ایک دو دن میں تمہیں سوچ کر بتاؤں گا کہ میں تمہارے بچوں کے لئے کیا کچھ کر سکتا ہوں''۔

اتنا کہہ وہ چلا گیا۔ شریف اور شریفہ دونوں سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے اور زینب کی آنکھوں سے کسی ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرح آنسو گر رہے تھے اور طاق پر ایک چڑیا بیٹھی اُداس اُداس سی آوازیں نکال رہی تھی۔

دلاور حسین کی جلی کٹی سن کر شریف غصے سے تلملا رہا تھا۔ لیکن اس کے جانے کے بعد غصہ کی جگہ بے کسی کے احساس نے لے لی اور آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ شریفہ بھی بار بار دوپٹے سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ اور ماں دونوں کو تسلی دے رہی تھی۔

''روتے کیوں ہو۔ اچھا ہوا تمہارے چچا نے دل کا بخار نکال لیا۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ آج نہیں تو وہ کل پھر ہم سے ملنے آئے گا۔ اور انشاء اللہ نتیجہ اچھا ہی ہوگا''۔

نئی راہیں

ہوتا ہوں جدا تجھ سے بصد بیکسی و یاس
اے کاش ٹھہر سکتا ابھی اور ترے پاس
مجھ سا بھی کوئی ہو گا یہ بخت جہاں میں
مجھ سا بھی کوئی ہو گا اسیرِ الم و یاس
مجبور ہوں لاچار ہوں کچھ بس میں نہیں ہے
دامن کو مرے کھینچتا ہے فرض کا احساس
بس ہی میں نہیں ہے مرے لاچار ہوں میں بھی!

(ن۔م۔راشد)

دلاور حسین چوتھے روز پھر بھاوج سے ملنے آیا اور آتے ہی غصے سے بولا۔

''بھابی! تم لوگ ابھی تک یہیں پڑے ہو۔اور میں پہر بھر سرائے میں تمہیں تلاش کرتا رہا۔تمہاری تو وہی بات ہے کہ رسی تو جل گئی ہے مگر بل نہیں گیا''۔

''مہینہ ختم ہولے تو سرائے میں ہی اُٹھ جائیں گے''۔زینب نے جواب دیا۔''روپے جو دے چکے ہیں وہ واپس تو اب مل نہیں سکتے''۔

''یہی تو مشکل ہے''۔دلاور حسین نے کہا۔''کہ تم کوئی کام بھی سوچ سمجھ کر نہیں کرتے تم لوگوں کی امیرانہ ٹھاٹ سے رہنے کی عادت مجھے تو امید نہیں کہ کبھی جا سکے۔لیکن تمہیں بھولنا نہیں چاہئے کہ یہاں کانگرس نہیں جو تمہاری ناز برداریاں کرے گی۔کانگرس صرف اس وقت تک کسی کی ناز برداریاں کرتی ہے جب تک اسے اس سے کوئی کام لینا ہوتا ہے خیر! میرا کام سمجھانا تھا۔میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ہاں وہ تمہارا لونڈا کہاں ہے؟''

''دلاور حسین!'' زینب بولی۔''وہ تمہارا بھتیجا ہے اور تمہارے مرحوم بھائی کا بیٹا ہے میرے ابا جان خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے کہا کرتے تھے کہ اپنے اپنے ہی ہوتے ہیں۔جو درد اپنوں کو ہوتا ہے وہ کسی اور کو نہیں ہو سکتا۔ناخن سے گوشت الگ نہیں ہو سکتا''۔

''ٹھیک ہے''۔دلاور حسین نے جواب دیا۔''اگر ناخن سے گوشت جدا ہو سکتا تو اس وقت میں بھی یہاں نہ ہوتا۔گزشتہ چار روز سے تم لوگوں کے لئے ہی ادھر اُدھر بھاگ دوڑ کرتا رہا ہوں''۔

''شریفہ!'' زینب نے بیٹی کی طرف دیکھ کر کہا۔''سن رہی ہو تمہارے چچا کیا کہہ رہے ہیں۔کہ وہ چار روز سے ہمارے ہی لئے بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔میں نہ کہتی تھی تم سے کہ تمہارا چچا ضرور تمہاری مدد کرے گا۔تمہارے ابا جان خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اگر زندہ

ہوتے تو آج اپنے بھائی کی یہ بھاگ دوڑ دیکھ کر کتنے خوش ہوتے''۔

''بھابی!'' دلاور حسین بولا۔''مجھے تو دنیا کو منہ دکھانا ہے۔اس لئے جیسے بھی ہوگا اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کروں گا۔لیکن مجھے افسوس ہے کہ تم نے شریف کی تربیت کا خیال نہیں رکھا۔ مجھے تو تمہارا لڑکا بڑا گستاخ اور شوریدہ سر معلوم ہوتا ہے۔اس کے اگر یہی لچھن رہے تو پھر اللہ ہی حافظ ہے اس کا۔اس روز تم دیکھ رہی تھیں کہ مجھ سے کیسے گستاخی سے باتیں کر رہا تھا۔جب طبیعت میں آوارگی آ جائے تو پھر نوجوانوں کی اصلاح کی کبھی امید نہیں رکھنی چاہئے''۔

''کیا کرے بے چارا''۔زینب نے آہ بھر کر کہا۔مصیبت جو یوں اچانک آ پڑی۔بچے شوخ طبیعت ہوا ہی کرتے ہیں۔اُسے تو اپنا گھر یاد آتا ہوگا۔دنیا بھر کی نعمتیں میسر تھیں۔ایک دنیا عزت کرتی تھی۔خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اس کے ابا جان کو' کبھی لوگ سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔مکان پر ایک میلہ سا لگا رہتا تھا۔شریف کے ایک ایک سوٹ پر ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپے خرچ ہو جاتے تھے۔دس دس جوڑے جوتوں کے تھے۔جس رنگ کا سوٹ' اسی رنگ کا بوٹ اور آج یہ حالت ہے کہ ایک جوڑا دھوبی کو دو اور دوسرا پہنو۔جس بچے نے اس طرح ناز و نعمت سے پرورش پائی ہو اس کے بچپن کی باتوں کا بزرگ بُرا نہیں منایا کرتے۔تم بھی ذرا دل میں سوچو کہ ان دو بچوں کا تمہارے سوا اب اور کون ہے''۔

دلاور حسین نے جو خاموش بیٹھا یہ سب باتیں سن رہا تھا سر اٹھا کر اپنی بھاوج کی طرف دیکھا اور کہا۔

''بھابی! میں نے بھی یہ چار روز محض اسی لئے ضائع کئے کہ میں تمہارے بچوں کی طرف سے سبک دوش ہو جاؤں۔انسان کو چاہئے کہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائے۔تمہیں اب گزشتہ باتوں کو بالکل بھول جانا چاہئے۔میں صبح سے شام تک محنت کرتا ہوں تب کہیں جا کر چار پیسے کماتا ہوں۔میں قوم فروش نہیں جو مجھے کہیں سے مفت کے روپے مل جائیں۔اگر تم یہ چاہو کہ میں تمہاری کچھ مالی خدمت کروں تو یہ مشکل ہے۔تم تینوں کو اپنے اخراجات کے لئے خود روپیہ کمانا ہوگا اور تمہیں اس قابل بنانے کے لئے مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا چار و ناچار ضرور کروں گا''۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ شریف حسین بھی آ گیا اور اپنے چچا کو دیکھ کر بولا۔

''چچا جان! سلام عرض کرتا ہوں''۔

''سلام کیوں کرتے ہو بھائی!'' دلاور حسین نے حقارت سے مسکرا کر کہا۔گالیاں دو گھورو' دھمکاؤ' سلام تو شریف کرتے ہیں''۔

شریف حسین سر سے ٹوپی اتار کر ماں کے پاس بیٹھ گیا۔زینب بولی۔

''شریف! تمہارے چچا تم سے بہت ناراض ہیں۔اٹھو معافی مانگو۔تمہارا چچا تمہارے باپ کی جگہ ہے اور اس کا بھی تم دونوں کے سوا دنیا میں اور کوئی نہیں۔بزرگ ناراض ہوا ہی کرتے ہیں۔بزرگوں کی بات کا برا نہیں مانا کرتے''۔

''معاف کرو بھابی!'' دلاور حسین بولا۔''میں باز آیا کسی کا بزرگ بننے سے۔بلکہ میں تو خوش ہوں کہ تمہارے لڑکے نے اور کچھ نہیں تو باپ کی شوریدہ سری ورثہ میں پائی۔لیکن میں ایک بار پھر تم سے کہے دیتا ہوں کہ اگر تمہارے لڑکے کے یہی لچھن رہے تو پھر تم سب کا اللہ حافظ!''

''نہیں' نہیں!'' زینب نے بیٹے کی طرف دیکھ کر کہا۔''میرا شریف واقعی شریف اور بڑا فرمانبردار لڑکا ہے۔اس کے ابا خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اسے دیکھ کر کہا کرتے تھے کہ یہ لڑکا میرے خاندان کا نام روشن کرے گا۔اور یقین مانو میں جھوٹ نہیں کہتی۔اس کے نانا

خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے یہی کہا کرتے تھے کہ اس بچے کا ستارہ کسی روز ضرور چمکے گا۔رہی میں تو میں تو اسی کے سہارے جی رہی ہوں"۔

"اس سے پوچھو تو سہی! آیا کہاں سے ہے؟" دلاور حسین بولا۔

"میں بازار سے کچھ سامان لینے گیا تھا"۔شریف حسین نے جواب دیا۔

"کیسا سامان؟" دلاور حسین نے پوچھا۔

"یہی کچھ کھانے پینے کا سامان"۔شریف حسین نے جواب دیا۔

"گویا کھانا گھر پر پکے گا"۔دلاور حسین نے پوچھا۔"لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ گھر پکانے کی کیا ضرورت ہے جب ایک چھوڑ تین بھٹیاروں کی دکانیں دو قدم پر موجود ہیں"۔

"بازار کا کھانا ان بچوں نے کبھی کھایا نہیں۔زینب نے ملتجی نگاہوں سے دلاور حسین کی طرف دیکھ کر کہا۔"برتن موجود ہیں۔میں نے ہی کہا تھا کہ کھانا گھر پکا لیا کریں گے"۔

"لیکن میں تم سے کب تک یہ کہے جاؤں کہ اب تم لوگ اپنی حیثیت کے مطابق رہنے کا انتظام کرو۔جتنے دام گھر کھانا پکانے پر اٹھیں گے اگر بازار سے پکا پکایا آئے گا تو اس سے بہت سستا رہے گا۔کھانے سے مطلب چٹخارہ نہیں بلکہ پیٹ بھرنا ہے"۔دلاور حسین نے کہا۔لیکن مصیبت یہ ہے کہ تم لوگوں کو حرام کی کمائی کا کچھ ایسا لپکا پڑ گیا ہے کہ تمہیں شریفانہ طور پر رہنا بہت دو بھر معلوم ہو رہا ہے"۔

شریف حسین کچھ جواب دینا چاہتا تھا لیکن ماں کا اشارہ پا کر خاموش رہا۔ایک شریفہ تھی جو کبھی کبھی اپنے چچا کی طرف دیکھ لیتی لیکن نفرت اور تعجب کی نگاہوں سے۔زینب بولی۔

"اچھا!" جیسے تم کہو گے ہم ویسے ہی کریں گے۔کیونکہ یہ ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو ہمارے ہی بھلے کو کہہ رہے ہو اور اگر چچا کو اپنے بھتیجے اور بھتیجی کی بھلائی مدنظر نہ ہو گی تو اور کسے ہو گی"۔

"بھابی!" شریف حسین بولا۔"میں تم سے ابھی ابھی کہہ چکا ہوں کہ یہ چار روز میں اسی کوشش میں رہا کہ تمہارے بچوں کے لئے کچھ اچھا انتظام کر سکوں۔تمہیں معلوم ہے کہ آج کل کانگرس اور مسلم لیگ میں بہت اختلاف ہے اور یہاں کانگرس برسر اقتدار ہے اس لئے اچھے اچھے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو کوئی پوچھتا تک نہیں۔میرا مطلب یہ ہے کہ سرکاری ملازمت ملنا آج کل بہت دشوار ہے۔میں نے ہر چند چاہا کہ کسی سرکاری محکمہ میں تمہارے لڑکے کو کوئی جگہ مل جائے لیکن مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔پھر میں نے سوچا کہ اسے کسی فرم میں کام پر لگوا دوں اس سے دو فائدے میرے مدنظر تھے۔ایک تو یہ کہ تمہارا لڑکا کچھ بنج بیوپار سمجھنے لگے گا دوسرے گزر اوقات ہو جائے گی لیکن تمہارے لڑکے کی اکڑفوں دیکھ کر مجھے یہ ارادہ بھی ترک کرنا پڑا۔کیونکہ فرم میں تو ہر آنے والے کی خوشامد کرنی ہوتی ہے اور تمہارا لڑکا بدقسمتی سے دوسروں سے خوشامد کروانے کا عادی ہے۔"

"تو خیر! ایک بہت بڑے زمیندار نے جو اتفاق سے میرے ہوٹل میں مقیم ہے مجھ سے ایک ایسا آدمی تلاش کرنے کو کہا جو اس کی زمینداری کا حساب کتاب رکھ سکے۔اس زمیندار کا گاؤں شہر سے چالیس پچاس میل کے فاصلے پر ہے اور بڑی پر فضا جگہ ہے دونوں وقت کا کھانا بھی

زمیندار کے یہاں سے ملے گا اور رہنے کو مکان بھی وہی دے گا"۔

"تو میرا شریف زمیندار کا گویا منیجر ہوگا"۔ زینب نے بات کاٹ کر گویا مسکراتے ہوئے کہا۔ "خدا جزا دے تمہیں مجھے تم سے ایسی ہی اُمید تھی۔ پھر تو میرے شریف کو بڑے بڑے شریف اور معزز لوگوں سے ملنے کا موقع ملا کرے گا کیونکہ بڑے زمینداروں سے ملنے والے بھی بڑے لوگ ہی ہوتے ہیں (پھر ذرا ہنس کر) خدا شکر خورے کو شکر دے ہی دیتا ہے۔ شریف! اٹھو اپنے چچا جان کا شکریہ ادا کرو"۔

دلاور حسین بولا۔ "تو میں کہہ رہا تھا کہ میرے کہنے سے اس زمیندار نے تمہارے لڑکے کو نوکر رکھنے کا مجھ سے وعدہ کرلیا ہے۔ زمیندار کل صبح کی 8 بجے کی بس سے واپس جا رہا ہے۔ شریف سے کہہ دو کہ آٹھ بجے سے ذرا پہلے ہی اپنا سامان لے کر بس کے اڈے پر پہنچ جائے۔ میں بھی وہاں آ جاؤں گا۔ میں نے محض تمہاری وجہ سے یہ سب کچھ کیا ہے اور ہاں تمہارے لڑکے کو شروع شروع میں پندرہ روپے ماہوار ملیں گے اور اگر تمہارے لڑکے کا کام اچھا ہوا تو پھر مزید ترقی کی بہت امید ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس لڑکے کو یہ بھی سمجھا دو کہ اگر اس نے اپنے آقا کے حکم کے خلاف کچھ کیا اور اس نے ناراض ہو کر اُسے وہاں سے نکال دیا تو میں اس کی صورت تک نہ دیکھوں گا"۔

"دلاور حسین!" زینب نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ صرف پندرہ روپے ماہوار کیا؟ اس سے زیادہ تو آج ایک معمولی مزدور پیدا کرلیتا ہے"۔

"ہاں صرف پندرہ روپے!" دلاور حسین نے جواب دیا۔ اور یہ پندرہ روپے بھی محض اس لئے کہ زمیندار سے میرے مراسم ہیں ورنہ اس سے بہت زیادہ تعلیم یافتہ لوگ دس روپے پر جانے کو تیار تھے اور اسے رہائش اور کھانا بھی محض اس لئے مفت ملے گا کہ میں نے اس کی سفارش کی ہے۔ اگر اسے میرے دوست کے ساتھ جانا پسند ہو تو کل صبح آٹھ بجے سے پیشتر بس کے اڈے پر آ جائے اور اگر یہ کام پسند نہیں تو پھر تم مجھ سے بھی کچھ اور توقع مت رکھو۔ میں نے آج تک کسی کا احسان نہیں اٹھایا۔ لیکن محض تمہاری خاطر سے بھابی آج میں ایک دوست کا احسان اٹھا رہا ہوں۔ اب رہا لڑکی کا قصہ اگر تمہاری لڑکی کچھ زیادہ پڑھی لکھی ہوتی تو شاید میں اس کے لئے کوئی اچھی جگہ حاصل کرسکتا۔ فی الحال میں نے شہر کے ایک یتیم خانے میں اس کے لئے انتظام کیا ہے صبح آٹھ سے شام کے آٹھ تک تمہاری لڑکی کو وہاں کام کرنا ہوگا۔ لڑکیوں کو سلائی کا کام بھی سکھانا ہوگا۔ اور پڑھانا بھی ہوگا۔ صبح کا کھانا وہیں سے ملے گا اور اگر یہ چاہے تو رات بھی وہیں رہ سکتی ہے۔ اس صورت میں رات کا کھانا بھی وہیں سے کھائے گی۔ اور پندرہ روپے ماہوار تنخواہ بھی ملے گی۔ اسے بھی کل سے ہی کام شروع کرنا ہوگا"۔

"پندرہ روپے ماہوار اور آٹھ سے آٹھ تک کام!" زینب نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "خدا کی شان ہے جو بچے دن بھر میں چار پانچ روپے روزانہ خرچ کرتے تھے اور جن کے ہاں کام کرنے والوں کو بیس بیس اور پچیس پچیس روپے ماہوار تنخواہ اور گھر سے پکا ہوا دونوں وقت کھانا ملتا تھا آج انہیں دس دس اور پندرہ پندرہ روپے کے لئے دردر کے دھکے کھانے کو کہا جا رہا ہے۔ خیر! اللہ کی مرضی۔ میرے ابا جان مرحوم خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ جو لوگ مصیبت میں صبر کرتے ہیں وہ اچھے دن بھی جلد دیکھتے ہیں۔ میں بھی صبر کروں گی۔ لیکن دلاور حسین تم نے اتنا تو سوچ لیا ہوتا کہ جو بچے اتنی عمر تک امیرانہ ٹھاٹھ سے رہتے چلے آئے ہیں اتنے ذلیل کام کیسے کرسکیں گے؟"

"اب رہیں تم بھابی!" دلاور حسین نے اس دُکھیا کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا تو میرا خیال ہے کہ تم اور نہیں تو کھانا تو اچھا پکانا جانتی

ہوگی۔اتفاق سے کل ہی میرے ایک دوست نے مجھے ایک ماما کے لئے کہا تھا اس لئے تم اگر پسند کرو تو وہ بارہ روپے ماہوار اور دونوں وقت کے کھانے پر تمہیں اپنے یہاں رکھنے کو تیار ہوں گے۔صبح سات سے شام کے نو بجے تک وہاں کام کرنا ہوگا۔چونکہ وہ ایک بڑا گھرانا ہے اس لئے میں نے ہر طرح کی ذمہ داری خود لینے کا وعدہ کیا ہے۔اگر پسند ہو تو تم بھی کل سے اپنا کام شروع کرسکتی ہو"۔

پیشتر اس کے کہ زینب کچھ کہے شریف نے غصے سے اپنے چچا کی طرف دیکھا اور کہا۔"نہیں! ہماری ماں ایسا ذلیل کام کبھی نہیں کرے گی"۔

شریفہ اور زینب کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔دلاور حسین نے شریف کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"بھابی! بتاؤ کیا ارادہ ہے تمہارا؟ میں اس سے زیادہ تمہاری اور تمہارے بچوں کی اور کوئی خدمت نہیں کرسکتا۔اگر تمہارے لڑکے کو میری تجویز پسند ہو تو وہ صبح بس کے اڈے پر آجائے اور تمہاری لڑکی اگر کام کرنا چاہے تو میرا ملازم کل اسے ساتھ لے جائے گا۔اور جو تمہیں ماما کا کام منظور ہو تو تمہیں بھی میرا ملازم میرے دوست کے مکان پر پہنچا دیگا"۔

یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور بولا۔

"میں تو اب جاتا ہوں۔عصر کے بعد میرا ملازم آئے گا۔تم لوگ جو کچھ فیصلہ کرو اس سے کہہ دینا۔اگر تمہیں میری تجویز پسند ہوئی تو میں سب انتظام کردوں گا اور اگر تمہارا ارادہ کچھ اور ہو تو اپنا انتظام تمہیں خود کرنا ہوگا۔مجھ سے کسی قسم کی امید مت رکھنا"۔

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔تینوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔شریفہ اور زینب بار بار دوپٹہ سے آنسو پونچھ رہی تھیں آخر شریف نے اس مہر خاموشی کو توڑا اور ماں کی طرف دیکھ کر بولا۔

"اماں! میں ذلیل کام کرنے کو تیار ہوں۔لیکن تمہیں ماما گیری ہرگز نہ کرنے دوں گا"۔

"قسمت جو دکھائے دیکھنا ہی پڑتا ہے بیٹا!" ماں نے دوپٹہ سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا اور شریفہ ناک سنک کر بولی۔

"توبہ ہے۔کتنا سنگ دل ہے یہ شخص! اس سے تو بہتر ہے کہ ہم گاؤں ہی واپس لوٹ جائیں۔اس ذلت سے تو بچ جائیں گے"۔

"نہیں" ماں نے کہا"کام کرنے میں کوئی ذلت نہیں۔جب قسمت میں کام کرنا ہی لکھا ہے تو ہم کام کرنے سے کیوں ہچکچائیں۔جب پیغمبر اونٹ اور بھیڑوں کے چرواہے رہ چکے ہیں تو ہمیں کام سے کیوں عار ہو"۔

"اماں!" شریف بولا۔"لیکن تم اتنا بھی نہیں سمجھیں کہ چچا ہمیں دیدہ و دانستہ ذلیل اور رسوا کرنے کی کوشش کررہا ہے۔اگر اس کے دل میں کچھ درد ہوتا یا ہم سے ہمدردی ہوتی تو یقیناً وہ اس سے بہتر ہمارے لئے کوئی انتظام کرسکتا تھا"۔

"بیٹا! تم ان لوگوں کی چالوں کو نہیں سمجھ سکتے"۔ماں نے دوپٹہ سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے جواب دیا۔یہ امیر آدمی کچھ عجیب سی طبیعت کے ہوتے ہیں۔بات یہ ہے کہ وہ جانتا ہے ایک روز تمہیں اس کا وارث بننا ہے اس لئے وہ تمہاری عادات کو درست کرنے کے خیال سے یہ سختی کررہا ہے تاکہ دولت پاکر تمہیں دولت کی قدر ہو اور تم اُسے برباد نہ کرڈالو"۔

"ہم اس کے وارث ہوں گے؟" شریف نے تعجب سے پوچھا۔"ہم سے تو وہ سیدھے منہ بات بھی کرنے کا روادار نہیں۔ہمیں وارث

کب بنائے گا وہ؟"

"زندگی میں تو واقعی نہیں" ۔ ماں نے جواب دیا۔"تمہیں معلوم ہے کہ اُس نے آج تک شادی نہیں کی اور تمہارے علاوہ اس کا کوئی وارث بھی نہیں۔اس لئے قانوناً بھی اور شرعاً بھی اس کے مرنے کے بعد تم ہی اس کے وارث ہو گے۔تمہارے نانا خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اکثر کہا کرتے تھے کہ ایسے لوگ جنہوں نے غربت میں زندگی کے دن بسر کیے ہوں۔خدا جب انہیں دولت دیتا ہے تو ایک تو بہت بخیل اور دوسرے بڑے تنگ دل ہو جاتے ہیں اور جیتے جی اپنے وارثوں کو اپنے پاس تک بھی نہیں پھٹکنے دیتے۔حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ مرنے کے بعد ان کے مال ودولت کے یہی لوگ وارث ہوں گے۔اور محض اس خیال سے کہ یہ کیوں مالک بنیں گے ان سے سختی اور درشتگی سے پیش آتے ہیں۔اس لئے بیٹا! تمہیں اپنے چچا کی باتوں سے ناراض نہیں ہونا چاہئے بلکہ جیسے وہ کہیں اسی طرح کرنا چاہئے۔گو مجھے تمہاری جدائی بہت شاق ہے اور طبیعت بھی گوارا نہیں کرتی کہ تم مجھ سے دور رہو لیکن مصلحت یہی ہے کہ ہم یہ عارضی جدائی بھی گوارہ کر لیں۔اب تم اللہ کا نام لے کر کل اس زمیندار کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔خدا نے چاہا تو نتیجہ اچھا ہی ہو گا۔تمہارے ابا جان خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے جن دنوں تنگ دست تھے تو معمولی سے معمولی کام کرنے پر بھی آمادہ ہو جایا کرتے تھے اور تمہارے نانا بھی خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اکثر کہا کرتے تھے کہ یہ مصائب انسان کے لئے ایک قسم کا امتحان ہوتے ہیں اس لئے انسان کو امتحان سے ڈرنا نہیں چاہئے"۔

"اور تم ماما گیری کرو گی؟"شریف نے غصے سے پوچھا۔

"میں ابھی اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتی" ۔ماں نے جواب دیا۔"مجھے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ شریفہ کے لئے تمہارے چچا نے جو کام تجویز کیا ہے وہ اسے پسند کرتی ہے یا نہیں۔اگر شریفہ کو یہ کام پسند ہوا تو شاید میں گھر پر ہی کوئی کام کر لیا کروں اور نہیں تو کمر بند بن کر ہی چار پیسے پیدا کر لوں گی۔تم ہماری فکر مت کرو۔لیکن یاد رکھو کہ نصب العین بہت بلند ہونا چاہئے۔میں پگلی نہیں جو اتنی دور سے چل کر یہاں آ گئی ہوں۔انشاءاللہ تم دیکھو گے کہ میری تدبیر کیسے کامیاب ہوتی ہے اور یہ دلدر کیسے کٹتا ہے"۔

تو خیر زینب نے کسی نہ کسی طرح شریف حسین کو زمیندار کے ساتھ جانے پر آمادہ کر ہی لیا۔

عصر کا وقت تھا۔سرائے کے بغل میں ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔موذن کی صدائے اللہ اکبر فضا میں گونج رہی تھی۔شریف حسین بھی جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے گھر سے وضو کر کے گیا۔مسجد میں بہت کم نمازی ہوتے تھے۔زیادہ سے زیادہ دس پندرہ اور ان میں سے بھی زیادہ مسافر جن کا سرائے میں قیام ہوتا۔

وہ جب نماز سے فارغ ہو کر گھر کو لوٹا تو مسجد کے دروازے پر اس کے چچا کا بوڑھا ملازم عزیز مل گیا۔

"آپ ہی کا نام شریف حسین ہے؟"عزیز نے دو ایک بار آنکھیں جھپکا کر پوچھا۔

"ہاں بابا! میں ہی شریف حسین ہوں"۔شریف حسین نے جواب دیا۔

"اچھا اچھا! آپ ہی شریف حسین ہیں"۔عزیز نے ذرا مسکرا کر اور آنکھیں جھپکا کر کہا اور آپ غالباً سید دلدار حسین مرحوم کے صاحبزادے ہیں"۔

''ہاں!'' شریف نے کہا۔ ''میں سید دلدار حسین مرحوم کا بیٹا ہوں''۔

''معاف کیجئے!'' عزیز نے دو ایک بار آنکھیں جھپکا کر کہا۔ میں اُس روز آپ کو پہچانا نہیں تھا۔ میری بینائی کچھ کم ہو گئی ہے۔ لیکن آپ نے بھی تو مجھ سے یہ نہ کہا کہ شاہ جی آپ کے چچا ہیں۔ آپ کے والد سید دلدار حسین مرحوم تو بڑی خوبیوں کے آدمیوں تھے۔ آپ کو معلوم نہیں لیکن میں بھی آپ ہی کے گاؤں کا رہنے والا ہوں اور آپ میری گود میں کھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن دیکھئے ان باتوں کا کسی سے ذکر مت کریں آپ۔ میں پہلے سید صاحب مرحوم کی خدمت میں تھا لیکن جب وہ شہر تشریف لے گئے تو میں کسی وجہ سے ان کے ساتھ نہ جا سکا اور دلاور حسین کی خدمت کرنے لگا۔ پھر ان کے ساتھ ہی گاؤں سے چلا آیا۔ اس وقت میں جوان تھا اور ان کی خدمت کرتے کرتے بوڑھا ہو گیا ہوں۔ لیکن دیکھئے ان باتوں کا کسی سے ذکر مت کریں آپ! بی بی جی اچھی ہیں؟''

''اچھی ہیں!'' شریف حسین نے جواب دیا۔

''اور چھوٹی بی بی بھی؟ کیا نام ہے اُن کا؟'' عزیز نے دو ایک بار آنکھیں جھپکا کر پوچھا۔

''میری چھوٹی بہن کا نام شریفہ ہے''۔ شریف حسین نے جواب دیا۔

''دونوں کی خدمت میں میرا اسلام کہئے''۔ عزیز نے کہا۔

''کہہ دوں گا!'' شریف حسین نے کہا۔

''مجھے آپ کے چچا نے بھیجا ہے۔ کیا فیصلہ کیا ہے آپ نے؟'' عزیز نے پوچھا۔ ''آپ خاں صاحب کے ساتھ کل صبح جا رہے ہیں یا نہیں؟''

''یہ خاں صاحب کون ہیں؟'' شریف حسین نے پوچھا۔

''بڑے زمیندار ہیں اور بڑے ہی اچھے آدمی ہیں۔ آپ دیکھیں گے کتنے نیک آدمی ہیں صادق علی خاں ......'' عزیز نے پھر دو ایک بار آنکھیں جھپکا کر کہا۔ ''آپ میری بات یاد رکھیں۔ انسان سوچتا کچھ اور ہے اور ہوتا کچھ اور ہے۔ گذشتہ چالیس سال سے میں یہی دیکھ رہا ہوں۔ لیکن آپ کسی سے ان باتوں کا ذکر مت کریں۔ تو کیا کہوں میں واپس جا کر؟''

''میں کل صبح بس کے اڈے پر پہنچ جاؤں گا''۔ شریف نے جواب دیا۔

''میں بھی وہاں موجود ہوں گا''۔ عزیز نے کہا۔ ''ہاں کالے خاں کا نام یاد رکھئے آپ''۔

شریف حسین نے تعجب سے عزیز کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''یہ کالے خاں کون ہے؟''

''کالے خاں پنواڑی ہے۔ سبزی منڈی کے چوک میں اس کی دکان ہے''۔ عزیز نے پھر اسی طرح آنکھیں جھپکا کر کہا۔ ''کاغذ پاس ہو تو لکھ لیں آپ۔ بڑے بھروسہ کا آدمی ہے اور وقت پر کام آنے والا ہے''۔

''لیکن مجھے اس سے کیا کام؟'' شریف حسین نے پوچھا۔

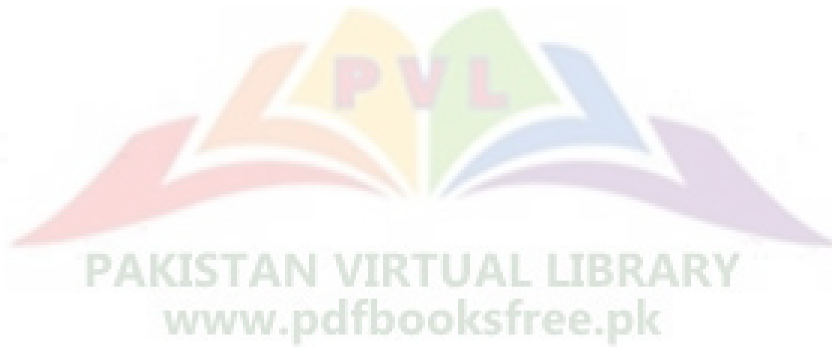
"لیکن مجھ سے تو آپ کو کام ہوگا؟" عزیز نے کہا۔ "آج نہیں کل سہی۔ کبھی سہی! مجھے جب خط لکھنا ہو تو اسی کالے خان پنواڑی سبزی منڈی والے کے پتہ پر لکھیں اور نہ سہی! بڑی بی بی جی اور چھوٹی بی بی جی کی شاید خیر خیریت ہی آپ کو معلوم کرنی ہوگی۔ لیکن دیکھئے ان باتوں کا ذکر کسی سے مت کریں آپ۔ اگر آپ کو کبھی مجھ سے ملنا ہو تو شاہ جی کے مکان پر نہ آئیں کالے خاں سے آ کر کہہ دیں اور اسی کے ہاں میرا انتظار کریں یاد رہے گا نا اس کا نام پتہ آپ کو کالے خاں پنواڑی اور سبزی منڈی!"

"ہاں بابا! یاد رہے گا"۔ شریف حسین نے کہا اور عزیز اسی طرح آنکھیں جھپکا جھپکا کر بولا۔

"آپ تو خیر صبح جا رہے ہیں۔ چھوٹی بی بی اور بڑی بی بی جی تو یہیں رہیں گی نا۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں دونوں کا خیال رکھوں گا۔ اور آپ کو اطلاع دیتا رہوں گا۔ لیکن دیکھئے ان باتوں کا کسی سے ذکر مت کریں آپ۔ اچھا تو اب اجازت ہے مجھے۔ خدا حافظ! فکر مت کریں۔ صادق علی خاں بڑا شریف آدمی ہے"۔

"خدا حافظ بابا!" شریف حسین نے کہا۔

عزیز جریب ٹیکتا ہوا چلا گیا اور شریف حسین گھر آ کر سفر کی تیاری کرنے لگا۔



صادق علی خاں

کتنے آلام و مصائب کا سہارا لے کر
کش مکش گاہ جہاں میں مجھے جینا ہی پڑا
مجھ کو بے ربط محبت کے فسانوں کے سوا
نالہ وگریہ سے لبریز ترانوں کے سوا
خار زار غم کونین میں کچھ بھی نہ ملا!

(اشعر)

دلاور حسین نے جس شخص کے ساتھ شریف حسین کی قسمت وابستہ کی تھی اس کا نام صادق علی خاں تھا۔صادق علی خاں سادات خاندان سے تھااور زندگی کی ساٹھ سے زیادہ منزلیں طے کر چکا تھا۔اس کی زندگی میں کئی انقلاب آ چکے تھے۔لیکن اُس نے ایک مردمومن کی طرح ہر انقلاب کا مقابلہ کیا تھااور ہمیشہ کامیاب رہا۔

کبھی اس خاندان کے نام بہت بڑی جا گیر تھی۔لیکن اب زمانہ بدل چکا تھا۔اب نہ وہ شان تھی اور نہ شوکت! جاگیر مختلف لوگوں میں بٹ گئی تھی اور خاندان کے پاس نام ہی نام رہ گیا تھا۔آخر اس خاندان کے ایک نوجوان نے جس کا نام باقر علی خاں تھا انگریزی سرکار کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں بہت نام اور عزت پیدا کی اور پھر ایک بار اس خاندان کو عروج حاصل ہوا اور باقر علی خاں کو اس کی شاندار خدمات کے عوض ایک زرخیز علاقہ انعام میں ملا۔صادق علی خاں اسی باقر علی خاں کا نواسہ تھا۔لیکن صادق علی خاں نے جوانی میں کسی اردلی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔موت کی سزا سے تو وہ بچ گیا مگر دس سال کے لئے جیل بھیج دیا گیا۔

جب وہ جیل سے واپس آیا تو اراضیات پر کسی مہاجن کا قبضہ تھا کیونکہ مقدمہ پر جو روپیہ خرچ ہوا تھا اسی سے قرض لیا گیا تھا۔صادق علی نے جس طویل کش مکش کے بعد قرض سے چھٹکارا پایا اور مہاجن کے پھندے سے خلاصی پائی ایک طویل داستان ہے مصائب اور پریشانیوں کی داستان! اوران مصائب اور پریشانیوں میں جن لوگوں سے اسے سہارا یا مدد ملنے کی امید تھی وہی سب سے زیادہ درپے آزار تھے۔صادق علی نے دو شادیاں کیں۔پہلی بیوی تو اس وقت اللہ کو پیاری ہوئی جس وقت وہ جیل میں تھا۔جیل سے واپس آ کر اس نے اپنی بڑی بہن کے اصرار سے دوسرا بیاہ کر لیا۔ یہ بہن پٹھانوں کے ایک معزز گھرانے میں بیاہی ہوئی تھی اور جوانی ہی میں بیوہ ہو گئی تھی اس کا صرف ایک لڑکا تھا جس کا نام نوازش علی خاں تھا اور وہ اس وقت فوج میں تھا۔اس دوسری بیوی کا بھی چار سال بعد انتقال ہو گیا۔اس کے بعد اُس نے پھر شادی نہیں کی۔اس وقت سے ساٹھ سال کی عمر

تک صادق علی نے جان توڑ کوششوں سے اپنی حالت پھر سنوار لی اور عزت اور آبرو سے زندگی بسر کرنے لگا۔ وہ جس قصبہ میں رہتا تھا اس کا نام اسی کے نام پر صادق آباد تھا۔ صادق آباد ایک بہت بارونق قصبہ تھا اور ایک پہاڑی ندی کے کنارے آباد تھا۔ صادق آباد سے دس میل کے فاصلے پر کوہستانی علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ صادق علی خاں نے چونکہ خود عمر بھر ٹھوکریں کھائیں تھیں اور زندگی کی تلخیوں سے آشنا ہو چکا تھا اس لئے اب اسے قدرتاً غریبوں کی اور بیکسوں کی مدد کا ہر وقت خیال رہتا تھا اور وہ بڑی فراخدلی سے ایسے لوگوں کی مدد کرتا لیکن اس انداز سے کہ دوسرے کو معلوم نہ ہو۔ اس کے احباب نے ہر چند چاہا کہ وہ پھر شادی کرے لیکن وہ ایک بار جو ارادہ کر چکا تھا اس پر قائم رہا۔

اسے اگر شوق تھا تو صرف شکار کا شوق تھا۔ شکار کے موسم میں وہ اکثر چار چار پانچ پانچ روز کے لئے پہاڑوں کی طرف نکل جاتا۔ کبھی پانچویں چھٹے مہینے چند روز شہر میں بھی گزار آتا۔ شریف حسین کو اب اسی صادق علی خاں کے پاس کام کرنا تھا۔

چنانچہ اگلے روز شریف حسین اپنی ماں اور بہن سے رخصت ہو کر آٹھ بجنے سے کچھ پیشتر ہی اپنا سامان لے کر بس کے اڈے پر پہنچ گیا۔ ایک بس تیار کھڑی تھی لیکن ابھی اس کے چچا کا ملازم عزیز نہیں آیا تھا۔ اور یہ اسے معلوم نہیں تھا کہ صادق علی خاں کون ہے۔ بس والے نے پوچھا۔

"آپ کو کہاں جانا ہے؟"

"جانا تو مجھے اسی بس سے ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ کہاں جانا ہے؟" شریف حسین نے ذرا مسکرا کر کہا۔

"یہ خوب رہی"۔ بس والے نے بھی مسکرا کر کہا۔ "آپ کو جانا بھی ہے اور یہ بھی معلوم نہیں کہ کہاں جانا ہے"۔

"دراصل بات یہ ہے"۔ شریف حسین نے جواب دیا۔ "کہ مجھے جن کے ساتھ جانا ہے وہ ابھی آئے نہیں۔ بس جانے میں ابھی کتنی دیر ہے"۔

"یہی دس پانچ منٹ باقی ہیں"۔ بس والے نے جواب دیا۔

"تو وہ لوگ بھی آتے ہی ہوں گے"۔ شریف حسین نے سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

دو ایک اور مسافر آ گئے اور بس والا ان سے باتیں کرنے لگا۔ اتنے میں ایک تانگہ آیا اور تانگے میں سے دلاور حسین کا نوکر عزیز اُترا۔

"آپ آ گئے؟" اس نے اُترتے ہی پوچھا۔ "کب آئے آپ؟"

"کوئی دس پندرہ منٹ ہوئے ہوں گے بابا"۔ شریف حسین نے جواب دیا۔ "خاں صاحب کب آئیں گے۔ بس تو جانے والی ہے"۔

"خاں صاحب آئے تو تھے اپنی موٹر میں۔ لیکن ان کے موٹر میں کچھ خرابی تھی۔ اس لئے ان کا بس میں جانے کا خیال تھا۔ لیکن موٹر درست ہو گیا ہے اور وہ اب آتے ہی ہوں گے"۔ عزیز نے دو ایک بار آنکھیں جھپکاتے ہوئے جواب دیا۔

"اور چچا بھی آئیں گے؟" شریف حسین نے پوچھا۔

"ہاں! آئیں گے"۔ عزیز نے کہا۔ "میں تانگے میں اس لئے آ گیا ہوں کہ مجھے آپ سے ایک ضروری بات کہنا ہے"۔

"کیا؟" شریف حسین نے پوچھا۔

"لیکن آپ برا نہ مانیئے گا"۔ عزیز نے جلدی جلدی آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ "جب آپ کے چچا اور صادق علی خاں آئیں تو آپ

خاں صاحب پر یہ ظاہر نہ ہونے دیں کہ دلاور حسین آپ کے چچا ہیں"۔

شریف حسین نے تعجب سے عزیز کی طرف دیکھا اور وہ اسی طرح جلدی جلدی آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولا۔

"آپ ناراض نہ ہوں۔لیکن آپ جانتے ہیں کہ میں شاہ جی کا ملازم ہوں اور مجھے ان کے ہر حکم کی تعمیل کرنی ہوتی ہے۔سمجھ گئے نا آپ! ملازم جو ہوا"۔

شریف حسین نے کچھ جواب نہ دیا۔عزیز نے پھر کہا۔

"لیکن صادق علی خاں بڑے ہی شریف اور بھلے آدمی ہیں وہ آپ کو اپنی موٹر میں ساتھ لے جائیں گے"۔

اتنے میں سامنے سے موٹر آتا ہوا نظر آیا۔عزیز بولا۔

"لیجئے! وہ آ گئے۔وہ کالے خاں پٹواری سبزی منڈی والا نہ بھولئے گا آپ۔اور دیکھئے اس بات کا کسی سے ذکر بھی نہ کریں"۔

موٹر اسی جگہ آ کر رُکا جہاں عزیز اور شریف حسین کھڑے باتیں کر رہے تھے دلاور حسین اور صادق علی خاں پچھلی سیٹوں پر بیٹھے تھے اور شوفر کے ساتھ صادق علی خاں کا ایک نوکر بیٹھا تھا۔دلاور حسین اور صادق علی خاں دونوں اُترے۔صادق علی نے پوچھا۔

"سید صاحب! کہاں ہے وہ نوجوان جسے میرے ساتھ جانا ہے؟"

"وہ رہا عزیز کے ساتھ"۔دلاور حسین نے کہا۔پھر شریف حسین سے۔"یہاں آ ؤ! خاں صاحب کو سلام کرو"۔

"آداب عرض خاں صاحب!" شریف حسین نے کہا۔

صادق علی خاں نے شریف حسین کی طرف دیکھا اور ذرا مسکرا کر پوچھا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"شریف حسین جناب"۔شریف نے جواب دیا۔

"اسباب کہاں ہے؟" صادق علی خاں نے پوچھا۔

شریف حسین نے ایک چھوٹے سے ٹرنک اور ایک معمولی سے بستر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔"یہ رکھا ہے جناب!"

"شوفر!" صادق علی خاں بولا۔"اسباب رکھ لو موٹر میں"۔

دلاور حسین نے خاں صاحب کی طرف دیکھا اور کہا۔

"آپ اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے کیا؟ میں بس میں بٹھا دیتا ہوں پہنچ جائے گا"۔

"جب موٹر موجود ہے اور جگہ بھی ہے تو پھر بس میں کیوں جائے"۔خاں صاحب نے کہا۔"دونوں کو ایک ہی جگہ تو جانا ہے"۔

"آپ اکیلے بیٹھیں گے تو آرام سے جائیں گے"۔دلاور حسین نے کہا۔

"ساتھ ہوگا تو وقت اچھا کٹے گا"۔خاں صاحب نے مسکرا کر جواب دیا۔

شوفر نے شریف حسین کا اسباب موٹر پر باندھ لیا۔

''کیوں بھائی چلیں''۔خاں صاحب نے ڈرائیور سے پوچھا۔

''تشریف رکھئے جناب!'' شوفر نے کہا۔

صادق علی خاں نے دلاور حسین کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اچھا سید صاحب! خدا حافظ۔بہت بہت شکریہ''۔

''اب کب تشریف لائیں گے آپ؟'' دلاور حسین نے پوچھا۔

''جب خدا کو منظور ہوگا''۔صادق علی خاں نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔پھر شریف سے۔

''آؤ یہاں' بیٹھ جاؤ تم بھی''۔

''تم شوفر کے ساتھ بیٹھ جاؤ''۔دلاور حسین نے شریف سے جب وہ خاں صاحب کے ساتھ بیٹھنے لگا تو کہا۔

''شوفر کے ساتھ کیوں؟'' خاں صاحب نے کہا۔''یہاں میرے ساتھ بیٹھے گا''۔پھر......شریف حسین سے۔''آؤ یہاں بیٹھو!''

شریف حسین بھی سوار ہوگیا۔لیکن نہ تو کچھ دلاور حسین نے ہی رخصت کے وقت اس سے کہا اور شریف حسین نے بھی خاموشی سادھی رکھی۔صرف عزیز پاس آ کر بولا۔

''خاں صاحب! آداب عرض کرتا ہوں''۔

''سلام عزیز!'' خاں صاحب نے ایک روپیہ جیب سے نکال کر عزیز کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں نہیں!'' عزیز ذرا پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔''اس کی ضرورت نہیں جناب''۔

''لے لو بھائی!'' خاں صاحب نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

عزیز نے روپیہ لے کر پھر سلام کیا اور ذرا جھک کر ہولے سے کہا۔

''اس بچے کا خیال رکھئے گا''۔

شریف نے ہاتھ باہر نکالا اور کہا۔

''بابا! سلام علیکم!''

عزیز نے سلام کا جواب صرف سر ہلا کر دیا اور موٹر نے اپنا رستہ پکڑا۔

چالیس پچاس میل کا سفر تھا۔موٹر شہر سے نکل کر صادق آباد کو ہولی۔سڑک کے دو جانب کھیت تھے۔سڑک بھی کچھ ایسی خراب نہ تھی۔موٹر سنگ میل پر سنگ میل طے کر رہی تھی۔صبح کی ٹھنڈی ہوا مشام جان کو تازہ کرتی تھی اور دور بہت دور فاصلے پر پہاڑوں کے دھندلے دھندلے سے نشان نظر آ رہے تھے۔

''اچھا ہوا جو اپنا موٹر مل گیا''۔صادق علی خاں نے بیٹھے بیٹھے کہا۔

''کام تو کچھ ایسا نہ تھا جناب''۔شوفر نے جواب دیا۔

''کارخانے والے تو کہتے تھے پانچ سات روز لگیں گے''۔خان صاحب نے کہا۔

''یہ لوگ یونہی کہا کرتے ہیں جناب!''شوفر نے کہا۔''میں نے انعام کا لالچ دیا تو چند گھنٹوں میں کام کر دیا''۔

''میرا تو خیال ہے اسے بیچ ہی ڈالیں اب''۔خاں صاحب نے کہا۔

''جناب مالک ہیں''۔شوفر نے کہا۔''ورنہ کام تو اچھا دے رہا ہے''۔

شریف حسین خاموش بیٹھا تھا۔خاں صاحب نے پوچھا۔

''کہاں تک تعلیم پائی ہے میاں تم نے؟''

''ایف۔اے تک جناب!''شریف حسین نے جواب دیا۔

''ایف۔اے تک؟خاں صاحب نے ذرا تعجب سے کہا۔

''امتحان میں تھوڑے روز باقی تھے جو شہر میں فساد ہو گیا اور امتحان ملتوی ہو گیا''۔شریف حسین نے کہا۔

''ان لڑائی جھگڑوں نے تو بہت پریشان کر رکھا ہے''۔خاں صاحب بولے۔''خدا کا شکر ہے ہم دیہات کے رہنے والے تو ابھی فسادات سے بچے ہوئے ہیں''۔

''یہ وبا زیادہ تر شہروں میں ہی پھیلی ہوتی ہے''۔شریف حسین نے کہا۔''مصیبت یہ ہے کہ آپس میں اعتماد نہیں رہا''۔

''ہاں یہ سچ ہے''۔خاں صاحب نے کہا۔''لیکن تم نے پڑھنا کیوں چھوڑ دیا؟''

''واقعات نے مجبور کر دیا جناب!''شریف حسین نے آہ بھر کر کہا۔

''فسادات میں کچھ نقصان ہو گیا تھا کیا؟''خاں صاحب نے ہمدردانہ انداز سے پوچھا۔

''جی ہاں!''شریف حسین نے جواب دیا اور خاں صاحب کا نوکر اگلی نشست پر سے بولا۔

''ہمیشہ بے گناہ ہی مارے جاتے ہیں''۔

''گاؤں میں طبیعت اُداس تو نہ ہو گی''۔صادق علی خاں نے ذرا مسکرا کر پوچھا۔''شہر کے رہنے والوں کو گاؤں میں رہنا مشکل ہی ہوتا ہے''۔

''ضرورت ہر مشکل کو آسان کر دیتی ہے جناب!''شریف حسین نے جواب دیا۔

''تو تم نے ایف۔اے تک تعلیم پائی ہے گویا''۔خاں صاحب نے جیسے اپنے سے کہا''شہر میں تو تعلیم کا انتظام ہو سکتا ہے۔لیکن قصبے میں بہت مشکل ہے''۔

شریف حسین نے کچھ جواب نہ دیا۔

سامنے سے ایک بس گرد و غبار کے بادل اڑاتی چلی آ رہی تھی۔شوفر نے بھی رفتار تیز کر دی۔

''تیز مت چلو''۔خاں صاحب نے کہا۔

''گرد سے بچ رہا ہوں جناب!'' شوفر نے کہا۔

بس پاس سے گزر گئی۔

''کمبخت بہت تیز چلا رہا ہے''۔ خاں صاحب چہرے پر سے گرد پونچھتے ہوئے بولے۔

اب پہاڑ صاف نظر آ رہے تھے۔ کھیتوں میں کہیں کہیں ہرن بھی چرتے چگتے نظر آ جاتے کبھی کوئی سارس کا جوڑا اپنی لمبی گردنیں اٹھا کر موٹر کو دیکھنے لگتا تھا۔ سڑک کے ساتھ ساتھ بجلی کے کھمبے جا رہے تھے۔ اگلی سیٹ پر سے نوکر بولا۔

''آج کل ادھر ہرن زیادہ نظر آتا ہے''۔

''ریاست کا علاقہ جو ساتھ لگتا ہے''۔ خاں صاحب نے کہا۔

''اپنے علاقے میں بھی تو شکار کچھ کم نہیں''۔ نوکر نے کہا۔

موٹر فراٹے بھرتے جا رہا تھا۔ خاں صاحب خاموش بیٹھے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کچھ سوچ رہے ہیں۔ کبھی کبھی ادھر اُدھر سے تیتر کے بولنے کی آواز بھی سنائی دینے لگتی۔

''کچھ شکار کا شوق بھی ہے تمہیں''۔ خاں صاحب نے شریف سے اچانک پوچھا۔ ''کبھی بندوق بھی چلائی''۔

''ہاں کبھی موقع مل گیا تو چلالی''۔ شریف حسین نے جواب دیا۔

''اپنی؟'' خاں صاحب نے پوچھا۔

''نہیں جناب!'' گاؤں میں ایک آدمی کے پاس تھی۔'' شریف حسین نے جواب دیا''۔

''قصبے کے گرد و نواح میں شکار بکثرت ملتا ہے۔ اور پہاڑ میں بھی کافی شکار ہے''۔ خاں صاحب بولے۔ ''قصبے کے قریب ہی ایک ندی بھی ہے اور ندی میں مچھلی بھی کافی ملتی ہے۔ وقت اچھا گزرے گا''۔

شریف حسین نے ذرا جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''اگر گستاخی نہ ہو تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں مجھے کیا خدمت انجام دینی ہوگی''۔

''تمہیں؟'' خاں صاحب نے مسکرا کر کہا۔ ''بہت بڑی خدمت بلکہ ایک بہت مشکل کام۔ کر سکو گے؟''

''مشکل ہو یا آسان جب کرنا ہی ہے تو کروں گا''۔ شریف حسین نے جواب دیا۔

''بہت مشکل کام ہے''۔ خاں صاحب نے پھر مسکرا کر کہا۔

شریف حسین نے تعجب سے صادق علی خاں کی طرف دیکھا اور خاں صاحب نے ہنس کر کہا۔

''لیکن مجھے یقین ہے کہ تمہارے لئے مشکل نہ ہوگا''۔

''آپ ارشاد فرمائیں تو کچھ معلوم ہو''۔ شریف حسین نے مودبانہ انداز سے کہا۔ ''مجھ سے تو یہ کہا گیا تھا کہ مجھے آپ کی زمینداری کا حساب کتاب رکھنا ہوگا''۔

''اور مجھ سے یہ کہا گیا تھا کہ مجھے ایک آوارہ مزاج لڑکے کو قابو میں رکھنا ہوگا''۔صادق علی خاں نے ہنس کر کہا۔

شریف حسین نے سر جھکا لیا۔قصبہ نزدیک آ گیا تھا۔پہاڑ بالکل صاف نظر آ رہے تھے قصبے کی عمارات پر دھوپ کھیل رہی تھی۔دیہات کے لڑکے ڈھور ڈنگر کھیتوں میں لئے پھرتے تھے۔'ٹھیلے' کے' بیل گاڑیاں ادھر اُدھر آ جا رہی تھیں۔سڑک پر سے گزرنے والے صادق علی خاں کو دیکھ کر جھک کر سلام کرتے اور ہر سلام کرنے والے کے سلام کے جواب میں صادق علی کا ہاتھ بھی برابر اُٹھتا۔

قصبے کے قریب ہی سڑک پر ایک پل بنا ہوا تھا۔ندی بل کھاتی ہوئی پل کے نیچے سے گزرتی تھی۔پل کے پاس دو چار شوقین بیٹھے مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔موٹر پل پر سے گزر کر اور سڑک چھوڑ کر دائیں ہاتھ کو ہو گیا۔یہ راستہ پتھریلا تھا اور ندی کے ساتھ ساتھ جاتا تھا۔ندی پر کہیں بڑھیوں نے چھوا چھو لگا رکھی تھی۔کہیں عورتیں بیٹھی کپڑے دھو رہی تھیں۔آخر موٹر ایک عالیشان بنگلے کے سامنے جا کر رک گیا۔یہ بنگلہ صادق علی خاں کا تھا۔

آقا اور نوکر

میں کہاں اور بلندی کے مقامات کہاں
آج بھی حسرتِ پرواز مگر باقی ہے!
آج بھی دوڑ رہا ہے رگِ احساس میں خوں
آج بھی غیرتِ توہین بشر باقی ہے!

(موجؔ۔علیگ)

صادق آباد ایک بارونق قصبہ تھا۔بیس پچیس ہزار نفوس کی آبادی تھی۔یہاں غلے کی منڈی تھی۔ڈاک خانہ تھا۔تار گھر تھا۔ہسپتال تھا۔مویشیوں کا شفاخانہ تھا۔مدرسہ تھا۔مندر بھی تھا اور خوبصورت مساجد بھی تھیں۔قصبے میں بجلی کی روشنی بھی تھی۔بازار بھی کچھ ایسے تنگ نہ تھے۔سڑکیں بھی صاف اور اچھی حالت میں تھیں۔گرمیوں کے موسم میں کچھ زیادہ رونق نظر آتی کیونکہ یہاں سے ایک پہاڑ کو سڑک جاتی تھی۔لب سڑک ایک سرائے بھی تھی۔یہاں مسافروں کے آرام کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔

یہ قصبہ صادق علی خاں نے آباد کیا تھا۔صادق علی خاں کا عالیشان مکان ندی کے کنارے تھا۔مکان کا کچھ حصہ جسے اگر زنانہ حصہ کہا جائے تو زیادہ ٹھیک ہوگا بالکل ہندوستانی طرز کا تھا لیکن مردانہ حصہ مغربی طرز کا تھا۔مکان کے یہ دونوں حصے ایک دوسرے سے علیحدہ تھے اور دونوں حصوں کے درمیان ایک خاصا کھلا کھلا صحن تھا۔اس گراؤنڈ یا صحن کے وسط میں ایک ہشت پہلو حوض تھا ایک خوبصورت فوارہ سے صبح وشام پانی کے موتی برستے تھے۔موٹر۔گھوڑا گاڑی۔پہلی نوکر چاکر بھی کچھ موجود تھا صادق علی خاں کو حکومت کی رف سے۔کلکٹری کے اختیارات بھی تھے۔اور وہ عدالت بھی اپنے مکان ہی پر کرتے تھے۔صادق علی خاں کے انصاف' حلم' اور رحم دلی کی دور دور تک دھوم تھی۔ہم آپ سے پہلے کہہ چکے ہیں کہ صادق علی عمر کی ساٹھ سے کچھ زیادہ منزلیں طے کر چکا تھا اور گو اس کی عمر کا زیادہ تر حصہ افکار و آلام کی نذر رہا لیکن اس پیرانہ سالی میں بھی چہرے پر سرخی کی جھلک تھی۔بڑی بڑی آنکھیں تھیں چوڑا چکلہ سینہ تھا۔مضبوط بدن تھا اور پاٹ دار آواز تھی۔بڑا متقی پرہیز گار اور سچے معنوں میں مسلمان آدمی تھا۔

موٹر جب مکان کے دروازے پر رُکا تو خان صاحب کے ملازم نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔اور آقا کو جھک کر سلام کیا۔خاں صاحب نے مسکرا کر سلام کا جواب دیا اور ایک خوبصورت برآمدے کی طرف چلا۔شریف حسین موٹر سے نکل کر موٹر کے پاس ہی کھڑا تھا۔خان نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

''ارے بھائی! آجاؤ' تم وہاں کیوں رک گئے؟''

برآمدے میں ادھر اُدھر کرسیاں پڑی تھیں۔ صادق علی خاں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور شریف حسین کو بھی بیٹھنے کو کہا۔ پھر ایک جمائی لے کر بولا۔

''ہم تو بوڑھے ہو گئے اب! آج کچھ تھکاوٹ سی محسوس ہو رہی ہے''۔

ایک نوکر جو پاس کھڑا تھا بولا۔

''جناب سفر کی وجہ ہے۔ حکم ہو تو غسل کے لئے پانی رکھوں''۔

''پہلے ہمارے مہمان کے ٹھہرنے کا انتظام کرو''۔ خان نے کہا۔

''جہاں حکم ہو ان کا سامان لگا دیا جائے''۔ نوکر نے کہا۔

صادق علی خاں کچھ سوچنے لگا۔

''یہ جو حویلی کے عقب میں مکان ہے وہ درست ہے نا؟'' صادق علی خاں نے نوکر سے پوچھا

''ہاں جناب بالکل درست ہے''۔

''تو یہ وہاں ٹھہریں گے'' صادق علی نے کہا۔ ''ان کا سامان وہیں لے جاؤ اور کسی سے کہہ دو کہ آج سے ان کی خدمت میں رہا کرے''۔

''بہت بہتر جناب!''

''کسی چیز کی ضرورت تو نہیں وہاں؟'' خان نے پوچھا۔

''سب سامان موجود ہے جناب؟'' نوکر نے اور بھی وثوق سے کہا۔

''شریف حسین''! صادق علی خاں بولا۔ ''میرے خیال میں تم بھی تھک گئے ہو گے۔ اُٹھو! ذرا آرام کر لو تم بھی۔ جو مکان میں نے تمہارے رہنے کو تجویز کیا ہے۔ کچھ ایسا برا تو نہیں لیکن مجھے امید ہے تم پسند کرو گے۔ اب چونکہ تمہیں یہاں میرے پاس رہنا ہے اس لئے جس چیز کی ضرورت ہو بے تکلف مجھ سے کہہ دینا''۔

پھر نوکر سے۔

''انہیں ساتھ لے جاؤ۔ اور کسی سے کہہ دو کہ ان کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہے ضروریات کا خیال رکھے''۔

یہ کہہ کر صادق علی خاں اٹھا۔ شریف حسین بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

''تو مجھے اجازت ہے؟'' صادق علی نے ذرا مسکرا کر پوچھا۔

''آپ آرام فرمائیں''۔ شریف حسین نے جھکی جھکی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

صادق علی خاں جب چلا گیا تو نوکر بولا۔

''تشریف لایئے آپ بھی''۔

شریف حسین ساتھ ہو لیا۔ حویلی کے عقب میں انگریزی طرز کا ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ چار کمرے تھے۔ دو سونے کے ایک کھانے کا۔

ایک بیٹھک کا۔ایک غسل خانہ۔مکان کے دوطرف برآمدہ تھا۔اور برآمدہ کی دیواروں پر کوئی جنگلی بیل جس میں زرد رنگ کے پھول آئے ہوئے تھے پھیلی ہوئی تھی۔سونے والے کمروں میں دو دو پلنگ تھے۔چٹائی تھی۔اور چٹائی پر خوبصورت دری۔ڈرائنگ روم یا بیٹھک کا کمرہ خاصا سجا ہوا تھا کھانے والے کمرے میں بھی ضرورت کا سب سامان موجود تھا۔مکان کے پچھواڑے میں پانی کے لئے ہینڈ پمپ لگا ہوا تھا۔اور ندی برآمدے کے سامنے سے گزرتی تھی۔نظر کے سامنے پہاڑ کا منظر بہت دلکش تھا۔یہ وہ مکان تھا جو صادق علی خاں نے شریف حسین کے رہنے کے لئے تجویز کیا تھا۔اس شریف حسین کے لئے جسے بقول دلاور حسین صرف پندرہ روپے ماہوار پر خان صاحب نے ملازم رکھا تھا۔اور پندرہ روپے بھی محض اس لئے کہ دلاور حسین نے اس کی سفارش کی تھی۔

نوکر جب مکان شریف حسین کو دکھا چکا تو اس نے اس کا بستر کھول کر ایک پلنگ پر جما دیا اور کپڑوں کا ٹرنک پلنگ کے نیچے رکھ دیا۔نوکر نے پوچھا۔

''چائے پئیں گے آپ؟''

''ایک پیالی ہو تو دے دو''۔شریف حسین نے کہا۔

نوکر نے باہر نکل کر آواز دی۔

''مالی! باورچی خانے سے چائے لے آؤ''۔

شریف حسین پلنگ پر لیٹا ہوا تھا نوکر پھر پاس آ بیٹھا اور بولا۔

''آپ شکار کے لئے تشریف لائے ہیں۔شکار تو ادھر بڑی کثرت سے ملتا ہے''۔

''اچھا!'' شریف حسین نے ایسے ہی کہا۔

''ہرن بھی ہیں۔پاڑے بھی ہیں۔پہاڑ میں جنگلی مرغ چکور اور بھکیلا بھی ملتا ہے''۔نوکر نے کہا۔سارس۔مرغابیاں۔تیتر بھی بہت ملتے ہیں''۔

''بہت شکار ہے''۔شریف حسین نے کہا۔

''آپ کی بندوق کہاں ہے؟'' نوکر نے ادھر اُدھر دیکھ کر پوچھا۔

''میرے پاس بندوق نہیں''۔شریف حسین نے جواب دیا۔

''خان صاحب کے پاس تو ایک درجن ہیں بندوق بھی رائفل بھی''۔

''خان صاحب کو شکار کا بہت شوق ہے کیا؟''۔شریف حسین نے پوچھا۔

''بہت زیادہ''۔نوکر نے کہا۔

ایک نوکر چائے لے آیا۔اور پلنگ کے پاس ہی ایک چھوٹی میز پر چائے کا سامان لگا دیا۔خاصی پر تکلف چائے تھی۔شریف حسین جب چائے پی چکا تو نوکر نے برتن اُٹھا لئے دوسرا آدمی بھی اُٹھتے ہوئے بولا۔

''خان صاحب تو بارہ کے بعد کھانا کھاتے ہیں آپ کس وقت کھائیں گے؟''

''جب تیار ہو جائے''۔شریف حسین نے کہا۔

''مجھے اجازت ہے''۔نوکر نے پوچھا۔''مالی موجود ہے۔کوئی کام ہو تو اس سے کہہ دیں میں کسی آدمی کو بھی ابھی بھیج دیتا ہوں''۔

دونوں نوکر چلے گئے۔

شریف حسین پلنگ پر لیٹا چھت کی طرف دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے۔چچا نے تو کہا تھا اسے ایک معمولی ملازم کی حیثیت سے کام کرنا ہوگا۔اور پندرہ روپے ماہوار تنخواہ ملے گی۔اس لحاظ سے تو اسے نوکر گھروں کے پاس رہنے کو کوئی کوٹھری ملنی چاہئے تھی۔پھر اسے اپنی ماں اور بہن کا خیال آیا اور وہ سوچنے لگا۔کہ شاید اسکی بہن اس وقت یتیم خانے میں بیٹھی یتیم لڑکیوں کو کچھ سکھا پڑھا رہی ہوگی۔اور ماں...... ماں کے خیال نے اس کے دل میں چٹکی سی لی اور ساتھ ہی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔اس کی ماں اور ماما گری۔سید دلدار حسین کی بیوہ اور کسی کی خادمہ آنکھوں سے بے اختیار آنسو گرنے لگے۔اور آج عمر میں پہلی بار وہ اتنا رویا کہ روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔پھر جیسے کہ اس حالت میں عموماً ہوا کرتا ہے اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ کچھ ایسا گھوڑے بیچ کر سویا کہ آنکھ اُس وقت کھلی جب نوکر نے آ کر جگایا اور کہا کہ خاں صاحب یاد فرماتے ہیں۔

شریف حسین نے اٹھ کر ہاتھ منہ دھویا اور نوکر کے ساتھ ہولیا۔

صادق علی خاں ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔شریف حسین کو دیکھ کر بولا۔

''آؤ میاں آؤ''۔پھر کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔''یہاں بیٹھ جاؤ میرے پاس''۔

شریف حسین آداب بجالا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

''مجھے تو لیٹتے ہی نیند آ گئی''۔خاں صاحب نے کہا۔''تم بھی سوئے یا نہیں؟''

''ہاں جناب کچھ سو ہی گیا تھا''۔شریف حسین نے جواب دیا۔

صادق علی خاں نے شریف کی طرف دیکھا اور کہا۔

''چونکہ اب تمہیں یہاں رہنا ہے۔اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آج ہی کچھ باتوں کا فیصلہ ہو جائے''۔

''ارشاد؟'' شریف حسین نے کہا۔

''اول تو یہ!'' صادق علی ذرا مسکرا کر بولا مجھے جناب کہنے کی بجائے اگر تم صرف خاں صاحب کہو تو زیادہ اچھا ہوگا۔گو مجھے تمہارے حالات تو معلوم نہیں اور شائد معلوم کرنے کی کوشش کرنا بھی فی الحال مناسب نہ ہو لیکن تمہاری شکل وصورت کہے دیتی ہے۔کہ تم دنیا میں دوسروں کو جناب کہنے کے لئے پیدا نہیں ہوئے اس لئے تم مجھے صرف خاں صاحب کہا کرو۔اب رہا یہ کہ تمہیں یہاں کام کیا کرنا ہوگا تو خدا کے فضل سے میرے پاس کام کاج کی نگرانی کرنے کے لئے کافی آدمی ہیں لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ میں ہر ایک کارندے کے کام کی نگرانی کرسکوں۔اس لئے ان لوگوں کے کام کی تمہیں نگرانی کرنی ہوگی۔اصطبل میں گھوڑے موجود ہیں۔جب ضرورت ہو گھوڑا منگوالیا کرو۔اور اگر کہیں دور جانا ہو تو موٹر بھی ہے۔ سمجھ لیا؟''

''ہاں جناب!'' شریف حسین نے کہا۔

''یہ تو بسم اللہ ہی غلط ہوئی''۔ صادق علی نے مسکرا کر کہا۔ ''لیکن خیر! تمہیں یہ کام پسند تو ہے؟''

''ہاں جناب پسند ہے''۔ شریف حسین نے جواب دیا۔

''اب ایک کام اور بھی ہے''۔ صادق علی خاں بولا۔ ''لیکن یہ کام ایک نوجوان کے لئے بہت مشکل ہے''۔

شریف حسین نے متجسسانہ نگاہوں سے خاں صاحب کی طرف دیکھا۔ صادق علی خاں بولا۔ ''اگر کوئی اور آدمی ہوتا تو شاید میں اسے اس امتحان میں نہ ڈالتا۔ لیکن میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تم مجھے شکایت کا موقع نہ دو گے۔ اور اس امتحان میں پورے اترو گے''۔ اتنا کہہ کر وہ رک گیا پھر ایک لمبا گہرا سانس لے کر بولا۔

''شریف حسین تم جوان ہو اور جوانی دیوانی ہوتی ہے اور ہر قسم کے تازیانہ سے بے نیاز ہوتی ہے لیکن تمہارے بشرے سے مجھے یہ صاف نظر آتا ہے کہ تم کسی شریف خاندان سے ہو اور شرافت ایک ایسا سم ہے جو انسان کو غلط راستے سے چلنے سے روک لیتا ہے اور ضمیر کی آواز ہمیشہ موثر ثابت ہوتی ہے۔ تمہیں شاید معلوم نہ ہو میں دنیا میں بالکل اکیلا ہوں۔ میری تمام زندگی مصائب اور پریشانیوں کا سامنا کرتے گزری ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب سکھ کا سانس لے رہا ہوں لیکن ایک خلش ابھی تک باقی ہے۔ میری زندگی کے ساتھ ایک لڑکی کی زندگی بھی وابستہ ہے۔ یہ لڑکی اب ماشاء اللہ جوان ہے اور خاصی تعلیم یافتہ ہے۔ میری مونس تنہائی' پیری کا سہارا جو کچھ بھی تم سمجھو بس یہی ایک لڑکی ہے اس گھر میں تمہیں اس لڑکی سے اور لڑکی کو تم سے ملنے کا اکثر موقع ملا کرے گا۔ اور تم دونوں کسی وقت سیر کرنے یا گھومنے گھامنے بھی جایا کرو گے۔ ملنے ملانے اور سیر و تفریح کو جانے کی تم دونوں کو پوری آزادی حاصل ہو گی۔ لیکن اس سے زیادہ نہیں مجھے اُمید ہے کہ تم بہت محتاط رہو گے۔ یہ لڑکی میرے پاس ایک امانت ہے وعدہ کرو کہ تم اس امانت کی پوری پوری حفاظت کرو گے''۔

''انشاءاللہ آپ کو مجھ سے شکایت نہ ہو گی''۔ شریف حسین نے جواب دیا۔

''شاباش!'' صادق علی خوش ہو کر بولا۔ ''مجھے تم سے ایسی ہی امید تھی''۔

پھر اس کی طرف دیکھ کر۔

''میں جانتا ہوں کہ میں تم پر ایک بہت بڑا بوجھ ڈال رہا ہوں اور ایک ایسا وعدہ لے رہا ہوں جو حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے نباہنا آسان نہیں اور شائد کسی وقت تمہیں کچھ دشواریاں بھی پیش آئیں۔ لیکن میں احسان فراموش نہیں۔ دنیا میں آج تک کسی نے مجھے احسان فراموش نہیں کہا۔ بس یہی وہ مشکل کام تھا۔ جس کا میں نے راستہ میں تم سے ذکر کیا تھا''۔

نوکر نے آ کر اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے۔

صادق علی خاں صوفے سے اُٹھتے ہوئے بولا۔

''آؤ کھانا کھائیں''۔

دونوں کھانے والے کمرے میں جا بیٹھے۔ ہر چیز سے شان امارت ٹپکتی تھی۔ کئی ایک قسم کا کھانا تھا۔ دو نوکر اُجلے کپڑے پہنے خدمت کے

لئے ایک طرف کھڑے تھے۔

"طاہرہ کہاں ہے؟" صادق علی خاں نے پوچھا۔

"اپنے کمرے میں ہیں جناب!" ایک نوکر نے جواب دیا۔

"تو بلاؤ اسے"۔ خاں صاحب نے کہا۔" کھانا نہیں کھائے گی کیا؟"

نوکر چلا گیا اور تین چار منٹ بعد ایک جوان لڑکی کچھ شرماتی ہوئی اندر آئی۔

"آؤ بیٹا!" صادق علی خان بولا۔" یہاں بیٹھو میرے ساتھ"۔

طاہرہ بیٹھ گئی۔

"شریف حسین!" خاں صاحب نے مسکرا کر کہا۔" یہ میری بچی طاہرہ ہے"۔

پھر طاہرہ سے...... "طاہرہ بیٹی! شریف حسین کو میں شہر سے لایا ہوں۔ زمینداری کے کام میں ہم ان سے مدد لیں گے۔ تم بھی ذرا ان کا خیال رکھنا"۔

"انشاء اللہ! کوشش کروں گی"۔ طاہرہ نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

"کتابیں مل گئیں؟" خاں صاحب نے طاہرہ سے پوچھا۔

"ہاں مل گئیں"۔ طاہرہ نے ہولے سے کہا۔

"میرے بعد کتنی مچھلیاں پکڑیں؟" خاں صاحب نے پھر مسکرا کر پوچھا۔

"خالی تو کبھی آئی نہیں"۔ طاہرہ نے مسکرا کر کہا۔

"مچھلی کے شکار میں صبر کی بہت ضرورت ہوتی ہے"۔ خان صاحب نے شریف حسین کی طرف دیکھ کر پوچھا۔" تمہارا کیا خیال ہے شریف؟"

خان صاحب کا شریف حسین کو صرف شریف کہنا بے تکلفی کی نشانی تھی۔

"جناب!" شریف حسین نے جواب دیا۔" صبر تو واقعی کرنا پڑتا ہے۔ لیکن صبر کا پھل بھی میٹھا ہوتا ہے"۔

"کبھی تم نے بھی مچھلی کا شکار کیا"۔ خان صاحب نے پوچھا۔

"کبھی موقع نہیں ملا"۔ شریف حسین نے جواب دیا۔

"مچھلی تو کانٹے میں قسمت سے پھنستی ہے۔ لیکن مچھلی کو پانی سے نکالنا بھی ایک فن ہے"۔ خان صاحب نے کہا۔

"پھنس جائے تو پھر نکل ہی آتی ہے"۔ شریف حسین نے کہا۔

"طاہرہ!" خاں صاحب نے پوچھا۔" کیا خیال ہے تمہارا؟"

"بڑی مچھلی کا نکالنا آسان نہیں ہوتا"۔ طاہرہ نے اپنی پلیٹ پر شامی کباب رکھتے ہوئے کہا۔

صادق علی خاں مسکرا کر بولا۔ ''حضرت اورنگ زیب عالمگیر کا قول ہے کہ ''شکار کار بے کاراں است'' اسے ضرورت سے زیادہ مارنا بھی نہیں چاہئے''۔

''جب مل جائے تو کون چھوڑتا ہے''۔ طاہرہ نے مسکرا کر کہا۔

''یہ تو سچ ہے''۔ خاں صاحب نے بھی مسکرا کر کہا۔ پھر شریف حسین سے۔

''شریف! یہاں میرا ایک چھوٹا سا کتب خانہ بھی ہے۔ وقت گزارنے کو اچھی اچھی کتابیں مل جائیں گی''۔

''ذرہ نوازی ہے جناب کی!'' شریف نے جواب دیا۔ پھر کچھ فساد کے متعلق باتیں ہوتی رہیں اور شریف شہر کے حالات بیان کرتا رہا۔ لیکن اپنے مرحوم باپ کے متعلق کچھ ذکر نہ کیا۔ خان صاحب بولے۔

''مشکل یہ ہے کہ مسلمان جب شکار ہوتا ہے۔ غفلت کا شکار ہوتا ہے اور آج ملک کی سیاسی حالت کو دیکھتے ہوئے مسلمان کو ہی سب سے زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے''۔

''بجا ہے جناب!'' شریف نے جواب دیا۔

''ابا جان!'' طاہرہ بولی۔ ''میرے خیال میں تو فساد حکومت کے ایما سے ہوتا ہے''۔

''حکومت وہاں فساد کرواتی ہے جہاں اسے اپنا الو سیدھا کرنا ہو''۔ خاں صاحب نے جواب دیا۔ ''فساد کروانے والے ہندو لیڈر اور ہندو پریس ہے''۔

''اُن کا اس میں کیا فائدہ؟'' طاہرہ نے پوچھا۔

''ہندو لیڈر کی لیڈری چمکے گی اور اخبار والوں کا اخبار زیادہ بکے گا''۔ خاں صاحب نے مسکرا کر کہا۔ ''رہا مسلمان! تو جہاں تک میں دیکھتا ہوں اسے ان باتوں کا کچھ ایسا احساس ہی نہیں حالانکہ ہر مسلمان فطرتاً بھی سپاہی ہے اور مذہباً بھی اسے سپاہی ہی ہونا چاہئے۔ مسلمان جب تک سپاہی بن کر نہیں رہے گا۔ اس ملک میں عزت سے نہیں رہ سکتا''۔

طاہرہ گھڑی دیکھ کر بولی۔ ''اوہو باتوں باتوں میں خبریں سننے کا وقت بھی نکل گیا''۔

کھانا ختم ہو چکا تو شریف حسین اجازت لے کر اپنے ڈیرے پر آ گیا۔ خاں صاحب بولے۔

''مجھے اس لڑکے کے حالات تو کچھ معلوم نہیں لیکن بظاہر ہونہار اور شریف معلوم ہوتا ہے''۔

''کہاں سے مل گیا آپ کو؟'' طاہرہ نے پوچھا۔

''میں شہر میں جس ہوٹل میں ٹھہرا کرتا ہوں۔ اس کے مالک نے مجھ سے ایک لڑکے کو ملازم رکھنے کے لئے کہا تھا۔ مجھے بھی چونکہ آدمی کی ضرورت تھی میں اُسے لے آیا'' خان صاحب نے جواب دیا۔

''لیکن یہ تو راستہ ہی میں مجھے معلوم ہوا کہ شریف ایف اے تک تعلیم پائے ہوئے ہے''۔

''یہاں کیا کام کرے گا''۔ طاہرہ نے پوچھا۔

''یہ تو میں نے ابھی سوچا نہیں''۔ خاں صاحب نے جواب دیا۔''لیکن جیسے کہ میں کہہ چکا ہوں مجھے اس لڑکے کے حالات کچھ ایسے معلوم نہیں۔لیکن چہرے بشرے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شریف گھرانے سے ہے۔ابھی تو میں نے اسے کارندوں کے کام کی نگرانی کرنے کو کہا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ ہم دونوں کے لئے کارآمد ثابت ہوگا''۔

طاہرہ نے ذرا تعجب سے خاں صاحب کی طرف دیکھا اور کہا۔

''بابا! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی''۔

''تم بھی اکیلی پڑی رہتی ہو اور مجھے بھی کسی وقت ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہوتی ہے جسے میں قابل اعتماد سمجھ کر اس سے کوئی صلاح مشورہ کر سکوں''۔

طاہرہ نے کچھ جواب نہ دیا۔صادق علی بولا۔

''شریف کو ایف۔اے کا امتحان دینا تھا۔جو فساد ہو گیا۔اور نہ جانے کیا افتاد پڑی کہ غریب وطن سے بے وطن ہو کر ادھر آ نکلا''۔

''امتحان کی تیاری کیوں نہیں کرتا؟'' طاہرہ نے پوچھا

''مجھے کسی وقت خیال تو آتا ہے کہ اسے کالج بھجوا دوں''۔صادق علی نے جواب دیا''خیر! سوچ لیں گے کسی وقت۔لیکن تم بھی ذرا خیال رکھنا غریب کو کوئی تکلیف نہ ہو''۔

شریف حسین ڈیرے پر واپس آ کر برآمدے میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور آج کے واقعات پر غور کرنے لگا۔اسے کچھ ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا وہ الف لیلیٰ کا''سوتے جاگتے'' کا کھیل دیکھ رہا ہے اسے بیٹھے بیٹھے کبھی یہ خیال بھی آنے لگتا کہ کہیں اس کی ماں کا کہنا سچ ہی نہ ہو۔لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا اُسے تو اس کے چچا نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ اسے پندرہ روپے تنخواہ ملے گی اور یہاں ملازمت یا تنخواہ کا تو کوئی ذکر ہی نہ تھا وہ تو سمجھے بیٹھا تھا کہ کہیں نوکر گھروں میں اسے بھی کوئی کوٹھری رہنے کو مل جائیگی اور کوئی ایسا ہی کام کرنے کو مل جائے گا جو معمولی ملازم بڑے آدمیوں کا کیا کرتے ہیں لیکن یہاں مکان بھی ملا۔تو خوشنما اور خوب آراستہ! کھانا مالک نے اپنے اور اپنی بیٹی کیساتھ کھلایا۔کتب خانے سے کتابیں لے کر پڑھنے کی اجازت دی اور طاہرہ...... کتنی خوبصورت تھی۔طاہرہ لڑکی تھی یا نور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی کوئی پتلی تھی۔پھر صادق علی خاں کی تنبیہ''تم مجھے شکایت کا موقع نہیں دو گے'' شریف حسین حیران تھا کہ یہ کھیل ہے یا کیا؟ نہ جان نہ پہچان تو اتنا اعتماد کیسے...... لیکن شائد اس کے چچا نے خاں صاحب سے سب کچھ کہہ دیا ہو۔چچا! نہیں! نہیں! اس کی تو ہر بات سے نفرت ٹپکتی تھی۔وہ چچا جو عمر بھر اس کے مرحوم باپ سے بیزار رہا۔آج بھائی کی اولاد پر کیسے مہربان ہو سکتا تھا۔جس نے اپنی بیوہ بھاوج کو مایا گیری کرنے کو کہہ دیا۔شریف کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

ندی برآمدے کے پاس سے اچھلتی کودتی گزر رہی تھی۔پانی سیماب کی طرح چمک رہا تھا ندی کے دوسری جانب ہرے ہرے کھیتوں میں سارس کا ایک جوڑا لمبی لمبی گردنیں اٹھائے ایک بہلی کی طرف جو ذرا فاصلے پر گزر رہی تھی۔مشتبہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔شریف کو کچھ اونگھ سی آنے لگی تھی۔عین اس وقت کہیں دور سے نعرۂ تکبیر بلند ہوا۔فضا کی خوشگوار خاموشیوں میں یہ پر شوکت آواز ایک ارتعاش سا پیدا کر رہی تھی۔شریف بھی نماز پڑھنے کی تیاری کرنے لگا۔

نئی کہانی

مجھے گماں ہوا جیسے میں وہ مسافر ہوں
جو رات دن کی مسافت کے بوجھ سے تھک کر
یہ چاہتا ہو کہیں گوشۂ اماں مل جائے
جسے نہ زیست کا مقدور ہو نہ جائے مفر
جو ڈھونڈتا ہو اندھیرے میں اپنے گم کردہ
محبتوں کے ذخیرے دلوں کے سرمائے
نہ سنگِ میل نہ راہوں میں قافلوں کے نشاں
بسی ہوئی ہو نگاہوں میں راہ کی سختی!

(اخترالایمان)

ان واقعات کو جو ہم گذشتہ اوراق میں بیان کر چکے ہیں بہت روز ہو چکے تھے زینب کیلئے گو دلاور حسین نے کسی کے ہاں ماما گیری کا انتظام کیا تھا۔لیکن خوش قسمتی سے اسے بھی یتیم خانے میں جگہ مل گئی۔اب دونوں ماں بیٹی یتیم خانے میں کام کرتی تھیں اور محض دلاور حسین کے خوش کرنے کو کرایہ کا مکان چھوڑ کر یتیم خانے کے قریب ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے لگیں۔یہ مکان کیا تھا صرف دو چھوٹی چھوٹی کوٹھریوں کے آگے صحن۔ یتیم خانے کی مہتمم ایک بڑی رحم دل عورت تھی۔اس کا نام بیگم تھا۔بیگم کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ تھی اور اس عمر میں بھی چہرے کی رنگت اور اعضا کا تناسب اس بات کی دلیل تھی۔کہ کبھی جوانی میں خاصی خوبصورتی ہوگی۔یتیم خانے میں تقریباً پندرہ ایک لڑکیاں اور پانچ سات چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔بیگم ان یتیموں سے بڑی محبت سے پیش آتی اور دن بھر ان کی تعلیم تربیت اور نگہداشت میں لگی رہتی۔شریفہ اور اس کی ماں زینب پر بھی وہ بہت مہربان تھی۔بلکہ زینب سے تو اس کا ایک خاص طرح سے بہناپا سا ہو گیا تھا۔یتیم خانہ اس سرائے سے جہاں شریفہ اور اس کی ماں مقیم تھیں کچھ دور نہ تھا۔دونوں گھروں کے درمیان ایک چھوٹی سی گلی تھی۔اور گلی میں مزدوری پیشہ لوگ رہتے تھے۔

دلاور حسین نے جس طرح شریف حسین کو اپنے نوکر عزیز سے یہ کہلا دیا تھا کہ وہ صادق علی خاں کی موجودگی میں اسے چچا نہ کہے اور نہ ہی کسی قسم کی قرابتداری ظاہر کرے اسی طرح دلاور حسین نے اپنی بھاوج اور بھائی کی بیٹی شریفہ سے بھی سختی سے کہہ دیا تھا۔کہ وہ ہرگز کسی پر یہ ظاہر نہ ہونے دیں کہ وہ دلاور حسین کی رشتہ میں کچھ لگتی ہیں اور یہ بھی صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ اگر انہوں نے رازداری سے کام نہ لیا تو وہ آئندہ ان سے

بالکل بے تعلق ہو جائے گا۔ اور دونوں ماں بیٹی اس نصیحت پر سختی سے کاربند تھیں گو بیگم نے ہر چند چاہا کہ وہ زینب کے حالات معلوم کرے کہ وہ کون ہیں' کہاں کی رہنے والی ہیں۔ کیا پتا پڑی ہے۔ لیکن زینب نے ایک ہی خاموشی سادھ رکھی تھی اور کچھ عرصہ سے بیگم نے بھی یہ خیال چھوڑ دیا تھا۔ لیکن جیسے کہ ہم ابھی ابھی کہہ چکے ہیں دونوں میں ایک بہناپا سا ہو گیا تھا۔ اور اس وجہ سے زینب اور اس کی بیٹی شریفہ کے دن کچھ اچھے ہی گزر رہے تھے۔

زینب غریب کے دل میں صرف ایک ہی خیال وہم یا گمان سمایا ہوا تھا کہ دلاور حسین ایک روز اپنی تمام جائیداد اس کے بچوں کے نام کر دے گا۔ اور یہ خیال یقین کے درجے تک پہنچا ہوا تھا۔ اس لئے وہ دلاور حسین کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنی ہوئی تھی۔ اور کوئی کام بھی اس کی مرضی اور مشورے کے خلاف نہ کرتی۔ اس نے ماماگری کے لئے کہا وہ تیار ہو گئی۔ اس کے لڑکے کو جہاں اُس نے چاہا بھیج دیا۔ لڑکی اسی کے کہنے سے یتیم خانے میں کام کرتی تھی۔ یہ سب کچھ تو تھا لیکن دلاور حسین نے آج تک اسے یا اس کے بچوں کو پھوٹی کوڑی بھی ہاتھ سے نہ دی اور حتیٰ الامکان اس سے الگ تھلگ رہتا۔ بلکہ ماں بیٹی جب سے یتیم خانے میں کام کرنے لگی تھیں وہ ایک طرح سے انہیں بالکل بھول چکا تھا۔ دلاور حسین کے ارادے اور اس کی چالیں نہایت گہری تھیں۔ اس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اسے اپنے مرحوم بھائی سے جو عداوت تھی۔ اس کا انتقام وہ اس کی اولاد اور اس کی بیوہ سے لینا چاہتا تھا۔ مولوی دلدار حسین کے بچے تو غالباً اپنے چچا کی چالوں کو کچھ سمجھتے تھے۔ لیکن ان کی ماں انتہائی سادگی کی وجہ سے اس ظالم کی چالوں کا شکار ہو رہی تھی۔ وقت اسی طرح گزر رہا تھا اور جیسے کہ ہم ابھی ابھی بیان کر چکے ہیں۔ زینب اور اس کی بیٹی شریفہ دونوں یتیم خانہ میں کام کرتی تھیں۔ شریفہ کہنے کو تو پھر بھی استانی کہلاتی۔ لیکن زینب کی حیثیت ایک خادمہ سے زیادہ نہ تھی۔

شہر میں ملیریا کی بہت شکایت تھی اور بیگم کو بھی کئی روز سے بخار آتا تھا۔ یتیم خانے کا چوکیدار کسی حکیم سے دوا لے آتا لیکن بخار پیچھا نہ چھوڑتا۔ زینب ہر وقت تیمارداری میں لگی رہتی۔ یتیم بچوں کا کھانا بھی پکاتی اور بیگم کی دیکھ بھال بھی کرتی۔ بیگم کے بیمار پڑ جانے سے شریفہ کا کام بہت بڑھ گیا۔ دونوں ماں بیٹی عموماً رات کو بھی بیگم کے پاس ہی رہتیں زینب چاہتی تھی کہ کسی ڈاکٹر کو بلوا کر بیگم کا علاج کرایا جائے۔ لیکن بیگم مانتی نہ تھی۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اسے علاج کروانا سرے سے پسند نہیں۔

بیگم کو بخار آئے پندرہ بیس روز ہو چکے تھے وہ بہت کمزور ہو گئی تھی ایک روز رات کا وقت تھا بارش ہو رہی تھی۔ بادل کی گرج اور رعد کی کڑک سے یتیم بچے اپنی چارپائیوں پر لیٹے سہم سہم جاتے۔ بیگم اور زینب ایک کوٹھڑی میں لیٹی ہوئی تھیں۔ دونوں خاموش تھیں۔ بیگم بولی۔

''بوا سو گئیں کیا؟''

''نہیں تو!'' زینب نے جواب دیا۔ ''کہو کچھ کام ہے کیا؟''

'' کام تو کچھ نہیں'' ۔بیگم بولی۔ ''میں نے جانا تم سو گئیں۔ بڑے زور سے پانی پڑ رہا ہے''۔

''ہاں!'' زینب نے جواب دیا۔ ''موسلا دھار بارش ہو رہی ہے''۔

'' بچے غریب خوفزدہ ہو رہے ہوں گے''۔ بیگم نے کہا۔

دیکھ آؤں جا کر؟'' زینب نے پوچھا۔

''نہیں! نہیں!'' بیگم نے کہا۔ ''شائد سو گئے ہوں''۔

''ہاں!'' زینب نے جواب دیا۔ ''سوئے ہوں گے اس وقت تو بچوں کو تو سرِ شام ہی نیند آ جاتی ہے''۔

''بوا !'' بیگم بولی۔ ''ان بچوں کو بھی تو کسی وقت ماں یاد آتی ہوگی۔ کیا گزرتی ہوگی ان کے معصوم دلوں پر''۔

''خدا صبر دے دیتا ہے''۔ زینب نے جواب دیا۔

''خدا صبر تو واقعی دے دیتا ہے تاہم کسی وقت ماں کو یاد تو کرتے ہی ہوں گے''۔

بیگم نے کہا۔ ''ماں کی گود کا آرام تو مرتے دم تک نہیں بھولتا''۔

''ہاں!'' زینب نے جواب دیا۔ ''ضرور یاد کرتے ہوں گے۔ ماں دنیا میں ایک ایسا رشتہ ہے جو یاد آئے بغیر نہیں رہ سکتا''۔

''اور اگر کسی ماں کا بچہ گم ہو جائے یا اُس سے زبردستی چھین لیا جائے تو اس ماں کی بھلا کیا حالت ہوگی۔ کیا گزرتی ہوگی اس کے دل پر''۔ بیگم نے پھر پوچھا۔

''گزرتی کیا ہوگی''۔ زینب نے جواب دیا۔ ''زندہ در گور ہوگئی وہ غریب تو''۔

''بوا !'' بیگم ایک آہ بھر کر بولی۔ ''کتنا ظلم ہے کسی ماں سے اس کا بچہ چھین لینا''۔

''ظلم بھی اور گناہ بھی!'' زینب نے جواب دیا۔

''خاص کر کسی ننھی سی لڑکی کو اس کی ماں سے جدا کر دینا تو ایک ایسا ظلم ہے کہ شائد کبھی خدا بھی معاف نہ کرے''۔ بیگم نے کہا۔ ''کیا خیال ہے تمہارا؟''

''اس میں کیا شک ہے''۔ زینب نے جواب دیا۔ ''خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے میرے ابا جان مرحوم کو وہ فرمایا کرتے تھے کہ اسلام میں لڑکیوں سے محبت کرنا بہت بڑا ثواب ہے۔ کیونکہ لڑکی بیچاری تو ماں باپ کے گھر میں صرف ایک مہمان کی حیثیت رکھتی ہے ایک روز ابا جان مرحوم نے خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ایک ایسا واقعہ سنایا کہ ہماری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی''۔

''کیسا واقعہ؟'' بیگم نے اشتیاق سے پوچھا کسی کی بچی چھن جانے کا؟''

''نہیں!'' زینب نے جواب دیا۔ ''بلکہ بچیوں کو مار ڈالنے کا واقعہ۔ میرے ابا جان خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے بیٹیوں سے بیٹوں سے زیادہ محبت کیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے بیٹی صرف اسی لئے دی کہ مسلمان بھی اپنی بیٹیوں سے بہت محبت کیا کریں۔ یہ تو آپ کو بھی معلوم ہوگا کہ ہمارے حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو اپنی بیٹی حضرت فاطمہؓ سے بے حد محبت تھی۔ جب تک آپ بیاہی نہ گئیں حضور ان کو ایک لمحہ کے لئے بھی آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیتے''۔

''واقعہ کیا ہے؟'' بیگم نے پوچھا۔ زینب بولی۔

''یہ تو تمہیں معلوم ہوگا کہ زمانہ جاہلیت میں عرب کے لوگ اپنی بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالتے تھے۔ ایک روز ایک شخص نے حضور کی خدمت میں عرض کیا کہ یا حضرت مجھ سے ایک ایسا ظلم ہوا ہے۔ جس کے خیال سے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں مدت کی بات ہے میری بیوی کے یہاں بچہ ہونے والا تھا اور مجھے اتفاقاً انہی ایام میں ایک قافلہ کے ساتھ کہیں جانا تھا۔ میں کوئی چار سال بعد جب قافلہ سے واپس لوٹا

تو میں نے گھر میں آتے ہی اِدھر اُدھر دیکھا مجھے کوئی بچہ نظر نہ آیا۔ میں نے بیوی سے پوچھا تو اس نے کہا کہ ٹھہرو میں تمہیں تمہارا بچہ دکھاتی ہوں۔ چنانچہ وہ تھوڑی دیر بعد ایک خوبصورت بھولی بھالی لڑکی کو بہت خوبصورت لباس پہنا کر میرے پاس لے آئی اور بولی لو یہ تمہاری بچی ہے۔ بچی کو دیکھتے ہی میرے چہرے پر شکن پڑ گئے۔ میں نے پھاوڑا اٹھایا۔ اور بچی کو ہاتھ سے پکڑ لیا۔ میری بیوی نے میری چتونوں سے میرا ارادہ بھانپ لیا وہ بہت روئی بہت منتیں کیں اس نے لیکن میں لڑکی کو لے کر گھر سے نکلا اور ایک ریتلے میدان میں اسے بٹھا کر ریت میں گڑھا کھودنے لگا۔ ہوا کے چلنے سے جب ریت میرے چہرہ اور داڑھی کے بالوں پر پڑتی تو وہ بچی اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے میرا چہرہ اور داڑھی کے بال صاف کرنے لگتی۔ آخر میں نے گڑھا کھود کر اس معصوم جان کو گڑھے میں زندہ دبا دیا۔ یہ قصہ سن کر حضور اتنے روئے کہ ریش مبارک آنسوؤں سے بھیگ گئی۔ توبہ ہے کتنے سنگ دل تھے اس زمانہ کے لوگ بھی''۔

''لیکن!'' بیگم بولی۔ ''اس لڑکی کی ماں کو یہ تو معلوم تھا کہ اس کی بچی مر گئی ہے اور اب جیتے جی وہ اسے دیکھ نہ سکے گی۔ لیکن اس ماں کی حالت کیا ہوتی ہو گی جسے اتنا بھی معلوم نہ ہو کہ اس کی بچی زندہ ہے یا مر چکی اور اگر زندہ ہے تو کس حال میں ہے''۔

''واقعی!'' زینب نے جواب دیا۔ ''یہ تو بڑی بھاری مصیبت ہے''۔

دونوں کچھ دیر خاموش رہیں۔ بارش کچھ تھم چلی تھی۔ اور بادل کی گرج بھی پہلے کی نسبت کچھ کم ہی سنائی دیتی۔ بیگم بولی

''جانے! آج نیند کہاں چلی گئی۔ ہزار سونے کی کوشش کرتی ہوں لیکن نیند آتی ہی نہیں''

''میں سر میں تیل لگا دوں''۔ زینب نے پوچھا۔

''تیل لگانے سے کیا ہو گا؟'' بیگم نے ایک آہ بھر کر کہا۔

''نیند آ جائے گی''۔ زینب نے کہا۔ ''سو جاؤ گی''۔

''مجھے تو اس وقت اپنی ایک سہیلی یاد آ رہی ہے''۔ بیگم آہ بھر کر بولی۔ ''یہ ساتھ کھیلنے والوں کی یاد تو کبھی بھلائے سے بھولتی نہیں۔ کیا دن تھے وہ بھی جب نہ کوئی فکر تھا نہ اندیشہ اپنی نیند سونا اپنی نیند اُٹھنا''۔

''کیا گزری تمہاری سہیلی پر؟'' زینب نے پوچھا۔

''تم یہ قصہ سنو گی؟'' بیگم نے جیسے کچھ اشتیاق سے پوچھا۔ ''بڑی غم انگیز داستان ہے بوا؟''

اور زینب نے آہ بھر کر کہا۔

''ابا جان مرحوم خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اکثر کہا کرتے تھے کہ دنیا اور غم میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ نگوڑی دنیا کبھی کسی کا ساتھ نہیں دیتی اور داناؤں نے بھی غالباً اسی لئے یہ کہا ہے کہ دکھیا سب سنسار! کیا کم بختی ہے کہ ہم لوگ خوشی کی گھڑی میں سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ حالانکہ ابا جان مرحوم خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اکثر کہا کرتے تھے کہ دنیا میں وہی شخص آرام سے زندگی بسر کر سکتا ہے جو خوشی میں بھی غم کو یاد رکھے۔ مصیبت تو موت کی طرح انسان کی تاک میں لگی رہتی ہے۔ جب موقع ملا۔ آ دبوچا۔ لیکن خیر تم اپنی سہیلی کی داستان تو کہو۔ کیا گزری تمہاری سہیلی پر؟''

''بوا !'' بیگم نے آہ بھر کر کہا۔''مدت کی بات ہے......''

اور زینب بات کاٹ کر بولی۔

''مدت کی بات ہو یا کیا۔غم کی کہانی کبھی پرانی نہیں ہوتی۔خوشی کے واقعات تو ہوا کے جھونکے کی طرح گزر جتے ہیں لیکن مصیبت کی ایک رات تو سورات کے برابر بھاری ہو جاتی ہے ابا جان مرحوم خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اکثر کہا کرتے تھے کہ غم یا مصیبت کا قصہ کبھی پرانا نہیں ہوتا۔اور غم اور مصیبت میں انسان کو اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرنا چاہئے کیونکہ اللہ کی یاد سے دل تسلی پاتے ہیں تو بوا سچی بات تو یہ ہے کہ اس مصیبت کی گھڑی میں جس طرح اللہ یاد آتا ہے۔جب فراغت تھی کبھی یاد نہ آتا تھا تو خیر! تم تو کوئی مدت کی بات کہنے کو تھیں۔تو کیا ہوا پھر۔معلوم ہوتا ہے بارش کچھ تھم گئی ہے لیکن بجلی تو ابھی تک کوندتی نظر آتی ہے۔تو ہاں! کیا بات ہے مدت کی؟''

بیگم جو اس قسم کی طویل اور بے محل باتیں سننے کی کچھ خوگر ہو چکی تھی بولی۔

''مدت کی بات ہے میں اور میری سہیلی گاؤں میں رہتی تھیں گاؤں میں ہی ہمارا گھر تھا اور میری سہیلی کے والدین گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار تھے۔سینکڑوں بیگھہ زمین نوکر چاکر مال مویشی کسی چیز کی کمی نہ تھی۔گاؤں سے ذرا فاصلہ پر میری سہیلی کے باپ کا ایک بہت بڑا باغ تھا اور باغ میں ایک چھوٹی سی بارہ دری بھی تھی۔ساون رت میں گاؤں کی لڑکیاں باغ میں جھولے جھولتی تھیں۔ہندو مسلمان دونوں میں کوئی فرق نہ تھا۔سب محبت سے رہتے تھے نہ کبھی کوئی فساد ہوتا نہ جھگڑا۔ہندو مسلمان کی دکھ درد میں شامل اور مسلمان ہندو کے دکھ درد کا ساجھی۔آج کی طرح نہیں کہ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہو رہا ہے اور......''

''ارے بوا !'' زینب بات کاٹ کر بولی۔''تم تو شاید سنی سنائی کہتی ہوگی۔لیکن میں نے تو یہ خوفناک تماشے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ہائے توبہ! کس بے دردی کے ساتھ بھائی بھائی کے خون سے ہولی کھیل رہا ہے آج۔ایک روز جو صبح صبح میں اٹھی تو گھر کے سامنے والے میدان میں ایک بوڑھے کی لاش دیکھی۔توبہ ہے میری توبہ! پیٹ کی انتڑیاں باہر نکلی پڑی تھیں اور ایک گدھ ذرا فاصلہ پر بیٹھا للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔معلوم ہوتا تھا کہ بیچارہ صبح کی نماز کو گھر سے نکلا ہوگا جو کسی ظالم نے مار ڈالا۔ابا جان مرحوم خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے کہا کرتے تھے کہ جوانی کے زمانے میں وہ اپنے ہندو دوستوں کے ساتھ ہولی کھیلا کرتے تھے اور رام لیلا کے جلوس میں مسلمان بھی شامل ہوتے تھے۔اور آج ایک یہ زمانہ ہے کہ مسلمان کی مجال نہیں کہ ہندو کے محلے سے گزر سکے اور یہی حال دوسری جانب ہے۔دعا کرو بوا! خدا دونوں کے دل صاف کر دے اور دونوں کو یہ سمجھنے اور سوچنے کی توفیق عطا کرے کہ دونوں جو کچھ کر رہے ہیں آخر اس سے کچھ حاصل بھی!''

''حاصل؟'' بیگم نے جواب دیا۔''پریشانی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔اس وقت تو سب دیوانے ہو رہے ہیں۔لیکن اس ظلم و ستم کا نتیجہ دونوں کو اس وقت معلوم ہوگا جب یہ جوش اُتر جائے گا''۔

''اچھا!'' زینب نے آہ بھر کر کہا۔''دعا کرو بوا خدا وہ دن بھی کرے۔تو ہاں تمہاری سہیلی کے باغ میں گاؤں کی لڑکیاں پینگیں ڈالتی تھیں اور جھولے جھولتی تھیں''۔

''ہاں!'' بیگم بولی۔''سب لوگ محبت اور امن سے رہتے تھے۔میری سہیلی کے باپ کو سب گاؤں والے عزت سے چوہدری جی کہتے تھے

اور چوہدری کی یہی ایک لڑکی تھی جو میری سہیلی تھی"۔

"کیا نام تھا تمہاری سہیلی کا؟" زینب نے پوچھا۔

"نام پوچھ کر کیا کرو گی تم" ۔بیگم نے ایک آہ بھر کر کہا۔"لیکن گھر والے لاڈ پیار سے اُسے رانی کہتے تھے اور یقین مانو تم! شکل وصورت سے بھی وہ بالکل رانی ہی تھی۔ بوٹا سا قد تھا۔مرگ ایسی مست آنکھیں تھیں۔ہنستی یا باتیں کرتی تو معلوم ہوتا منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں گویا۔دولت مند ماں باپ کی اکلوتی لڑکی۔خود ہی اندازہ کرلو کیسے ناز ونعمت سے پرورش ہوئی ہوگی اور کیسی کیسی ناز برداریاں کرتے ہوں گے۔گاؤں میں مدرسہ تو کوئی تھا نہیں اور لڑکیوں کو تعلیم دلوانے کا کچھ ایسا رواج بھی نہ تھا تاہم چودھری نے رانی کو گھر پر ہی کچھ تعلیم دلوا ہی دی تھی......"

زینب حسب عادت بات کاٹ کر بولی۔

"لڑکیوں کی تعلیم کے تو میرے ابا جان مرحوم بھی خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ کچھ ایسے حق میں نہ تھے۔ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ لڑکیوں کے لئے اتنی تعلیم ہی کافی ہے کہ وہ خدا اور خدا کے رسولؐ کے احکام سے واقف ہو جائیں۔ ہمارے قصبے میں جب لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ کھلا تو امی جان نے ہزار چاہا کہ میں بھی سکول جایا کروں۔لیکن ابا جان مرحوم نے خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اماں کی سختی سے مخالفت کی اور مجھے سکول نہ جانے دیا۔اس وقت تو مجھے بھی سکول نہ جانے کا افسوس تھا لیکن بوا! آج سکول کی لڑکیوں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر تو انسان حیرت میں آجاتا ہے اللہ رسول تو یاد نہیں۔ ہاں بناؤ سنگار میں سولہ آنے تاک دیکھ لو۔نماز اور روزے کو تو اب کوئی پوچھتی ہی نہیں۔لیکن کیا مجال جو بناؤ سنگار میں کچھ فرق آئے۔خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ابا جان کو جب انہیں معلوم ہوا کہ مجھے بھی لکھنے پڑھنے کا شوق ہے تو انہوں نے خود ہی مجھے پڑھانا شروع کر دیا اور آج جو دو حرف لکھ پڑھ سکتی ہوں تو یہ سب انہی کا فیض ہے۔اس کے بعد جو کمی تھی وہ مطالعہ سے خود ہی میں نے پوری کر لی۔تو ہاں تم کہہ رہی تھیں کہ تمہاری سہیلی رانی کی گھر پر ہی تعلیم ہوتی تھی۔ میرے خیال میں تو گھر کی تعلیم مدرسہ کی تعلیم سے بہت اچھی ہے۔ان سرکاری مدرسوں میں تو مذہب کو کوئی بھولے سے بھی نہیں پوچھتا۔گھر پر اور نہیں تو کچھ مذہب اور خدا اور رسولؐ کے احکام سے تو کچھ واقفیت ہو جاتی ہے۔ابا جان مرحوم خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اکثر فرمایا کرتے تھے کہ جب سے لوگوں میں بے دینی پھیلی ہے مہر اور محبت رواداری اور تالیف قلوب یہ سب باتیں دنیا بھول گئی ہے اور اسی وجہ سے یہ فساد بھی آپس میں ہوتے رہتے ہیں۔تو ہاں! تم اپنی سہیلی رانی کا قصہ کہہ رہی تھیں۔رانی کی تعلیم بھی اس کے گھر پر ہی ہوتی تھی۔پھر کیا ہوا؟"

بیگم جو یہ طویل تقریر خاموش لیٹی سن رہی تھی بلکہ کچھ اکتا سی گئی تھی بولی۔

"چوہدری اور اس کی بیوی کو ایک بیٹے کی بہت آرزو تھی۔اس لئے وہ پیروں فقیروں کی بڑی عقیدت سے خدمت کرتے۔عموماً بڑی بڑی درگاہوں پر سلام اور حاضری کے لئے جاتے۔رانی اب جوان تھی۔ایک روز گاؤں میں ایک پیر آیا اس کے ساتھ اس کے چیلے بھی تھے۔ جوان خوبصورت آدمی تھے لیکن بہت کم گو۔پیر نے چوہدری کے باغ میں ڈیرہ لگایا جب چوہدری کو خبر ہوئی تو وہ اسی وقت پیر کی خدمت میں حاضر ہوا اور ہاتھ جوڑ کر کہا کہ وہ اس کی مہمانداری قبول کرے۔پیر کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا اور چوہدری چونکہ بہت مالدار آدمی تھا اور حاجت مند بھی تھا اس سے سمجھ لو کہ پیر کی کیسی آؤ بھگت ہوتی ہوگی پیر میں اور کوئی کمال ہو یا نہ ہو۔لیکن ایک کمال ضرور تھا وہ جس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا اس کی آنکھیں

خود بخود جھک جاتیں......"

"یعنی!" زینب نے بات کاٹ کر کہا۔"کسی کو اُس سے آنکھ ملانے کی جرأت نہ ہوتی یہی مطلب ہے نا تمہارا؟"

"یہی!" بیگم نے جواب دیا۔"تو خیر صبح سے شام تک لوگ آتے جاتے رہتے۔عورتوں کو بھی جب فرصت ہوتی وہ بھی آ بیٹھتیں۔لیکن کیا مجال جو پیر کسی سے بات بھی کرے۔اسکے مریدوں میں دو قوال بھی تھے دونوں خوب گاتے تھے لیکن قوالی کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔بیٹھے بیٹھے پیر پر ایک جلال سا آتا۔حالت غیر سی ہونے لگتی۔آنکھیں سرخ ہو جاتیں۔بار بار آسمان کی طرف دیکھتا اور مٹھیاں بھینچ بھینچ کر ہوا میں ادھر اُدھر ہاتھ ہلاتا۔جیسے کوئی کسی کے گھونسے مار رہا ہو۔پیر کے مرید عقیدت مندوں کو وہاں سے پرے ہٹا دیتے اور قوال قوالی شروع کر دیتے اور قوالی کے اثر سے کچھ دیر بعد یہ حالت رفع ہو جاتی اور لوگوں کو بیٹھنے کی اور قوالی سننے کی اجازت مل جاتی۔اسکے مریدوں سے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ پیر پر اس جلال کی حالت میں آسمان کے اسرار ظاہر ہونے لگتے ہیں۔اور شیاطین جو عموماً ٹوہ میں لگے رہتے ہیں ادھر اُدھر سے آ جاتے ہیں تو پیر انہیں مار مار کر پاس سے ہٹا دیتا ہے۔اس قسم کی باتیں سن سن کر اب خود ہی قیاس کر لو کہ گاؤں کے سادہ لوح کسانوں کی کیا حالت ہوگی اور انہیں پیر سے کتنی عقیدت ہو گئی ہوگی"۔

زینب بولی۔

"لیکن بوا! یہ تو تم نے عجیب سی بات سنائی۔میرے ابا جان مرحوم خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اکثر فرمایا کرتے تھے کہ قوالی کا چونکہ روح سے تعلق ہوتا ہے اس لئے قوالی کی تاثیر سے پیروں اور فقیروں پر وجد کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔بلکہ وہ قوالی سنتے ہی اس لئے ہیں کہ دنیا سے ان کا رشتہ ٹوٹ کر خدا سے ہو جائے۔لیکن تمہارے اس پیر کا عمل تو بالکل برعکس نکلا۔لیکن......"

"لیکن!" بیگم نے اس خوف سے کہ کہیں پھر کوئی لمبی تقریر نہ سنی پڑے بات کاٹ کر کہا۔"میں تم سے وہی کہہ رہی ہوں جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا' تو خیر یہ جلال کی حالت گزرنے کے بعد جب پیر اپنی حالت پر آتا تو اس وقت جس شخص پر سب سے پہلے نظر پڑتی اُسی سے پوچھتا مانگ کیا مانگتا ہے"۔اور اس خوش نصیب کو جو کچھ کہنا ہوتا عرض کر دیتا۔اور اس کے جواب میں پیر صرف یہ کہتا۔"دس دن یا پندرہ دن یا بیس روز"۔اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اتنے روز میں تمہاری مراد پوری ہو جائے گی"۔لیکن چوہدری جس کے ہاں سے پیر اور پیر کے مریدوں کا دونوں وقت کا عمدہ سے عمدہ کھانا پک کر آتا تھا ابھی پیر کی نظر کرم کا منتظر ہی تھا اور اب وہ پیر سے زیادہ مریدوں کی خاطر داریاں کرنے لگا۔اور آخر مریدوں نے اسے یہ سبق پڑھایا کہ یوں کام نہیں بنے گا۔تم کو اگر پیر سے کچھ لینا ہے تو پیر کو گھر لے جاؤ۔چوہدری نے اسی طرح کیا اور پیر چوہدری کے یہاں رہنے لگا۔رانی اور اس کی ماں پیر کی خاطر تواضع میں لگی رہتیں اور کبھی کبھی ماں بیٹی پیر کے پاؤں بھی داب دیا کرتیں۔رانی کی ماں سے ایک روز پیر کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کہیں کنبے میں ہی رانی کی سگائی ہو چکی ہے لیکن لڑکا چونکہ بہت ہی بدصورت ہے اس لئے رانی کو پسند نہیں اور خانگی پیچیدگیوں کے باعث رشتہ چھوڑا بھی نہیں جا سکتا۔پیر نے یہ سن کر صرف اتنا کہا کہ رانی کی قسمت میں رانی ہو کر رہنا لکھا ہے۔اس کے بعد نہ جانے رانی اور پیر میں گھر والوں سے چوری چھپے کیا کیا باتیں ہوا کیں۔لیکن ایک روز جو گھر کے لوگ بیدار ہوئے تو رانی موجود نہ تھی اور صرف رانی ہی نہیں بلکہ گھر میں جو نقدی تھی وہ بھی غائب تھی۔پیر کے ڈیرے پر آ کر معلوم ہوا کہ پیر اور اس کا ایک خاص ملازم بھی موجود نہیں۔اس کے چیلوں سے جب پوچھا گیا تو انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔دولت بھی گئی اور عزت بھی۔پولیس میں اطلاع ہوئی پولیس آئی مرید پکڑے گئے۔پولیس نے ہر چند کوشش کی لیکن نہ

پیر کا کچھ پتہ ملا نہ رانی کا...... چوہدری لاج والا تھا۔لاج کی خاطر خودکشی کر لی"۔

"توبہ! توبہ!" زینب بولی۔"پیر تھا یا شیطان' لیکن قصور بھی تو سب رانی کے باپ کا تھا جو اس موئے کو گھر لے گیا۔ابا جان مرحوم خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ گھر میں کبھی کسی غیر آدمی کو ہرگز نہیں لانا چاہئے۔اور بوا! اس زمانے میں اب کوئی پیر ہے کہاں؟ سادہ لوح لوگوں کے لوٹنے کو ڈھونگ رچا رکھا ہے۔شکل وصورت فرشتوں کی کام اور عمل شیطانوں کے۔چوہدری کو اپنے کئے کی خوب سزا ملی۔بیٹی بھی گئی اور جان بھی گنوائی اور وہ بھی حرام۔میرے ابا جان مرحوم خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص خودکشی کرتا ہے وہ اپنی عاقبت خراب کر لیتا ہے۔کیونکہ جان یا زندگی تو انسان کے پاس اس کے خالق کی امانت ہے۔اور انسان کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ اس امانت کی ہر طرح خبر گیری کرے۔تو پھر رانی کا کوئی پتا بھی ملا یا نہیں؟"

"ہاں ملا!" بیگم نے جواب دیا۔"لیکن بہت روز بعد"۔

"گھر واپس آ گئی ہوگی"۔زینب نے پوچھا۔

"گھر؟" بیگم ایک آہ بھر کر بولی۔"گھر کیسے آ سکتی تھی غریب! گھر سے نکل کر پھر قسمت والے ہی گھر دیکھتے ہیں۔رانی کی قسمت میں گھر کا سکھ ہوتا تو گھر سے نکلتی ہی کیوں؟"

"پیر نے اس سے شادی کر لی ہوگی"۔زینب بولی۔"پیر کی بیوی بن کر تو وہ رانی ہی بن گئی ہوگی"۔

"تباہ ہو گئی رانی بیچاری"۔بیگم نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا۔زینب نے جو لیٹی ہوئی تھی"ذرا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔بیگم رو رہی تھی۔زینب آہ بھر کر بولی۔

"سہیلی یاد آ گئی کیا؟"

"ہاں!" بیگم نے ایک لمبا۔سانس لے کر کہا۔"رانی یاد آ گئی' بدنصیب رانی! ہائے توبہ! کیسی بری قسمت لے کر آئی تھی۔رانی اس دنیا میں۔اس سے تو پیدا ہی نہ ہوئی ہوتی"۔

اور زینب نے پھر ایک آہ بھر کر کہا۔

"نہ جانے اس موذی پیر نے کیا کیا منتر پڑھ کر غریب کو رام کیا ہوگا۔لیکن چوہدری کو جان دینے کے بجائے اس ظالم کا کھوج لگا کر اسے کیفر کردار کو پہنچانا چاہئے تھا"۔

"لاج لے ڈوبی غریب کو"۔بیگم نے جواب دیا۔گاؤں والوں کو کیا منہ دکھاتا۔یہی کہتی نا دنیا کہ چوہدری کی بیٹی کسی کے ساتھ بھاگ گئی"۔

"یہ تو سچ ہے"۔ زینب بولی۔"لیکن پیر کو بھی تو کچھ سزا ملنی چاہئے تھی۔میرے ابا جان مرحوم خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے کہا کرتے تھے کہ فتنہ قتل سے زیادہ خوفناک چیز ہے اس لئے فتنہ کو دبانے کے لئے انسان کو اگر کچھ قربانی بھی کرنی پڑے تو گریز نہیں کرنا چاہئے۔مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پیر کوئی بڑا ہی بدمعاش تھا۔نہ جانے کتنے گھروں کو اس طرح تباہ کر چکا ہوگا۔تو ہاں رانی کا پتہ کیسے ملا؟"

''اتفاق سے گاؤں کی ایک عورت سے ملاقات ہوگئی''۔ بیگم نے جواب دیا۔''رانی تو شاید منہ چھپا کر نکل جاتی لیکن اس عورت نے اسے پہچان لیا''۔

''ہاں پہچان لیا ہوگا''۔ زینب نے کہا۔'' کیسے نہ پہچانتی' اپنے گاؤں ہی کی جو تھی۔ دیکھ کر دل پسیج گیا ہوگا۔ دل ہی تو ہے کچھ باتیں بھی ہوئی ہوں گی''۔

''کیا باتیں کرتی غریب'و۔ بیگم نے آہ بھر کر کہا۔''کس منہ سے اپنی تباہی کی داستان سناتی۔ لیکن خاموش بھی کیسے رہتی......''

''ہاں!'' زینب نے ہاں کو لمبا کر کے کہا۔'' کیسے خاموش رہ سکتی تھی۔ گاؤں کی عورت کو دیکھ کر دل بھر آیا ہوگا۔ بھر کیسے نہ آتا۔ گھر اور گھر کا سکھ یاد آ گیا ہوگا غریب کو......دعا کرو بوا! کسی کا گھر برباد نہ ہو''۔

''آمین!'' بیگم نے کہا۔

''وہ نگوڑا پیر بھی ساتھ ہی ہوگا''۔ زینب نے پوچھا۔''اس موئے کی موجودگی میں تو رانی غریب کو بات کرنے کا بھی موقع نہ ملا ہوگا''۔

''بوا''۔ بیگم نے کہا۔'' دعا کرو بیٹا بھی کسی پر نہ پڑے''۔

''آمین!'' زینب نے کہا۔''لیکن وہ عورت کون تھی۔ رانی کی کوئی سہیلی تھی کیا؟''

''گاؤں والیوں کی ایک دوسرے سے جان پہچان تو ہوتی ہے''۔ بیگم نے کہا۔''تو خیر! پیر رانی کو گاؤں سے جب بھگا کر لایا تو اس کے ساتھ اس کا ایک نوکر بھی تھا۔ رات کا وقت تھا۔ گھر والے سوتے تھے۔ پیر نے رانی کے ساتھ پہلے ہی بات پکی کر لی تھی۔ نصف رات سے کچھ پہلے رانی گھر سے نکلی اور جوہڑ کو ہولی۔ یہاں پیر اور اس کا نوکر انتظار کر رہے تھے۔ نوکر دو گھوڑوں کی لگام تھامے کھڑا تھا۔ ایک پر نوکر سوار ہوا۔ ایک پر پیر اور رانی بیٹھے۔ ریلوے سٹیشن گاؤں سے پندرہ سولہ میل تھا۔ تینوں نے سٹیشن کا رستہ لیا۔ ابھی اندھیرا ہی تھا کہ سٹیشن کی بتیاں نظر آنے لگیں۔ تینوں گھوڑوں سے اُترے۔ پیر نے نوکر کو علیحدہ لے جا کر اس سے کچھ باتیں کیں۔ دونوں گھوڑے نوکر لے کر چلا گیا۔ پیر اور رانی تو سٹیشن کو ہو لئے۔ ریلوے سٹیشن پر پہنچ کر دونوں ایک درخت کے نیچے دبک کر بیٹھ گئے۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد نوکر بھی واپس آ گیا۔ اور سٹیشن پر پیر سے ملا۔ ابھی جھٹ پٹا ہی تھا جب گاڑی آئی تو تینوں ٹکٹ لے کر سوار ہو گئے۔ پیر رانی کو ایک گاؤں میں لے آیا۔ گاؤں والے پیر کے بڑے معتقد تھے۔ تین چار مہینے پیر اور رانی اس گاؤں میں رہے......''

''پیر نے رانی سے شادی تو کر لی ہوگی''۔ زینب نے پوچھا۔

''ہاں!'' آپ ہی اپنا نکاح پڑھ لیا اور ایک سپید کاغذ پر حق مہر بھی لکھ دیا۔''لیکن کاغذ اپنے پاس ہی رکھا''۔ بیگم نے جواب دیا۔

''اپنے پاس کیسے نہ رکھتا۔ نیت جو خراب تھی''۔ زینب نے کہا۔''لیکن یہ نکاح بھی تو جائز نہ تھا''۔

''جائز تھا یا ناجائز ہوا یہی''۔ بیگم بولی۔''رانی اور پیر جب تک گاؤں میں رہے۔ لوگ رانی کی بھی عزت کرتے کیونکہ وہ اسے پیر کی بیوی سمجھتے تھے۔ تین چار مہینے بعد پیر رانی کو ایک شہر میں لے آیا اور یہاں اس نے چاء کی ایک دکان کھول لی۔ ایک چھوٹا سا ہوٹل سمجھو تم۔ تھوڑے ہی روز میں ہوٹل کا کام خوب چل نکلا۔ اور غالباً اس کی وجہ رانی تھی......''

''رانی کیسے؟'' زینب نے حیرت سے پوچھا۔ ''رانی تو پردے میں رہتی ہوگی''۔

''نہیں!'' بیگم نے جواب دیا۔ ''رانی پردے میں نہیں رہتی تھی۔ بلکہ ہوٹل میں جو لوگ چائے پینے آتے تھے ان کی خدمت خاطر کرتی تھی۔ اور غالباً اس کا حسن ہی لوگوں کو ہوٹل میں زیادہ تر کھینچ لاتا تھا۔ لیکن رانی اب ماں بننے والی تھی۔ پیرے نے اسے ایک زنانہ ہسپتال میں داخل کروا دیا۔ یہاں رانی کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی۔ رانی جب چلنے پھرنے کے قابل ہوئی تو پیرا اسے ہسپتال سے پھر گھر لے آیا۔ اور رانی پھر پہلے کی طرح ہوٹل میں کام کرنے لگی۔ لیکن وہ اکثر بیمار رہتی تھی۔ پہلے تو صرف رانی ہی ہوٹل میں کام کرتی تھی۔ پھر پیرا دو جوان لڑکیاں اور کہیں سے لے آیا۔ اور ہوٹل کا کام پہلے سے بھی اچھا ہو گیا۔ یہ عورتیں ہوٹل میں آنے والوں سے بے تکلف ملتی تھیں اور رانی کو یہ پسند نہ تھا۔ گو رانی اب ایک بچی کی ماں ہو گئی تھی اور اس کی صحت بھی کچھ ایسی اچھی نہ تھی۔ تاہم ان دونوں لڑکیوں سے اب بھی اس میں زیادہ دلکشی تھی۔ اور ہوٹل میں آنے والے اس کی طرف زیادہ مائل نظر آتے۔ اس لئے پیرا چاہتا تھا کہ رانی بھی آنے والوں سے ان دونوں لڑکیوں کی طرح بے تکلف ملا کرے اور ٹکے کمایا کرے لیکن رانی کو حرام کاری منظور نہ تھی پیرا کبھی کبھی اس غریب پر ہاتھ بھی اُٹھنے لگا۔ لیکن اس پر بھی رانی اپنی ضد پر قائم رہی۔ رانی غریب سے اگر کسی کو کچھ ہمدردی تھی تو وہ پیرا کا نوکر تھا۔ لیکن وہ غریب بھی کیا کر سکتا تھا۔ قرائن سے کچھ ایسا معلوم ہوتا کہ نوکر پیرا سے بہت خائف رہتا ہے۔ تو خیر! وقت اسی طرح گزر رہا تھا اور بچی اب سال بھر کی ہو گئی تھی اور رانی کی صحت بھی پہلے سے اچھی تھی۔ پیرا اپنی ضد سے باز نہ آتا اور اسے حرام کاری پر مجبور کرتا اور رانی اپنی ضد پر قائم تھی اور ہر روز پٹتی تھی۔ آخر ایک روز رانی نے مجبور ہو کر وہاں سے بھاگنے کا ارادہ کیا۔

کوئی تہوار تھا۔ ہوٹل میں خاصی رونق تھی۔ رانی بھی دوسری دونوں عورتوں کے ساتھ کام میں لگی ہوئی تھی۔ پیرا بھی بہت مصروف تھا۔ رانی موقع پا کر ہوٹل سے نکل کر گھر آئی۔ بچی کی دیکھ بھال ایک لڑکا کیا کرتا تھا۔ بچی سو رہی تھی۔ رانی نے لڑکے کو کسی بہانے بازار بھیج دیا۔ لڑکے کے جاتے ہی اس نے بچی کو گود میں لیا اور برقع اوڑھ کر گھر سے نکلی۔ گھر سے تو وہ نکل آئی لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ جائے کدھر۔ پہلے اس نے سٹیشن کو جانے کا ارادہ کیا لیکن اس خوف سے کہ اگر پیرا کو اس کے بھاگ جانے کا علم ہوا تو وہ سب سے پہلے سٹیشن ہی کا رخ کرے گا اس نے لاریوں کے اڈے کی طرف جانا مناسب سمجھا اور کسی سے راستہ پوچھ کر اڈے کو ہو لی۔ لیکن جب اڈے پر پہنچی تو معلوم ہوا کہ لاری کے جانے میں کافی دیر ہے وہ وہیں کہیں دبک کر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی کہ جائے تو کہاں جائے۔ تھوڑی دیر بعد ایک ایک دو دو اور مسافر بھی آنے لگے لیکن وہ غریب اسی طرح سہمی بیٹھی تھی کہ اچانک پیرا اور اس کا وہ ملازم تانگے میں بیٹھے وہاں آ نکلے۔ انہوں نے دور سے ہی اسے دیکھ لیا تھا۔ پیرا خود تو کچھ فاصلے پر کھڑا رہا۔ لیکن نوکر نے پاس آ کر کہا۔

''بی بی! اٹھو گھر چلو!'' رانی اٹھ کر ساتھ ہو لی اور تانگے میں بیٹھ گئی۔ جب تینوں گھر پہنچے تو پیرے نے مار مار کر غریب کو اُتو کر ڈالا۔ رانی خاموش بیٹھی مار کھاتی رہی۔ آخر اس ظالم نے اس سے بچی چھین لی اور اسے گھر سے نکال دیا۔ رات کا وقت تھا۔ بازار تقریباً بند ہو چکے تھے۔ سردی کا موسم تھا اور کچھ بارش بھی ہو رہی تھی۔ رانی نہ شہر والوں میں سے کسی کو جانتی تھی نہ بازاروں سے واقف تھی۔ وہ ایک بازار میں سے گزر رہی تھی کہ اچانک عقب سے ایک تانگہ بھاگتا ہوا آیا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ رانی سنبھل سکے وہ تانگے کی زد میں آ گئی۔ اس کے بعد اسے معلوم نہیں کہ کیا ہوا۔ لیکن جب رانی کو ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ وہ ہسپتال میں ہے اور اس کے سر سینہ اور بازو پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ رانی جب سانس لیتی تو اس کے

سینے میں درد اٹھتا اور وہ آنکھیں بند کر لیتی۔لیکن وہ حیران تھی کہ اسے ہوا کیا اور وہ ہسپتال میں آئی کیسے؟

ایک روز جو وہ صبح اٹھی تو اس نے پاس ہی کہیں کچھ پھل رکھا ہوا پایا۔نرس سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ایک آدمی رات کو اسے دیکھنے آتا ہے۔یہ پھل بھی وہی لاتا ہے۔اچانک رانی کو خیال ہوا کہ وہ کہیں پیر ہی نہ ہو۔چنانچہ وہ اس ٹوہ میں رہنے لگی کہ بھلا دیکھے تو سہی کہ کون اسے دیکھنے آتا ہے۔دو روز گزر گئے لیکن کوئی شخص اسے دیکھنے نہ آیا۔وہ کچھ مایوس سی ہوگئی۔ایک روز اور بھی گزر گیا۔پھر ایک رات جب وہ کچھ سوتی بھی تھی اور کچھ جاگتی بھی تھی اس نے اپنے پاس نرس کو ایک آدمی سے باتیں کرتے سنا لیکن آدمی اندھیرے میں کھڑا تھا اور وہ اسے دیکھ نہ سکتی تھی۔

آخر بہت روز کے بعد وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوگئی۔اور ایک روز نرس نے اس سے کہا کہ صبح اسے ہسپتال سے جانے کی اجازت مل جائے گی۔لیکن رانی اس خبر سے خوش نہیں ہوئی۔وہ حیران تھی کہ ہسپتال سے نکل کر وہ کہاں جائے گی۔کس کے پاس جائے گی؟ آخر جب صبح ہوئی تو ڈاکٹر نے اسے اچھی طرح دیکھا بھالا اور ہسپتال سے جانے کی اجازت دے دی۔اس نے ہسپتال کا لباس اتار کر اپنے وہی کپڑے پہن لئے جن میں وہ ہسپتال آئی تھی۔جب وہ باہر آئی تو پیر کا ملازم تانگہ لئے کھڑا تھا اس کے کہنے سے وہ تانگے پر سوار ہوگئی۔ملازم بھی بیٹھ گیا۔رانی سمجھتی تھی کہ وہ ایک بار پھر شاید اپنے گھر جائے گی۔لیکن تانگہ ایک ایسے محلہ میں جا کر رکا جو اُس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔نوکر نے تانگہ سے اتر کر ایک مکان کے دروازے پر دستک دی۔ایک بڑھیا نے دروازہ کھولا اور رانی کو اتروا کر اندر لے گئی۔تانگے والے کو رخصت کر کے نوکر بھی اندر آ گیا۔رانی کھاٹ پر بیٹھی تھی پیر کا نوکر ایک پیڑھی پر بیٹھ گیا اور بولا۔

''رانی! جو کچھ ہو چکا ہے اسے اب بھول جاؤ۔اس گھر کو اپنا گھر سمجھو۔خدا نے چاہا تو یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی''۔

زینب نے جو اس وقت تک خاموش بیٹھی تھی کہا۔

''آفریں ہے۔بڑا باوفا نوکر نکلا جو اس مصیبت میں اس کی مدد کرتا رہا۔لیکن وہ بڑھیا کون تھی جس کے پاس وہ رانی کو لے گیا''۔

بیگم بولی۔

''وہ بڑھیا اس نوکر کے کسی ملنے والی کی ماں تھی۔تو خیر رانی نے روتے ہوئے نوکر سے پوچھا کہ اس کی بچی کہاں ہے''۔

نوکر نے جواب دیا کہ ابھی تو اسے خود بھی معلوم نہیں کہ اسکی بچی کہاں ہے۔لیکن وہ پتہ لگانے کی کوشش کرے گا۔ان میں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ دروازے پر ایک بار پھر دستک ہوئی۔بڑھیا نے دروازہ کھولا اور ایک جوان آدمی اندر آیا۔یہ اُس بڑھیا کا بیٹا تھا اور اسکا نام شکور تھا'' رانی کو خیال آیا کہ اس نے اس آدمی کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے اور ذرا حافظہ پر زور ڈالنے سے اسے یاد آ گیا کہ یہ شخص دو ایک اور آدمیوں کے ساتھ ہوٹل میں آیا کرتا تھا اور اس کا چال چلن کچھ ایسا اچھا نہ تھا۔یہ جوان آدمی اپنی ماں کے پاس بیٹھ گیا۔

''کہئے! اب مزاج کیسے ہیں؟'' شکور نے ذرا مسکرا کر رانی سے پوچھا۔

لیکن پیشتر اس کے کہ رانی کچھ جواب دے پیر کے نوکر نے رانی سے کہا۔

''رانی تم جوان ہو۔تم نے ابھی دنیا کا کچھ نہیں دیکھا۔تمہیں گھر سے نکال کر پیر کو خیال آیا کہ تم کہیں اس کا بھانڈا نہ پھوڑ دو اس لئے اس نے مجھے تمہاری تلاش میں بھیجا۔لیکن مجھے تم کہیں نہ ملیں۔پیر کو اور بھی فکر ہوا اور اس نے مجھے تاکید کی کہ میں تمہاری تلاش میں رہوں۔تمہیں غالباً یاد

ہوگا کہ میاں شکورا اپنے دو ایک دوستوں کے ساتھ ہوٹل میں آیا کرتے تھے اور تمہیں بھی دوسری عورتوں کی طرح جو ہوٹل میں کام کرتی تھیں ایک آوارہ مزاج عورت ہی سمجھتے تھے۔لیکن انہیں جلد معلوم ہوگیا کہ تم اس ڈھب کی عورت نہیں ہو۔لیکن میاں شکور کو تم سے کچھ لگاؤ سا ہو گیا تھا۔ مجھے ان باتوں کا کیسے علم ہوا۔ یہ مت پوچھو اس وقت یہ تو تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ ہوٹل میں قمار بازی بھی ہوتی تھی۔اور میاں شکور نے بھی بہت سارو پیہ ضائع کیا تھا۔اور آخر ہوٹل میں آنا جانا چھوڑ دیا۔لیکن تمہاری یاد سے کبھی غافل نہیں رہے۔ مجھ سے جب ملتے تمہارا ضرور پوچھتے۔ پھر یہ حادثہ تمہیں پیش آیا اس وقت وہ بازار سے گزر رہے تھے وہی تمہیں اٹھا کر ہسپتال لے گئے اور میاں شکور سے ہی مجھے معلوم ہوا کہ تم ہسپتال میں ہو اس میں کچھ شک نہیں کہ میاں شکور کا چال چلن کچھ اچھا نہیں رہا۔لیکن غلطی انسان سے ہوتی ہے مجھے جہاں تک علم ہے اب یہ بہت سدھر گئے ہیں اور انہیں تم سے محبت ہے۔میرا کہا مانو ان سے نکاح کرلو۔ پیر کے گزند سے محفوظ رہنے کی تمہارے لئے یہی ایک صورت ہے۔گو تم نے دنیا تو نہیں دیکھی لیکن انجان بھی نہیں ہو۔اپنا نفع نقصان تم اچھی طرح سمجھ سکتی ہو۔رہی تمہاری بچی تو میں ابھی ابھی کہہ چکا ہوں کہ مجھے کچھ علم نہیں کہ پیر نے اسے کسی کے حوالے کردیا ہے یا کہیں ٹھکانے لگا دیا ہے۔تاہم میں پتہ لگانے کی کوشش کروں گا۔لیکن پیر کو یہ ہرگز معلوم نہیں ہونا چاہئے کہ تم کہاں ہو اور کس کے پاس ہو"۔

زینب نے جو کئی بار بیچ میں بولنے کی کوشش کر چکی تھی لیکن اسے موقع نہ ملتا تھا۔آخر بولی۔

"اور یہ سب باتیں رانی نے ہی اپنی سہیلی سے کہیں"۔

"ہاں!" بیگم نے جواب دیا۔" اُسی نے"۔

"لیکن تمہیں ان باتوں کا کیسے علم ہوا؟" زینب نے پوچھا۔

"یہ تو تم مت پوچھو مجھ سے!" بیگم نے آہ بھر کر کہا۔"ہو گیا معلوم کسی طرح"۔

"پوری داستان ہے یہ تو"۔زینب بولی۔اور بیگم نے ناک سکتے ہوئے کہا۔

"ایک کی بپتا دوسروں کے لئے داستان ہی بن جاتی ہے"۔

"تو نکاح کرلیا رانی نے شکور سے کیا؟" زینب نے پوچھا۔

"اور کرتی بھی کیا"۔بیگم نے جواب دیا۔"غریب کا کوئی ٹھکانہ بھی تو نہ تھا"۔

"لیکن شکور تو جواری تھا"۔زینب بولی۔"میرے ابا جان مرحوم خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اکثر کہا کرتے تھے کہ جوا کھیلنے کی لت کبھی نہیں جاتی جہاں پیسہ ہاتھ آیا جواری نے جوئے خانے کی راہ لی۔اور بوا! وہ کوروں پانڈوؤں کا قصہ تو تم نے بھی سنا ہوگا۔ضد میں آ کر پانڈوؤں نے بیوی بھی ہاردی"۔

"ٹھیک ہے بوا!" بیگم نے جواب دیا۔"لیکن خدا جب ہدایت دیتا ہے تو سب بری عادتیں چھوٹ جاتی ہیں"۔

"ہاں!" زینب ہاں کو لمبا کر کے بولی۔"یہ تو ٹھیک ہے۔خدا کا فضل ہو تو بگڑے کام بھی سنور جاتے ہیں۔دعا کرو بوا! خدا سب کی مشکلیں آسان کرے"۔

"آمین!" بیگم نے کہا۔اور زینب نے پوچھا۔

''تو رانی نے تو شکور سے نکاح کر لیا۔لیکن بچی کا بھی کچھ پتہ ملا؟''

''نہیں!'' بیگم نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا۔معلوم ہو رہا تھا وہ رو رہی ہے۔زینب بولی

''معلوم ہوتا ہے تمہیں اپنی سہیلی سے بہت محبت تھی۔انسان وہی ہے جس کے دل میں دوسرے کا درد ہو۔میرے ابا جان مرحوم خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ خدا نے انسان کو دوسروں سے محبت کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔جس آدمی کے دل میں دوسرے کا درد ہو آسمانوں پر فرشتے بھی اس کا ادب سے نام لیتے ہیں رانی غریب کی داستان سُن سُن کر اور خاص کر اس کی معصوم بچی کے خیال سے تو میرا سینہ بھی پھٹا جا رہا ہے توبہ ہے!نہ جانے اپنی بچی کی یاد میں غریب پر کیا گزرتی ہو گی''۔

''ہاں!یہی ایک خلش تھی جس نے رانی کو کبھی سکھ کا سانس نہ لینے دیا''۔

''لیکن شکور کے یہاں اسے سکھ تو ملا ہو گا''۔زینب نے پوچھا۔

''ہاں!'' بیگم نے جواب دیا۔''شکور کو رانی سے واقعی محبت تھی اور وہ ہر وقت اس کے آرام کا خیال رکھتا۔شکور کا باپ ایک مدرسہ کا مہتمم تھا اور مدرسہ کا کام بہت وسیع پیمانے پر جاری تھا۔ایک تو شکور کے باپ کی ساکھ بہت اچھی تھی دوسرے مدرسہ کی شہرت بھی بہت تھی۔شکور کو اس کے باپ نے شہر میں بوٹوں کی ایک دوکان کھول دی تھی۔شکور کی دکان بھی خوب چلتی تھی۔لیکن شکور کو قمار بازی کی لت تھی۔کچھ ایسے ملنے جلنے والے بھی اوباش طبیعت آدمی تھے۔اس نے بہت سارو پیہ ضائع کر دیا'اور اسی پیر کا مقروض ہو گیا......''

''پیر کے ہاں جوا جو کھیلتا تھا''۔زینب بولی۔''اسی سے روپیہ قرض لیتا ہو گا۔توبہ ہے میری پیر مت کہو شیطان کہو اُسے تو''۔

بیگم نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''شکور کو امید تھی کہ اس کا باپ اُس کا قرض اتار دے گا۔لیکن اُس نے قرض ادا کرنا تو رہا درکنار اسے گھر سے ہی نکال دیا۔لیکن اس واقعہ کے کچھ روز بعد شکور کے باپ کا انتقال ہو گیا۔شکور کی ماں ایک سمجھدار عورت تھی۔کچھ مدرسہ کے کام سے بھی واقف تھی۔اس نے محلے میں لڑکیوں کا ایک سکول جاری کر دیا۔اور سکول کے ساتھ ایک یتیم خانہ بھی کھول لیا۔متواتر ٹھوکریں کھانے سے شکور بھی سیدھے راستہ پر ہو لیا تھا۔مدرسہ اور یتیم خانہ کے کام میں وہ بھی ہاتھ بٹانے لگا۔جس وقت رانی اس کے نکاح میں آئی اس وقت مدرسہ تو بند ہو چکا تھا صرف یتیم خانہ باقی تھا۔لیکن وہ بھی کچھ برائے نام ہی۔بہرکیف گزر اوقات ہو رہی تھی۔شکور کو اگر کچھ خوف تھا تو پیر کا تھا۔جس کا وہ مقروض تھا''۔

ایک روز شکور اور رانی سینما دیکھنے گئے ہوئے تھے۔پیر بھی وہاں موجود تھا اس نے رانی کو دیکھ لیا۔اس وقت تو وہ خاموش ہو رہا۔لیکن دو روز کے بعد شکور کی گرفتاری کا وارنٹ لے کر سپاہی اس کے مکان پر آ گئے اور اسے گرفتار کر کے لے گئے۔پیر ہی نے اس کے وارنٹ نکلوائے تھے۔اور پیر ہی کی سازش سے شکور کو سزا ہو گئی۔اب گھر میں رانی اور اس کی ساس یہی دو عورتیں رہ گئی تھیں۔ایک روز پیر ان کے پاس آیا اور شکور کی ماں سے کہا وہ رانی سے ملنا چاہتا ہے۔چنانچہ رانی اس سے ملی۔دونوں میں بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔پیر نے رانی کو بہت ڈرایا اور دھمکایا۔اسے خوف تھا تو یہ تھا کہ کہیں رانی نے شکور سے اپنے اغوا کا قصہ نہ کہہ دیا ہو اور یہی رانی سے غلطی ہوئی اگر وہ شکور سے کہہ دیتی تو شکور کی بجائے پیر جیل میں ہوتا۔اب رانی بالکل اس کے بس میں تھی۔لیکن مشکل یہ تھی کہ شکور کی ماں کا جو ایک بڑی عابد اور نیک عورت تھی محلے کے سب چھوٹے بڑے احترام کرتے

تھے اس لئے پیر اسے نقصان پہنچانے سے ڈرتا تھا۔ آخر اُس نے رانی سے یہ وعدہ کیا کہ اگر وہ اپنی زبان بند رکھے گی تو وہ اس کی بچی اسے واپس دے دیگا۔ لیکن یہ وعدہ کبھی پورا نہ ہوا۔ اور رانی نے اس امید سے کسی کو اپنا رازدان نہ بنایا کہ شاید پیر کسی روز اس کی بچی اُسے لا دے گا۔

"اس اثنا میں رانی کو اطلاع ملی کہ شکور کا جیل میں انتقال ہو گیا بیٹے کی موت کی خبر سن کر شکور کی ماں بے تاب ہو کر گری اور گرتے ہی دل کی حرکت بند ہو جانے سے وہ بھی بیٹے سے جا ملی......"

"توبہ توبہ!" زینب بولی۔ "میرے ابا جان مرحوم خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے کہا کرتے تھے کہ مصیبت کبھی اکیلی نہیں آتی۔ اور وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ جب مصیبت کا سامنا ہو تو خدا کو کثرت سے یاد کرنا چاہئے۔ لیکن بوا! یہ تو زمانہ ہی الٹا ہے۔ مجھے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خدا کسی کو یاد ہی نہیں رہا۔ میں جب اپنے گھر والی تھی تو اکثر عورتوں سے میرا ملنا جلنا تھا۔ اچھے اچھے گھرانوں کی عورتوں سے مراسم تھے۔ لیکن کبھی جو مل کر بیٹھنے کا اتفاق ہوتا تو دنیا بھر کی باتیں کر ڈالتیں ایک ذکر نہ ہوتا تو خدا ورسول کا نہ ہوتا۔ سارے شوق پورے کیے جاتے۔ لیکن نماز بھولے سے بھی کسی کو یاد نہ آتی۔ روزوں کے مہینے میں بھی سب بے حجابانہ کھلے بندوں کھاتیں پیتیں۔ ابا جان مرحوم خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اکثر کہا کرتے تھے کہ ہم مسلمانوں پر جو وبال آیا ہے۔ یہ اسلام سے منحرف ہو جانے کی سزا ہے۔ اگر مسلمان مسلمان رہتے تو کبھی غیر کی غلامی میں ان کی گردنیں نہ جھکتیں......"

بیگم نے اس خوف سے کہ نہ جانے یہ تقریر کب ختم ہو بات کاٹ کر کہا۔

"ہم تو اب نام کے مسلمان رہ گئے ہیں۔ دعا کرو خدا ہمیں صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا کرے"۔

"آمین!" زینب نے کہا۔ "خدا ہمیں سچا مسلمان بننے کی توفیق عطا کرے۔ میرے ابا جان مرحوم خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے فرمایا کرتے تھے کہ جب تک ہماری مستورات کے دل میں اسلام کا سچا درد پیدا نہ ہوگا۔ ہمارے بچوں کے دل میں سچا اسلامی جذبہ اور جوش بھی پیدا نہ ہو سکے گا۔ لیکن خیر! وہ وہ رانی کا قصہ تو بیچ میں ہی رہ گیا۔ شوہر اور ساس کے مرنے کے بعد تو وہ غریب بالکل اکیلی ہی رہ گئی"۔

"ہاں بالکل اکیلی!" بیگم نے جواب دیا۔ شکور اور شکور کی ماں کے مرنے کے بعد یتیم خانے کا انتظام ایک کمیٹی کے قبضے میں آ گیا۔ کمیٹی کے ممبروں میں پیر بھی شامل تھا اور جیسے کہ رانی کو بعد میں معلوم ہوا پیر چاہتا تھا کہ رانی کو یتیم خانے سے علیحدہ کر دیا جائے۔ لیکن دوسروں نے اس کی اس تجویز سے اتفاق نہ کیا۔ اور یتیم خانے کا کام رانی کے سپرد کر دیا گیا"۔

"لیکن پیر رانی کو وہاں سے کیوں نکلوانا چاہتا تھا" ۔زینب نے بات کاٹ کر پوچھا۔

"پیر ایک مدت سے رانی کو یہ یقین دلا رہا تھا کہ وہ اس کی بچی کو واپس لانے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن پیر کو اب دراصل خود معلوم نہ تھا کہ بچی ہے کہاں۔ اس لئے وہ رانی سے پنڈ چھڑانا چاہتا تھا" ۔بیگم نے جواب دیا۔

"اب سمجھی!" زینب بولی۔ "اس وقت تک محض بہانے ہی بنا رہا تھا کہ رانی کہیں اس کا بھانڈہ نہ پھوڑ دے۔ لیکن اسے تو معلوم ہوگا کہ بچی کہاں ہے؟"

"پیر کا نوکر کبھی کبھار پیر سے چوری چھپے رانی سے ملنے آیا کرتا تھا۔ اس سے رانی کو صرف اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ پیر نے اس کی معصوم بچی

خانہ بدوشوں کو دے دی تھی۔ لیکن اب اسے معلوم بھی نہیں کہ وہ خانہ بدوش ہیں کہاں؟'' بیگم نے جواب دیا۔

''توبہ ہے!'' زینب آہ بھر کر بولی۔ ''پیر انسان تھا یا بھیڑیا۔ اپنے جگر کا ٹکڑا غیروں کے حوالے کر دیا''۔

بیگم نے کچھ جواب نہ دیا۔ زینب کو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ لحاف میں منہ چھپائے سسکیاں بھر رہی ہے۔ دونوں کچھ دیر خاموش رہیں۔ پھر زینب بولی۔

''میرے خیال میں اتنی مدت گزر جانے کے بعد تو اب رانی غریب بھی اپنی بچی کو پہچان نہ سکے گی''۔

''اپنے جگر کے ٹکڑے کو کون نہیں پہچان سکتا''۔ بیگم نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا۔ ''جب رانی کے ہاں بچہ ہونے والا تھا تو اُس نے سُرمہ سے اپنی کلائی پر ایک چوکلیا پھول سوئی سے گود کر بنایا تھا۔ جب بچی پیدا ہوئی تو ویسا ہی پھول اس کی ننھی سی کلائی پر موجود تھا''۔

کہیں دور سے بادل کی گرج سنائی دی۔

''اب تو رانی کی بچی جوان ہو گی''۔ زینب ایک آہ بھر کر بولی۔ کتنا عرصہ ہو گیا اس بات کو؟''

''سولہ سترہ سال کے لگ بھگ''۔ بیگم نے جواب دیا۔

بجلی بار بار کوندتی تھی اور بادل گرجتا تھا۔ پھر بارش بھی ہونے لگی۔ بیگم کی سسکیاں لینے کی آواز آ رہی تھی اور زینب کو اپنا شریف یاد آ رہا تھا دونوں خاموش تھیں۔



دستاویز

میں نے اس دستِ ستم کار کو دیکھا تو کہا
کاش تجھ پر ترا اپنا ہی غضب ٹوٹ پڑے
قہر اللہ کا تجھ پر کسی ڈھب ٹوٹ پڑے
انگلیاں تیری جھڑیں اور یہ تباہی تھم جائے
تیرا تاریک لہو تیری رگوں میں جم جائے
میں نے اس دستِ ستم کار کو دیکھا تو کہا!

(مجید بھٹی)

دوپہر کا وقت تھا۔دلاور حسین کا ملازم عزیز سٹول پر بیٹھا کوئی اخبار دیکھ رہا تھا کہ کسی نے باہر سے ''شاہ جی'' کہہ کرآواز دی۔لیکن عزیز اسی طرح اخبار لئے گم سم بیٹھا رہا۔باہر سے پھر آواز آئی۔''شاہ جی ہیں؟''لیکن عزیز نے جیسے سنا ہی نہیں۔دلاور حسین نے جو اپنے کمرے میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا دونوں آوازیں سنیں۔پھر وہ اُٹھ کر باہر آیا اور غصے سے بولا۔

''عزیز بہرے ہوگئے کیا؟ پہر بھر سے کوئی آدمی باہر کھڑا چلا رہا ہے اور تم سنتے ہی نہیں''

عزیز نے دو ایک بار آنکھیں جھپکا کر دیکھا اور بولا۔

''میں نے کوئی آواز نہیں سنی''۔

''تم بہرے جو ہوگئے''۔دلاور حسین نے کہا۔'' اُٹھو دیکھو کون ہے؟''

عزیز نے دروازہ کھول کر دیکھا ایک مفلوک الحال آدمی باہر کھڑا تھا۔عزیز کو دیکھ کر بولا

''شاہ جی ہیں؟''

''تم کون ہو؟''عزیز نے پوچھا۔

''مجھے شاہ جی سے ملنا ہے''۔اس نے کہا۔

''میں پوچھتا ہوں تم ہوکون؟''عزیز نے ذرا غصے سے پوچھا۔''کیا کام ہے تمہیں؟''

''مجھے وہ جانتے ہیں''۔اس نے جواب دیا۔

"اُدھر ہوٹل کی طرف جاؤ"۔عزیز بولا۔"وہاں سے کھانے کو کچھ مل جائے گا"۔

"ارے بھائی میں خیرات لینے نہیں آیا"۔باہر والے نے جواب دیا۔

"خیرات لینے نہیں آئے تو پھر آئے کیوں؟"عزیز نے دو ایک بار آنکھیں جھپکا کر کہا۔

اندر سے دلاور حسین کی آواز آئی۔

"عزیز! اے او عزیز!"

عزیز دروازہ بند کر کے اندر گیا۔

"کون ہے؟" دلاور حسین نے پوچھا۔

"مجھے معلوم نہیں"۔عزیز نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

"ابے احمق!" دلاور حسین نے ذرا بلند آواز سے پوچھا۔"کون آوازیں دے رہا تھا تم کس سے باتیں کر رہے تھے؟"

"کوئی بھکاری معلوم ہوتا ہے"۔عزیز نے جواب دیا۔"میں نے کہہ دیا ہوٹل کی طرف جانے کو مل جائے گا۔لیکن وہ کہتا ہے مجھے خیرات نہیں لینی"۔

"چلا گیا کیا؟"

"نہیں!"

"باہر کھڑا ہے کیا؟"

"ہاں!"عزیز نے آنکھیں جھپکا کر جواب دیا۔

دلاور حسین نے کمرے کی ایک کھڑکی کھول کر ذرا باہر جھانکا۔

"یہ کمبخت آج کہاں سے آ گیا؟" کہتے ہوئے اس نے کھڑکی کے پٹ پھر بند کر دیئے۔عزیز بھی باہر جانے کو پلٹا۔

"تم کہاں چلے؟"دلاور حسین نے پوچھا۔

"اسے بُلانے چلا ہوں"۔عزیز نے جواب دیا۔

"کس نے کہا تم سے؟" دلاور حسین نے غصے سے پوچھا۔

عزیز نے دو ایک بار آنکھیں جھپکا کر دیکھا اور کہا۔

"تو کہہ دوں شاہ جی نہیں مل سکتے"۔

"بُلا لاؤ"۔دلاور حسین نے کہا۔

"پیسہ دے دوں"۔عزیز نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں کہہ رہا ہوں بلا لاؤ اسے"۔دلاور حسین نے بلند آواز سے کہا۔

عزیز باہر گیا اور اسے ساتھ لے آیا۔

''شاہ جی سلام!'' اجنبی نے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔

''افضل؟'' دلاور حسین تعجب سے بولا۔ ''میں تو سمجھتا تھا کہ تم مر چکے ہو گے تم کہاں سے ٹپک پڑے؟''

''بشرطیکہ مرنا آسان ہوتا''۔ افضل نے جواب دیا۔

''کیسے آئے تم؟''

''ضرورت کے بغیر کون آتا ہے!'' افضل نے جواب دیا۔

''میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ جب تک تم وہ تحریر نہ لاؤ گے میں پھوٹی کوڑی بھی نہ دوں گا''۔ دلاور حسین نے کہا۔ ''بتاؤ کاغذ لائے؟''

عزیز دروازے کے پاس خاموش کھڑا تھا۔

''عزیز!'' دلاور حسین غصے سے بولا۔ ''تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟''

عزیز نے دو ایک بار آنکھیں جھپکا کر دیکھا اور بولا۔ ''کرسی لاؤں؟''

''باہر جاؤ تم''۔ دلاور حسین نے دروازے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوتے کہا۔

عزیز باہر چلا گیا۔ جس کمرے میں دلاور حسین بیٹھ کر دفتر کا کام کرتا تھا اس کے دو دروازے تھے۔ ایک اندر جانے کا دوسرا غسل خانے کی طرف کھلتا تھا۔ عزیز اندر سے نکل کر غسل خانے کی طرف چلا گیا اور دروازے کی چابی کے سوراخ میں سے دیکھنے لگا۔ اور کان لگا کر سننے لگا۔ دلاور حسین کہہ رہا تھا۔

''میں پوچھتا ہوں کاغذ لائے تم؟''

''میں جب پچھلی بار یہاں آیا تھا تو میں نے آپ سے کہہ دیا تھا کہ وہ کاغذ کہیں گم ہو گیا ہے''۔ افضل نے جواب دیا۔

''تو پھر تم میرے پاس کیوں آئے''۔ دلاور حسین نے پوچھا

''یہ آپ مجھ سے پوچھتے ہیں''۔ افضل نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''سچ ہے امیر آدمی بہت سنگدل ہوتے ہیں''۔

''میں تم سے پھر ایک بار کہے دیتا ہوں کہ جو ہو چکا سو ہو چکا۔ اب پچھلی باتیں تم بھی بھول جاؤ''۔ دلاور حسین غصے سے بولا۔ اور افضل نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''شاہ جی! بعض باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو بھلائے سے بھی نہیں بھلائی جا سکتیں'' پھر جیسے اپنے آپ سے۔ ''وہ اندھیری رات۔ میرا ایک پرانے پڑاوے کی طرف آنا۔ اور ایک معصوم بچی کے چلانے کی آواز۔ پھر ایک آدمی کا میرے پاس سے جلدی جلدی گزرنا اور میرا اسے پکڑ لینا اور اس کا پہلے دھمکیاں دینا۔ پھر منتیں کرنا۔ پھر اس کا مجھے اُس جگہ لے جانا جہاں بچی کے رونے کی آواز آ رہی تھی''۔

''کیا بک رہے ہو تم؟'' دلاور حسین غصے سے بولا۔

''میں آپ سے تو کچھ نہیں کہہ رہا''۔ افضل نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم جو کچھ کہہ رہے ہو سب جھوٹ ہے''۔دلاور حسین نے غصے سے کہا۔''کوئی ثبوت بھی ہے تمہارے پاس؟''

''سب جھوٹ ہے؟''افضل نے ذرا تعجب سے پوچھا۔''کیا کہا آپ نے؟''

''ہاں بالکل جھوٹ!''دلاور حسین نے غصے سے جواب دیا۔نکل جاؤ یہاں سے''۔

''اور وہ پتھروں کا ڈھیر جس کے نیچے وہ معصوم جان چلا رہی تھی۔''افضل بولا۔''وہ بھی جھوٹ ہے کیا؟''

''خاموش رہو''۔دلاور حسین غصے اور خوف سے کانپ کر بولا۔''لاؤ اگر کوئی ثبوت ہے تمہارے پاس''۔

''مجھ سے زیادہ آپ کو معلوم ہوگا''۔افضل نے جواب دیا۔''یاد ہے جب میں نے آپ کو پولیس کی چوکی تک چلنے کو کہا تھا''۔

''مجھے کچھ معلوم نہیں''۔دلاور حسین نے غصے سے کہا۔''جانے کیا بک رہے ہو تم''۔

''آپ کو معلوم نہیں؟''افضل نے ذرا مسکرا کر پوچھا۔''وہ آپ کا پاکٹ بک میں سے ایک کاغذ پھاڑنا اور پنسل سے اس پر کچھ لکھنا......''

''خاموش!''دلاور حسین غضب ناک ہو کر بولا۔''تم مجھے بہت پریشان کر چکے۔اب خیریت اسی میں ہے کہ چپ چاپ یہاں سے چلے جاؤ۔ورنہ......''

''ورنہ!''افضل بات کاٹ کر بولا۔''ورنہ کیا؟''

''جیل!''دلاور حسین نے جواب دیا۔

''جیل تو میرے لئے کوئی نئی جگہ نہیں شاہ جی''۔افضل نے مسکرا کر کہا۔''لیکن ایک شریف آدمی کے لئے شاید موزوں نہ ہو''۔

''گویا تم مجھے دھمکانا چاہتے ہو''۔دلاور حسین نے غصے سے پوچھا۔

''توبہ توبہ!''افضل کان کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔''میں ایسی گستاخی کر سکتا ہوں بھلا؟ گو مجھے آج تک یہ تعجب ہے کہ بیوی کے مرنے سے باپ اپنی معصوم بچی کو زندہ گاڑنے پر کیوں مجبور ہوا؟ آپ کچھ بتا سکیں گے؟''

''بدمعاش خاموش نہیں رہو گے''۔دلاور حسین دانت پیس کر بولا۔''تم حد سے بڑھ چلے''

عزیز جلدی سے غسل خانے سے نکل کر دروازے کی طرف آیا۔اور اندر جھانک کر بولا۔

''آپ نے بلایا تھا؟ کیا حکم ہے؟''

''نہیں!''دلاور حسین نے مشتبہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''تم کہاں تھے؟''

''ذرا اونگھ آ گئی تھی''۔ عزیز نے دو ایک بار آنکھیں جھپکا کر کہا۔

''جاؤ!''دلاور حسین نے انگلی سے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔عزیز نے دروازہ بند کر دیا اور پھر غسل خانے کی طرف چلا گیا۔اور سوراخ میں سے جھانک کر دیکھنے لگا۔دلاور حسین کرسی پر بیٹھا تھا اور افضل میز کے پاس کھڑا تھا۔

''میرا خیال ہے تم مجھے آج تک دھوکا دیتے رہے ہو''۔دلاور حسین نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''لڑکی کہاں ہے؟''

''مجھے معلوم نہیں''۔افضل نے جواب دیا۔

''کیا کہا؟'' دلاور حسین نے غصے سے پوچھا۔ ''لڑکی تمہارے پاس نہیں''۔

''افضل نے جواب دیا۔ ''نہیں''۔

''لیکن تم تو ہمیشہ مجھ سے یہی کہتے رہے کہ لڑکی تمہارے پاس ہے''۔ دلاور حسین نے پوچھا

''شاہ جی!'' افضل بولا۔ ''چار سال تک تو بیشک میرے پاس ہی رہی۔ لیکن اس کے بعد اتنی خوبصورت لڑکی کو اپنے پاس رکھنا مصیبت کے منہ میں جانا تھا۔ انسان کو چھپا کر رکھنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے''۔

دلاور حسین نے ذرا خوفزدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''کیا ہوئی وہ لڑکی؟''

''ایک زمیندار بے اولاد تھا اسے دے دی میں نے!'' افضل نے جواب دیا۔

''کون تھا وہ زمیندار؟'' دلاور حسین نے پوچھا۔

''مجھے معلوم نہیں'' افضل نے جواب دیا۔ ''میری بیوی بیمار تھی۔ میں ایک فقیر کے پاس دعا کے لئے گیا تھا۔ وہ زمیندار بھی مجھے وہاں مل گیا اور میں نے وہ لڑکی اسے دے دی''۔

''کتنا عرصہ ہوا؟'' دلاور حسین نے پوچھا۔

''عرصہ؟'' افضل بولا۔ ''عرصہ تو کچھ یاد نہیں۔ لیکن بارہ پندرہ سال تو ہو ہی گئے''۔

''جھوٹ بکتے ہو تم''۔ دلاور حسین غصے سے بولا۔

''بالکل سچ کہہ رہا ہوں''۔ افضل نے جواب دیا۔ ''مجھے جھوٹ کہنے کی کیا ضرورت؟''

''لیکن تمہیں یہ تو معلوم ہوگا کہ وہ زمیندار کون تھا اور کہاں کا رہنے والا تھا؟'' دلاور حسین نے پوچھا۔

''اگر معلوم ہوتا تو مجھے چھپانے کی کیا ضرورت تھی؟'' افضل نے جواب دیا۔

''تم نے اس زمیندار کو پھر بھی کبھی دیکھا؟'' دلاور حسین نے پوچھا۔

''آپ کو معلوم ہے کہ میں بہت دور کا رہنے والا ہوں اور آج دو سال کے بعد آپ کے پاس آیا ہوں''۔ افضل نے جواب دیا۔ ''اور شاید آج ہی واپس چلا جاؤں''۔

''جب لڑکی تمہارے پاس نہیں تھی تو تم مجھے دھوکا کیوں دیتے رہے؟'' دلاور حسین نے پوچھا۔

''میں نے آپ کو کبھی دھوکا نہیں دیا''۔ افضل نے جواب دیا۔ ''نہ آپ نے مجھ سے کبھی کچھ پوچھا۔ نہ میں نے بتانا کچھ ضروری سمجھا۔ میں آپ کی تحریر کے مطابق آتا تھا۔ آپ روپے دے دیتے تھے''۔

''لیکن تم دھوکے سے مجھ سے لڑکی کی پرورش کیلئے روپے تو لیتے رہے''۔ دلاور حسین نے حقارت سے کہا۔ ''حالانکہ لڑکی تمہارے پاس نہیں تھی''۔

افضل نے معنی خیز نگاہوں سے دلاور حسین کی طرف دیکھا اور کہا۔

''اگر صرف لڑکی کی پرورش کا معاملہ ہوتا تو آپ مجھے روپے کبھی نہ دیتے۔ روپے تو آپ مجھے اس دستاویز کے دیتے تھے جو اس رات آپ نے مجھے لکھ کر دی تھی۔ جب میں نے آپ کو اور بچی کو پولیس کی چوکی پر لے جانا چاہا تھا۔ میں ہوں تو غریب آدمی۔ لیکن شاہ جی یہ دنیا بھی میری دیکھی بھالی ہے۔ خدا نے مجھے کچھ عقل بھی دی ہے۔ آپ نے اپنی عقل سے فائدہ اٹھایا۔ اور میں نے اپنی عقل سے''۔

''اب تم کیسے آئے؟'' دلاور نے پوچھا۔

''سودا کرنے''۔ افضل نے جواب دیا۔

''کیسا سودا؟'' دلاور حسین نے پوچھا۔

''آپ چاہیں تو اپنے معاہدے سے سبکدوش ہو سکتے ہیں''۔ افضل نے جواب دیا۔ پھر ذرا مسکرا کر۔ ''شاہ جی! جب ایک بیوپاری دوسرے بیوپاری کے پاس جاتا ہے تو وہ اس سے اخلاق سے پیش آتا ہے۔ میں پہر بھر سے کھڑا ہوں اور آپ نے ایک بار بھی مجھے بیٹھنے کو نہیں کہا''۔

یہ کہہ کر وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔

''کہئے کیا ارادہ ہے؟''

''کیسا ارادہ؟'' دلاور حسین نے پوچھا۔

''سودا کریں گے آپ؟'' افضل نے پوچھا۔ پھر ذرا مسکرا کر ''یا وہی پہلا دستور چلے گا؟''

''صاف صاف کہو''۔ دلاور حسین نے پوچھا۔

''صاف صاف کہوں؟'' افضل نے ذرا آگے کو جھک کر کہا۔ ''کیا دیں گے آپ اپنی دستاویز کا؟''

''دستاویز کہاں ہے؟'' دلاور حسین نے پوچھا۔ ''پھر چکمہ دینے لگے مجھے۔ لیکن یہ سن لو آج واپس جانے کی بجائے تم جیل میں ہو گے''۔

''شاہ جی!'' افضل نے پھر ذرا مسکرا کر کہا۔ ''میں آپ سے ابھی ابھی کہہ چکا ہوں کہ جیل میرے لئے کوئی نئی چیز نہیں۔ لیکن ایک مشہور ہوٹل کے مالک کے لئے۔ ایک ایسے شریف آدمی کے لئے جو رات کے اندھیرے میں ایک معصوم بچی کو زندہ گاڑ رہا تھا......''

''خاموش!'' دلاور حسین چیں بجبیں ہو کر بولا۔ ''ساتھ ہی عزیز پھر ایک بار غسل خانے سے نکل کر دروازہ کھول کر اور اندر جھانک کر بولا۔

''کیا حکم ہے؟''

''تم کیوں آئے؟'' دلاور حسین نے غصے سے پوچھا۔

''آپ نے جو بلایا تھا''۔ عزیز نے دو ایک بار آنکھیں جھپکا کر کہا۔

''جاؤ''۔ دلاور حسین بولا۔ اور جب تک میں بلاؤں نہیں مت آؤ''۔

عزیز نے دروازہ بند کر دیا اور پھر اپنی جگہ پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ دلاور حسین کہہ رہا تھا۔

''کیسی دستاویز ہے تمہارے پاس؟''

''وہی پاکٹ بک کا ایک کاغذ!'' افضل نے جواب دیا۔ ''جو آپ نے سڑک کے لیمپ کے نیچے کھڑے ہو کر لکھ کر مجھے دیا تھا''۔

''لیکن تم تو کہتے تھے کہ وہ کھوئی گئی''۔ دلاور حسین نے پوچھا۔

''بنج بیوپار میں جھوٹ بولنا ہی پڑتا ہے شاہ جی!'' افضل نے مسکرا کر کہا۔

''کہاں ہے دکھاؤ!'' دلاور حسین نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ دیں گے کیا؟'' افضل نے پوچھا۔

''میں کبھی یقین نہیں کرسکتا کہ پندرہ بیس سال تک ایک معمولی سا کاغذ محفوظ رہ سکے''۔ دلاور حسین غصے سے بولا۔ ''اب ان ہتھکنڈوں سے کام نہیں چلے گا یہاں میں چاہوں تو تمہیں دھوکہ دہی کے جرم میں گرفتار کرواسکتا ہوں''۔

''یہ تو آپ نے سچ کہا کہ آپ مجھے دھوکہ دہی کے جرم میں گرفتار کرواسکتے ہیں''۔ افضل نے جواب دیا۔ ''لیکن قتل عمد کی سزا بھی غالباً آپ کو معلوم ہوگی۔ رہا آپ کا یہ کہنا کہ ایک معمولی سا کاغذ پندرہ بیس سال تک محفوظ نہیں رہ سکتا محض طفل تسلی ہے آپ معاوضہ کا فیصلہ کریں اور اپنی دستاویز لے لیں''۔

''جعلی؟'' دلاور حسین نے طنزاً مسکرا کر کہا۔

''جعلی نہیں اصلی''۔ افضل نے جواب دیا۔ ''وہی پاکٹ بک کا کاغذ اور وہی آپ کے دستخط!''

''اور اگر میں انکار کردوں تو؟'' دلاور حسین نے پوچھا اور افضل مسکرا کر بولا۔

''اول تو مجھے یہ امید نہیں کہ آپ ایسی غلطی کریں گے اور اگر آپ کا یہی فیصلہ ہے تو کل تک اس شہر میں ایک خوفناک جرم کے چرچے ہو رہے ہوں گے اور شاید آپ کو بھی یہ افسوس ہوگا کہ ایک کاروباری آدمی ہوتے ہوئے آپ ایک ایسی غلطی کے مرتکب ہوئے جس سے نہ آن رہی نہ ساکھ''۔

افضل کی دھمکی کام کرگئی۔ دلاور حسین نے جیب سے تجوری کی چابی نکالتے ہوئے پوچھا۔

''اور اگر دستاویز جعلی ہوئی؟''

''تو جو چاہے کیجئے''۔ افضل نے بے پروائی سے کہا۔

پھر دونوں میں معاوضہ کی رقم پر کچھ لے دے ہوتی رہی۔ آخر دلاور حسین نے تجوری کھول کر نوٹوں کا ایک بنڈل نکالا۔ پھر بنڈل کے اوپر کا نوٹ کا نمبر اور آخری نوٹ کا نمبر دیکھ کر کچھ حساب لگایا اور اُس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''میں جو کچھ دے رہا ہوں اس سے ایک کوڑی بھی زیادہ نہ دوں گا۔ نکالو وہ دستاویز''۔

افضل نے جیب سے لکڑی کی ایک ڈبیا نکالی اور ڈبیا کھول کر ایک تہ کیا ہوا چھوٹا سا کاغذ نکالا اور کہا۔ ''شاہ جی! ایک ہاتھ سے روپے دیجئے دوسرے ہاتھ سے دستاویز لیجئے۔ اور اگر آپ کو یہ ڈر ہو کہ میں روپے لے کر بھاگ جاؤں گا تو نوکر سے کہئے کہ باہر سے دروازہ بند کردے''۔

دلاور حسین نے نوٹ دے کر کاغذ لے لیا اور کھول کر بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ یہ اسی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دستاویز تھی۔ اس نے تجوری

کھول کر کاغذوں کے ایک بنڈل میں سے نیلے رنگ کا ایک لفافہ نکالا اور اس میں یہ کاغذ ڈال کر لفافہ تجوری میں رکھ دیا۔

''ہو گئی تسلی شاہ جی؟'' افضل نے مسکرا کر پوچھا۔ ''دستاویز ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں ٹھیک ہے''۔ دلاور حسین نے جواب دیا۔

''تو مجھے اب اجازت ہے''۔ افضل نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''ٹھہرو!'' دلاور حسین بولا۔ ''ایک بات بتاتے جاؤ''۔

''کیا؟'' افضل نے پوچھا۔

اگر وہ لڑکی زندہ ہو تو کوئی ایسی بات بتاؤ جس سے وہ پہچانی جا سکے۔ دلاور حسین نے کہا۔ ''کچھ خدوخال ہی تمہیں یاد ہوں گے''۔

''خدوخال تو مجھے یاد نہیں''۔ افضل نے جواب دیا۔ ''ہاں یہ یاد ہے کہ اس کی کلائی پر سرمہ سے بنا ہوا ایک پھول تھا''۔

''جاؤ''۔ دلاور حسین نے کہا۔

اور افضل دروازے کو ہو لیا۔ عزیز اسی وقت غسل خانے سے نکل کر پھر اپنے سٹول پر آ بیٹھا اور دیوار سے سر لگا کر آنکھیں بند کر لیں جیسے کوئی سو رہا ہو۔ افضل اندر سے نکلا اور دروازہ کھول کر باہر چلا گیا کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا۔ دلاور حسین کرسی پر بیٹھا چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے باہر کو جھانکا۔ عزیز دیوار سے سر لگائے آنکھیں بند کئے سٹول پر بیٹھا تھا۔ دلاور حسین سر ہلا کر بولا۔

''شکر ہے کہ یہ بدمعاش بہرہ ہے!''

اُس نے کرسی سے اٹھ کر کھڑکی کھولی اور بازار کی طرف جھانکنے لگا۔ افضل جا چکا تھا دلاور حسین نے کھڑکی بند کر کے چٹخنی لگا دی اور غسل خانے میں چلا گیا۔ عزیز سٹول پر بیٹھا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا غسل خانے کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنتے ہی وہ سٹول سے اٹھ کر دبے پاؤں اندر چلا گیا۔ سب سے پہلے اُس کی نگاہ تجوری پر پڑی۔ تجوری کے تالے میں چابی لگی تھی۔ اس نے جو تجوری کا ڈھکنا اپنی طرف کھینچا تو وہ کھل گیا۔ آج پہلا موقع تھا جو دلاور حسین تجوری کو بند کرنا بھول گیا تھا۔ تجوری میں ایک طرف نوٹوں کے بنڈل رکھے تھے دوسری طرف کچھ کاغذات پڑے ہوئے تھے اور خطوں کا ایک بنڈل ڈوری سے بندھا رکھا تھا۔ عزیز نے یہ بنڈل اٹھا کر اُس میں سے وہی نیلے رنگ کا لفافہ نکالا اور اس میں جو کاغذ تھے جیب میں ڈال کر لفافہ پھر بنڈل میں رکھ دیا اور تجوری کا دروازہ بند کر کے پھر سٹول پر آ بیٹھا اور دیوار سے سر لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

تھوڑی دیر بعد دلاور حسین غسل خانہ سے نکلا۔ سب سے پہلے اس کی نگاہ چابی پر پڑی۔ وہ کچھ دیر چابی کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے چابی اٹھا کر جیب میں ڈال لی اور دبے پاؤں دروازے کے پاس جا کر باہر جھانکا۔ عزیز اسی طرح دیوار سے سر لگائے ہوئے سو رہا تھا۔

''عزیز!'' دلاور حسین نے آواز دی۔

لیکن عزیز اسی طرح آنکھیں بند کئے بیٹھا رہا۔

''اے عزیز!'' اب ذرا اس نے بلند آواز سے کہا۔ عزیز نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اور سٹول سے اُٹھ کر بولا۔

''آپ نے بلایا تھا؟''

''تمہیں آج کل نیند بہت آنے لگی''۔ دلاور حسین نے کہا۔

''جب سے بہرہ ہوا ہوں کان میں آواز نہیں پڑتی۔ اس لئے نیند آ جاتی ہے''۔ عزیز نے کہا اور دلاور حسین بولا۔

''مجھے دو ایک خط لکھنے ہیں۔ اگر کوئی میرا پوچھے تو کہہ دینا میں موجود نہیں۔ سن لیا؟''

''سن لیا!''

دلاور حسین نے اندر سے دروازہ بند کر لیا اور عزیز پھر اخبار دیکھنے لگا۔

چچا کی کرم نوازیاں؟

خوشی کو دیدۂ تر میں ہمیشہ غم بسر دیکھا
ہر اک آنسو کے قطرے میں تمناؤں کا گھر دیکھا

بیگم کی بیماری طول کھینچ گئی اور آخر جان لے کر ہی رہی۔ یتیم خانہ کمیٹی نے کفن دفن کا انتظام کر دیا۔ جب لاش کو غسل دینے لگے تو زینب نے دیکھا کہ مرحومہ کی کلائی پر سرمہ سے ایک چوکلیا پھول کھدا ہوا ہے اور یہ پھول وہ جب تک زندہ رہی یا جب سے زینب اور شریفہ اس کے پاس آئی تھیں اس نے ہمیشہ چھپا کر رکھا۔ زینب کو حیرت تھی کہ کہیں بیگم ہی تورانی نہ تھی۔ لیکن خیر! بیگم تو قبر میں جا سوئی۔ اور اب پھر ایک بار زینب اور اس کی بیٹی شریفہ کو فکر معاش ہونے لگی۔ گو زینب اور شریفہ یتیم خانے کا کام سنبھال سکتی تھیں لیکن یتیم خانہ کمیٹی نے یتیم خانہ بند کر دیا اور جو یتیم لڑکے اور لڑکیاں موجود تھیں انہیں ایک بڑے یتیم خانے میں منتقل کر دیا۔ زینب اور شریفہ کام سے علیحدہ ہو کر اپنی کوٹھری میں رہنے لگیں۔ شریف کو اُن سے جدا ہوئے دو مہینے ہو چکے تھے۔ کبھی آٹھویں ساتویں اس کی خیر خیریت کا خط آ جاتا۔ زینب ابھی تک اسی خیال میں تھی۔ اتنا اطمینان تو تھا کہ اس کا بیٹا آرام سے زندگی بسر کر رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اسے یہ بھی پورا یقین تا کہ اس کا دیور دلاور حسین اپنی تمام جائیداد اس کے بچوں شریف حسین اور شریفہ کے نام کر دے گا۔ وہی دلاور حسین جو اس دو مہینے میں صرف ایک بار ان سے ملنے آیا تھا۔ وہی دلاور حسین جس نے نہ جانے اپنے مرحوم بھائی کی بیوہ اور بچوں کو ہر طرح سے ذلیل کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ آج بھی اسی فکر میں تھا۔ زینب اور اس کی بیٹی شریفہ کو یتیم خانے سے علیحدہ ہوئے پندرہ بیس روز ہو چکے تھے کہ ایک روز اچانک دلاور حسین کہیں سے آ نکلا زینب بیٹھی ہنڈیا پکا رہی تھی اور شریفہ چولہے کے پاس بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھی۔ لکڑی کی بجائے چولہے میں اُپلے جل رہے تھے۔ وہ آتے ہی ناک بھوں چڑھا کر بولا۔

"ہزار بار سمجھا چکا ہوں کہ یہ فضول خرچی کی عادت اچھی نہیں۔ لیکن تمہاری تو وہی بات ہے کہ رسی تو جل گئی پر بل نہیں گیا۔ خدا جانے تم لوگوں کو کب عقل آئے گی اور کب تک دنیا کے نشیب و فراز تم سمجھ سکو گی"۔

شریفہ اور اس کی ماں نے تعجب سے ایک دوسری کی طرف دیکھا۔ دلاور حسین بولا۔

"شریفہ! تم دونوں ایک دوسری کی طرف کیا دیکھ رہی ہو۔ میں تو تم لوگوں سے عاجز آ گیا۔ تمہارا مرض تو لاعلاج نظر آتا ہے۔ اللہ ہی رحم کرے تم پر"۔

"دلاور حسین!" زینب بولی۔ "کیوں ناراض ہو رہے ہو تم؟ کیا فضول خرچی دیکھی تم نے جس سے تم اتنے بگڑ رہے ہو"۔

"بھابی!" دلاور حسین بولا۔ "مجھے کیا پڑی جو میں تم سے بگڑنے لگا۔ میں تو جو کچھ کہتا ہوں تمہارے ہی بھلے کو کہتا ہوں۔ آگے تم جانو"۔

''آخر کچھ معلوم بھی تو ہو کہ کیا فضول خرچی ہم کر رہے ہیں۔ جس راستے پر تم چلا رہے ہو اسی راہ ہم چل رہی ہیں''۔ زینب نے جواب دیا۔

''بھابی!'' دلاور حسین بولا۔ ''تم دونوں کھانے والی ہو۔ کیا ضرورت ہے کھانا گھر پر پکانے کی ایک چھوڑ بھٹیاروں کی تین دو کانیں تمہارے پڑوس میں ہیں وہاں سے روٹی نہیں آسکتی کیا۔ کیا فائدہ اتنا خرچ اٹھانے سے۔ عقلمند تو وہ ہے جو چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائے''۔

زینب آہ بھر کر بولی۔

''دلاور حسین تم سے گلہ نہیں۔ قسمت ہی یہ سب کچھ دکھا رہی ہے۔ دو پیسے کی دال چڑھا رکھی ہے میں نے اور لکڑی کے بجائے اُپلے جلا رہی ہوں۔ ایک وقت کا پکا دونوں وقت کام آتا ہے (دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے) کبھی وہ دن بھی تھے کہ باورچی پکاتا تھا اور خدمت کے لئے ماما علیحدہ تھی۔ خیر! خدا کا شکر ہے جس حال میں وہ رکھے وہی حال سب سے اچھا ہے۔ یہ تو تم نے ٹھیک کہا کہ بھٹیارے کی دکان پڑوس میں ہے۔ لیکن یہ بھی کبھی سوچا کہ ہمارا یہاں کون ہے جو دونوں وقت دکان رسے پکی پکائی لا دے گا''۔

''خدا نے تمہیں بھی تو ہاتھ پاؤں دیئے ہیں بھابی خود جا کر کیوں نہ لاؤ''۔ دلاور حسین نے جواب دیا۔

''ہم خود جا کر لائیں؟'' زینب نے تعجب سے کہا۔ ''تم چاہتے ہو کہ ہم پردہ دار عورتیں اب بازار بھی جایا کریں''۔

''کیا ہرج ہے بھابی!'' دلاور حسین نے جواب دیا۔ ''برقع بھی تو تمہارے پاس ہے''۔

زینب نے کچھ جواب نہ دیا۔ شریفہ بولی۔

''چچا جان! کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ ہم دونوں بھی شریف بھائی کے پاس چلی جائیں''۔ جب ہمیں محنت مزدوری کر کے ہی پیٹ پالنا ہے تو پھر سب مل کر ہی کیوں نہ رہیں''۔

''یعنی تم یہ چاہتی ہو کہ اسے بھی وہاں سے جواب مل جائے''۔ دلاور حسین نے کہا۔ ''یہی مطلب ہے نا تمہارا۔ میں تو کسی کو روکتا نہیں۔ تم جب چاہو جا سکتی ہو۔ لیکن اگر شریف کو بھی وہاں سے نکال دیا گیا تو پھر میں تمہاری کچھ مدد نہ کر سکوں گا''۔

''مدد کرنے والا تو خدا ہے''۔ شریفہ نے ذرا دبی آواز سے کہا۔

''اگر خدا پر اتنا ہی بھروسہ تھا تو یہاں کیوں آئیں''۔ دلاور حسین غصے سے بولا۔ تمہارے باپ کا کوئی قرض تو مجھے دینا نہ تھا''۔

''دلاور حسین!'' زینب بولی۔ ''بچوں کی بات کا برا نہیں مانا کرتے''۔

''بھابی! میں نے بھی اتنے احسان فراموش بچے آج تک نہیں دیکھے''۔ دلاور حسین نے جواب دیا۔ ''میں تو دن رات تمہارے بچوں کی فکر میں رہوں اور یہ بات کریں بھی تو گستاخی سے کریں''۔

''چچا کو بھائی کی اولاد کا فکر نہ ہوگا تو اور کسے ہوگا''۔ زینب نے ذرا چاپلوسی کرتے ہوئے کہا۔ ''خدا کے بعد ایک تمہارا ہی تو سہارا ہے۔ ان دونوں کے مستقبل کی طرف سے اگر مجھے اطمینان ہو جائے تو میں بھی سکون کا سانس لوں''۔

''جب سے یتیم خانہ بند ہوا ہے۔ میں بھی تو اس فکر میں ہوں کہ تمہارے لئے کوئی مناسب انتظام ہو جائے''۔ دلاور حسین نے جواب دیا۔

''لیکن یتیم خانہ بند کیوں کر دیا گیا؟'' زینب نے پوچھا۔ ''شریفہ اور میں کام نہ چلا سکتی تھیں کیا؟

''کب تک پڑی رہتیں تم وہاں؟'' دلاور حسین نے جواب دیا۔ ''سچ پوچھو تو مجھے تو شریفہ کا وہاں کام کرنا بالکل ناپسند تھا۔ اگر انسان کو مٹی کا تو وہ ہی اٹھانا ہو تو کم از کم بڑا تو اُٹھائے''۔

''پھر کیا سوچا تم نے؟'' زینب نے پوچھا۔

''بھابی!'' دلاور حسین بولا۔ ''میں نے کام تو شریفہ کے لئے ایک سوچ رکھا ہے لیکن......''

''لیکن کیا؟'' زینب نے پوچھا۔

''لیکن بدمزاجی یا تمکنت سے کام نہیں چلے گا''۔ دلاور حسین نے جواب دیا۔ ''اس کے علاوہ میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ تم دونوں ماں بیٹی اور تم دونوں سے زیادہ شریف کہیں اسے اپنی شان کے خلاف نہ سمجھے''۔

''دلاورا'' زینب نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ ''اب چھوڑو یہ باتیں' غریبوں اور بیکسوں کی کیسی شان۔ بے منت کھانے کو مل جائے تو وہی سب سے بڑی شان ہے۔ جس کے دم سے شان تھی جب وہی نہیں رہا تو پھر ان باتوں کا ذکر ہی کیا۔ خدا ان کے ابا جان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے کبھی وہ بھی دن تھے کہ مرحوم انہی دونوں کے چاؤ چونچلوں میں دن بھر لگے رہتے تھے۔ آخری عید پر پان سات سو روپے ان دونوں کے کپڑوں پر خرچ کر ڈالے اور مرنے سے کچھ روز پہلے تو شریف حسین کے لئے موٹر لینے کو کہہ رہے تھے۔ اچھا! خدا زندگی اور صحت دے میرے شریف کو میرا رنڈاپا بھی کٹ جائے گا''۔

''تو پھر کیا صلاح ہے بھابی؟'' دلاور حسین نے پوچھا۔

''مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ تمہارے بچے ہیں جو تم کہو گے انہیں کیا انکار ہو سکتا ہے''۔ زینب نے جواب دیا۔

''بھابی!'' دلاور حسین بولا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ میرا ایک ہوٹل بھی ہے۔ یہاں ہر قسم کے آدمی آتے ہیں لیکن زیادہ تر شریف اور دولت مند۔ کیونکہ دوسرے ہوٹلوں سے میرے یہاں کے اخراجات زیادہ ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ آج کل ایک نئی رسم یہ نکل آئی ہے کہ ہوٹل میں مردوں کی بجائے عورتیں کام کریں۔ اور آج وہی ہوٹل زیادہ پسند کیا جاتا ہے جس کا انتظام عورتوں کے ہاتھ میں ہو۔ دو تین لڑکیاں تو میرے ہوٹل میں بھی کام کرتی ہیں لیکن میں ان لڑکیوں کی نگہبانی نہیں کر سکتا۔ میرے خیال میں اگر شریفہ اس کام میں میرا ہاتھ بٹائے تو میں دوسرے کاموں کی طرف توجہ دے سکوں گا۔ دونوں وقت کا کھانا بھی وہیں کھا لیا کرے گی۔ لیکن دن کے دو بجے سے رات کے دس گیارہ بجے تک وہاں ٹھہرنا ہو گا''۔

''دس گیارہ بجے رات کے وقت اکیلی گھر کیسے آ سکے گی؟'' زینب نے پوچھا۔

''ہوٹل سے کوئی آدمی ساتھ آ جایا کرے گا''۔ دلاور حسین نے جواب دیا۔

''اور میں؟'' زینب نے پوچھا۔

''شریفہ اگر ہوٹل میں کام کرنا پسند کرے تو میرے خیال میں تمہیں پھر کوئی کام کرنے کی ضرورت نہیں''۔ دلاور حسین نے امید دلائی۔

''دلاور حسین!'' زینب بولی۔ ''تم بھی تو گھر میں اکیلے رہتے ہو' کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ وہیں ہمیں بھی ایک آدھ کمرہ رہنے کو دے دو۔ صرف

ایک کمرہ کافی ہوگا"۔

"نہیں، یہ نہیں ہوسکتا"۔ دلاور حسین نے کہا۔ "میں ایک مدت سے اکیلا رہنے کا عادی ہو چکا ہوں۔ اب یہ عادت نہیں بدل سکتی۔ تو شریفہ کو اگر منظور ہو تو کل دو بجے تیار رہے۔ میرا آدمی تانگہ لے کر آجائے گا۔ تانگے کا کرایہ بھی میں دے دیا کروں گا"۔

"رات کے وقت تانگے کا انتظام نہ ہو سکے گا کیا؟" زینب نے پوچھا۔ "جوان لڑکی کا اتنی رات گئے بازاروں میں چلنا ٹھیک نہیں"۔

"تانگے کا انتظام تو ہر وقت ہو سکتا ہے لیکن میں تو صرف صبح کا کرایہ دے سکوں گا"۔ دلاور حسین نے خشک سا جواب دیا۔

زینب غریب اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔ دلاور حسین نے کہا۔

"بظاہر تو ہوٹل کا کام کچھ ایسا شریفانہ کام نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن میرے مدنظر صرف ہوٹل کی لڑکیوں کی نگرانی ہی نہیں بلکہ......" اتنا کہہ کر وہ رک گیا۔ زینب نے سر اٹھا کر کچھ متجسسانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ دلاور حسین بولا۔

"بھابی! میں ابھی ابھی تم سے کہہ چکا ہوں کہ ہوٹل میں بہت شریف اور دولت مند آدمی بھی آتے ہیں۔ شاید کسی وقت کوئی اچھا بر بھی مل جائے۔

زینب غریب کے چہرے پر کچھ رونق سی آ گئی اور دلاور حسین نے پھر کہا۔ "میں کچھ ایسے وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن کچھ روز ہوئے ایک لڑکی کو ایک بہت ہی اچھا شوہر مل ہی گیا تھا۔ حالانکہ وہ کچھ ایسی خوبصورت بھی نہ تھی"۔

اور زینب آہ بھر کر بولی۔

"بیٹی تو خدا نے چاند جیسی دی تھی لیکن قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے"۔

"بھابی! انسان اپنی قسمت کا خود مالک ہے"۔ دلاور حسین چارپائی پر سے اُٹھتے ہوئے بولا۔

"بس چل دیئے کیا؟" زینب نے پوچھا۔

"ہوٹل کا کام ہی کچھ ایسا ہے کہ کسی غیر آدمی پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا"۔ دلاور حسین نے کہا۔ "ہاں! ایک بات میں کہنی بھول گیا۔ شریفہ جب ہوٹل میں آئے تو لباس بھی اچھا پہن کر آئے۔ لباس سے انسان کی عزت ہوتی ہے"۔

"یہ تو ٹھیک ہے کہ لباس سے انسان کی عزت ہوتی ہے لیکن شریفہ غریب کے پاس تو یہی دو ایک ہر وقت کے پہننے کے جوڑے ہیں"۔ زینب نے جواب دیا۔

"یوں تو کام نہیں چلے گا"۔ دلاور حسین بولا۔ "اور نہیں تو دو ایک ساڑھیاں تو ضرور ہونی چاہئیں"۔

زینب شریفہ کی طرف دیکھ کر بولی۔ "خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اس کے ابا کو۔ دو ایک بار جب بمبئی گئے تو وہاں سے اس کے لئے ہمیشہ خوبصورت کپڑے لاتے تھے اور ایک بار تو ایسی خوبصورت ساڑھیاں لائے کہ انہیں دیکھتے طبیعت سیر نہ ہوتی کبھی وہ دن تھے کہ دن میں دو دو بار ساڑی بدلتی تھی اور آج قسم کھانے کو بھی ایک نہیں"۔

"ایک آدھ منگوا لو بازار سے"۔ دلاور حسین نے کہا۔

''تم ہی منگوا دو''۔ زینب نے ذرا مسکرا کر کہا۔

''تو روپے دے دو''۔ دلاور حسین نے کہا۔ ''یا یوں کرو کہ میں اپنے آدمی کے ہاتھ دو ساڑھیاں بھجوا دوں گا اسے قیمت دے دینا''۔

''کتنے میں آئینگی؟'' زینب نے پوچھا۔

''معمولی سی سوڈیڑھ سو میں دو آ جائیں گی''۔ دلاور حسین نے جواب دیا۔

''سوڈیڑھ سو میں کہاں سے لاؤں گی''۔ زینب بولی۔ ''تم بھی تو چچا ہو کوئی بڑی بات نہیں جو تم اپنی بھتیجی کو اپنے پاس سے لے دو''۔

دلاور حسین بولا۔ ''جب تم بیس روپے ماہوار کے کرایہ پر مکان لے سکتی ہو تو بیٹی کی ضرورت کے لئے سوڈیڑھ سو خرچ کرنے سے کیوں گریز کر رہی ہو آخر تمہارے پاس روپے ہوں گے ہی جو تم نے مکان کرایہ پر لیا تھا اور اگر میں منع نہ کرتا تو میرے خیال میں تم ابھی تک وہیں ہوتیں خیر! میں کوشش کروں گا کہ سو روپے میں دو ساڑھیاں مل جائیں''۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

دلاور حسین کے جانے کے بعد زینب نے بیٹی سے کہا۔ ''تمہارا چچا ہے تو بڑا خشک مزاج لیکن دل کا برا نہیں۔ خدا کرے جو کچھ وہ کہتا ہے ویسے ہی ہو''۔

''اماں!'' شریفہ بولی۔ ''لیکن چچا جو کچھ کہتا ہے تم نے سوچ بھی لیا۔ یاد ہے تمہیں ہم نے ایک بار ابا جان مرحوم کے ساتھ ایک ہوٹل میں کھانا کھایا تھا اور جوان لڑکیاں کھانا کھلانے پر مامور تھیں یاد ہے ابا جان نے ان لڑکیوں کو دیکھ کر کیا کہا تھا وہ تو انہیں بازاری عورتوں سے بھی برا سمجھتے تھے اور تم بلا سوچے سمجھے ہر کام میں حامی بھر لیتی ہو۔ شریف بھائی کو بھی میرا ہوٹل میں جا کر کام کرنا کبھی پسند نہ ہوگا کم از کم خط لکھ کر اس سے تو پوچھ لو''۔

''میرا شریف بہت سمجھدار لڑکا ہے شریفہ! اسے کیا اعتراض ہو سکتا ہے''۔ زینب نے جواب دیا۔

''تم یہ باتیں ابھی نہیں سمجھ سکتیں لیکن تمہارے چچا کی چالیں میں خوب سمجھتی ہوں۔ آج وہ تمہیں ہوٹل میں کام کرنے کو کہہ رہا ہے خدا نے چاہا تو کسی روز ہوٹل کے مالک بھی تم دونوں بھائی بہن بنو گے۔ اپنا مطلب حاصل کرنے کو اگر کسی کی کڑوی کسیلی بھی سننی پڑے تو سن لینی چاہئے''۔

''اماں!'' شریفہ بولی۔ ''کبھی یہ خیال دل سے نکالو گی بھی تم۔ اپنے گھر میں ایک کمرہ ہمیں دینا تو اسے گوارا نہیں اور تم ہوٹل کا مالک بننے کے خواب دیکھ رہی ہو۔ پھر کیا ٹکا سا جواب ملا تمہیں جب تم نے اُسے اپنے پاس سے ساڑھیاں لے دینے کو کہا''۔

ماں بیٹی میں کچھ دیر اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں اور آخر ماں نے بیٹی کو چچا کی بات مان لینے پر آمادہ کر ہی لیا۔ اسی روز دلاور حسین کا آدمی دو ساڑھیاں لے کر آیا اور دونوں کی قیمت کے روپے لے کر چلا گیا۔

ہوٹل

خوشی کے رات دن گئے سرور و کیف چھن گئے
ندامتوں کی چوٹ کھا رہی ہے زندگی مری

گرین ہوٹل جس کا مالک دلاور حسین تھا۔ ہوٹل بھی تھا اور فیشن ایبل قمار خانہ بھی اور قحبہ خانہ بھی۔ شہر کے مشہور ہوٹل میں شمار ہوتا تھا۔ دلاور حسین کے چونکہ شہر کے حکام سے اچھے مراسم تھے اس لئے اس ہوٹل کے رازہائے دروں پر ایک پردہ سا پڑا رہتا تھا اور دلاور حسین کی ساکھ بھی اچھی تھی۔ دلاور حسین کی دنیا' دلاور حسین کا ایمان اور مذہب جو کچھ تھا جیسے کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں پیسہ تھا۔ اسے پیسہ چاہئے تھا۔ اس سے اُسے کچھ غرض نہ تھی کہ پیسہ حاصل کرنے کے لئے اسے کیا کچھ کرنا ہوگا۔ شریفہ کو جب سے اس نے دیکھا تھا اُس نے اس معصوم لڑکی سے بھی فائدہ اٹھانے کا ارادہ کرلیا تھا۔ اس کی چالیں' اس کے فریب اس کی مکاریاں کوئی شخص نہیں سمجھ سکتا تھا۔ شریفہ کے حسن اور جوانی سے فائدہ اٹھانے کے لئے پہلی چال وہ یہ چلا کہ شریفہ کے بھائی شریف حسین کو جو ایک خوددار جوان تھا راستہ سے ہٹادیا۔ پھر اس کی ماں کو ماما گیری کا کام کرنے پر مجبور کیا۔ اور شریفہ کو یتیم خانے کی خدمت پر لگوادیا۔ مطلب یہ تھا کہ ماں بیٹی جو امیرانہ انداز سے زندگی بسر کرنے کی خوگر تھیں انہیں ذلیل کام کرنے کی عادت ڈالی جائے اور اتنا ذلیل کیا جائے کہ ذلت کا احساس بھی نہ رہے اور اس وقت تک وہ اپنی چالوں میں برابر کامیاب ہو رہا تھا۔ شریف حسین اور اس کی بہن شریفہ دلاور حسین کی چالوں کو کچھ نہ کچھ سمجھتے تو تھے لیکن ماں کے سامنے ان کی کچھ نہ چلتی۔ انہیں بچپن سے ہی والدین کی تابعداری کی تعلیم دی گئی تھی۔ ادھر ان کی ماں تھی جس کے دل و دماغ پر یہ خیال چھایا ہوا تھا کہ دلاور حسین جو کچھ کر رہا ہے ان دونوں کے بھلے کو کر رہا ہے اور ایک روز اس کے بچے دلاور حسین کے وارث ہوں گے۔ اس کا یہ خیال صرف یقین ہی نہیں بلکہ ایمان کے درجے تک پہنچ چکا تھا۔ اور دلاور حسین کی چالیں زینب کی اسی کمزوری کی وجہ سے کامیاب ہو رہی تھیں۔ لیکن وہ ایک ایسا تجربہ کار اور مردم شناس شاطر تھا کہ اس کی مکروہ چالیں بھی دیکھنے والوں کی نگاہوں میں محاسن بن کر نظر آتی تھیں۔

اگلے روز دلاور حسین کا نوکر تانگہ لے کر سرائے پر آیا۔ شریفہ پہلے ہی تیار بیٹھی تھی ساڑی جو آج اس نے پہن رکھی تھی گو کچھ ایسی خوبصورت تو نہ تھی پھر بھی اس کے حسن کی تابانیاں مہر نیمروز کی درخشانیوں سے کچھ کم نہ تھیں۔ شریفہ جس وقت ہوٹل میں پہنچی دلاور حسین ہوٹل میں کام کرنے والی لڑکیوں سے باتیں کر رہا تھا۔ شریفہ پاس جا کر اور ماتھے تک ہاتھ لا کر بولی۔

"چاچا جان! آداب عرض!"

دلاور حسین کے ماتھے پر شکن پڑ گئے۔ دوسریوں نے ایک قہقہہ لگایا اور ان میں سے ایک جو بہت شوخ تھی ہنس کر بولی۔

''شاہ جی! آداب عرض! لیجئے آپ کی ایک بھتیجی بھی آ گئی''۔

دلاور حسین بھی مسکرانے لگا اور شریفہ کچھ تعجب سے سب کی طرف دیکھنے لگی۔

''اب تم سب جاؤ''۔ دلاور حسین بولا۔ ''مجھے شریفہ سے کچھ باتیں کرنی ہیں'۔

''نو گرفتار ہے کوئی''۔ اُس پہلی نے جس کی رگ رگ میں شوخی بھری ہوئی تھی مسکرا کر کہا۔ اور ایک اور بولی۔

''بے موسم کا شریفہ آج ہی دیکھا''۔

''میں کہہ رہا ہوں تم جاؤ سب''۔ دلاور حسین نے پھر کہا۔

''آؤ بھئی آؤ''۔ پہلی نے کہا۔ ''شاہ جی نے کوئی منتر پڑھنا ہوگا''۔

سب چلی گئیں۔ دلاور حسین بولا۔

''شریفہ! بیٹھ جاؤ''۔

شریفہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی نرگسی آنکھوں میں اس طرح آنسو چھلک رہے تھے جیسے کنول کی کٹوریوں میں شبنم کے موتی۔

''شریفہ! تمہیں ان لڑکیوں کی بات کا برا نہیں ماننا چاہئے''۔ دلاور حسین بولا۔ ''ہوٹلوں میں عام طور پر گھٹیا قسم کی لڑکیاں کام کرتی ہیں۔ تم اگر ان سے گھل مل جانے کی کوشش کرو گی تو وہ تمہیں کبھی پریشان نہیں کریں گی کیونکہ تمہیں انہی لڑکیوں سے مل کر کام کرنا ہے۔ تم ان سے خندہ پیشانی سے پیش آؤ گی تو وہ سب باتیں تمہیں سمجھا دیں گی اور اگر تم اُن سے علیحدہ علیحدہ رہیں تو پھر تمہیں بہشت مشکل کا سامنا ہوگا''۔

''چا جان! شریفہ ساری کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''لیکن مجھے تو ان لڑکیوں سے بات کرنا بھی گوارا نہیں اور آپ مجھ سے کام کرنے کو کہہ رہے ہیں''۔

''شریفہ! دلاور حسین ذرا ناراضگی سے بولا۔ ''میں تو تمہیں بہت عقلمند سمجھتا تھا لیکن تم تو بہت ہی بیوقوف نکلیں۔ کسی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تم میری بھتیجی ہو اور میں تمہارا چچا ہوں۔ جیسے اور لڑکیاں مجھے شاہ جی کہتی ہیں تمہیں بھی اگر مجھ سے کچھ کہنا ہو تو شاہ جی کہا کرو مجھے یہ فضول رشتہ داریاں بالکل پسند نہیں اور مجھے امید ہے کہ آئندہ اس بات کا خاص طور پر خیال رکھو گی۔ اب مجھے تم سے ہوٹل کے کام کے متعلق کچھ کہنا ہے۔ ہوٹل میں نہ شرافت کام آتی ہے نہ خاموشی۔ ہوٹل میں جو لوگ آتے ہیں تفریح کے لئے آتے ہیں اور یہ تفریح کیا ہوتی ہے۔ ہوٹل میں کام کرنے والیوں سے ہنسی مذاق! اور ہوٹل میں وہی لڑکیاں اپنا مستقبل بنا سکتی ہیں جو ہنسی مذاق کا جواب ہنسی مزاق سے دیں۔ میرا خیال ہے کہ شروع شروع میں تمہیں یہ کام شاید ناپسند ہو لیکن مجھے یہ بھی امید ہے کہ تم چونکہ سمجھدار ہو اس لئے تم ہوٹل کے کام سے جلدی مانوس ہو جانے کی کوشش کرو گی۔ اگر کوئی شخص تم سے کہے کہ آؤ میرے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤ یا چائے پیو تو تم اسے اپنی خوش قسمتی سمجھو کیونکہ اس طرح دوسروں کی نگاہ میں بھی تمہاری قدر و منزلت بڑھ جائے گی۔ ہوٹل میں لوگ شراب بھی پیتے ہیں اور کبھی کسی لڑکی کو بھی پاس بٹھا لیتے ہیں اور لڑکی سے ساقی گری کا کام لیتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے کر سکو گی اس سے تمہیں ہر دلعزیز بننے کے سوا کچھ مالی فائدہ بھی ہو جایا کرے گا۔ لیکن ایک بات میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ ہوٹل میں جو چیز کبھی پسند نہیں کی جاتی وہ ہوٹل میں کام کرنے والوں کی خشک مزاجی یا تمکنت ہے اس سے ایک تو ہوٹل کے کاروبار کو نقصان پہنچتا ہے

دوسرے ایسے شخص کوخواہ وہ مرد ہوعورت کوئی پسند نہیں کرتا۔ ہوٹل میں جو لوگ تم سے ملیں گے ان کی سب سے بڑی خواہش یہی ہوگی کہ تم ان سے بے تکلف ہو جاؤ۔ بے تکلفی ایک قسم کا آرٹ ہے اور یہ آرٹ سیکھنے میں تمہیں ہوٹل کی دوسری لڑکیوں سے بہت مدد ملے گی۔ ان سب لڑکیوں سے مراسم پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ لیکن ایک بات تمہیں اور بھی نہیں بھولنی چاہئے ان لڑکیوں میں آپس میں بہت رقابت ہوتی ہے۔ کیونکہ جو لوگ باقاعدہ طور پر یعنی ہر روز ہوٹل میں آتے ہیں ان کی کوئی نہ کوئی منظور نظر ہوتی ہے اور کسی کا منظور نظر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں سے زیادہ مالی فائدہ ہو۔ اس لئے تمہیں اس بات کا خاص خیال رکھنا ہوگا کہ اگر تمہیں بھی کبھی خوش قسمتی سے ایسا موقع مل جائے تو دوسریوں سے ذرا احتیاط رہنا۔ یہاں ایک دوسری کی ٹوہ میں لگی رہتی ہے اور بات کا بتنگڑ بنتا ہے۔ چہ میگوئیاں ہوتی ہیں۔ فقرے کسے جاتے ہیں۔ مذاق اور عموماً بیہودہ مذاق کیا جاتا ہے لیکن ان سب کا ایک ہی علاج ہے۔ اس کان سنی اس کان اڑا دی۔ اگر کوئی شخص تم سے سینما چلنے کو کہے تو یاد رکھو تمہاری اس سے خواہ کتنی ہی بے تکلفی کیوں نہ ہو میری اجازت کے بغیر کبھی حامی مت بھرو۔ یہ موٹی موٹی سی باتیں ہیں جو میں نے تمہیں سمجھا دی ہیں۔ شروع کے دو چار روز تو شاید تمہیں کچھ دوبھر معلوم ہوں لیکن اس کے بعد تم دیکھو گی کہ یہاں کی فضا کتنی خوشگوار اور پر لطف ہوتی ہے اور یہ ہرگز مت بھولنا کہ یہاں نہ تم میری بھتیجی ہو نہ میں تمہارا چچا ہوں''۔

شریفہ خاموش بیٹھی اس گرگ باراں دیدہ کی باتیں سن رہی تھی۔ رہا یہ کہ ان باتوں کا اس پر اثر کیا ہوا۔ اس کی غمازی اس کی آنکھیں کر رہی تھیں۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور وہ بار بار ساری کے پلو سے آنسو خشک کرتی تھی۔ لیکن دلاور حسین کو جیسے کچھ خبر ہی نہ تھی۔

دلاور حسین ایک دو بار کھانس کر بولا۔

''شریفہ! مجھے امید ہے کہ جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے تم اسی طرح عمل کرو گی۔ لیکن......''

''لیکن!'' شریفہ بات کاٹ کر بولی۔ ''چچا جان آپ......''

اور دلاور حسین بات کاٹ کر ذرا غصے سے بولا۔

''پھر وہی چچا جان!' میں ابھی ابھی تم سے کہہ چکا ہوں کہ اس ہوٹل میں نہ تم میری بھتیجی ہو اور نہ میں تمارا چچا۔ یہ سب تمہاری ماں کی نالائقی ہے جس نے نہ جانے تم سے کیا کہہ رکھا ہے جو تم بات بات میں قرابتداری جتانا ضروری سمجھتی ہو۔ جس طرح اور لوگ مجھے شاہ جی کہتے ہیں تم نہیں کہہ سکتیں کیا؟''

''لیکن میں پوچھتی ہوں۔ آپ جو کچھ مجھ سے چاہتے ہیں کیا کوئی شریف لڑکی ایسا کر بھی سکتی ہے؟'' شریفہ نے ساڑی کے پول سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''جانے یہ شرافت کی کتھا کب تک تم رٹے جاؤ گی''۔ دلاور حسین نے غصے سے جواب دیا'' کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کوئی کام اپنی خوشی سے کرتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جنہیں ضرورت مجبور کرتی ہے اور ضرورت کے وقت سمجھدار آدمی شافت کو چھپر پر رکھ دیتا ہے۔ ہوٹل میں جو لڑکیاں کام کرتی ہیں آخر یہ بھی تو شریف زادیاں ہی ہیں۔ تمہاری شرافت کے اگر کوئی سرخاب کا پر لگا ہے تو یہ مجھے معلوم نہیں۔ یہ رونا دھونا موقوف کرو۔ اب لوگوں کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ جس طرح دوسری لڑکیاں کریں اسی طرح تم بھی کرو''۔

''لیکن آپ نے تو اماں سے کہا تھا کہ مجھے ہوٹل میں کام کرنے والی لڑکیوں کی دیکھ بھال کرنی ہوگی'' ۔شریفہ نے کہا۔''جب تک تمہیں یہ معلوم نہ ہو کہ ان لڑکیوں کے ذمہ کیا کام ہیں تم دیکھ بھال کیسے کرسکتی ہو۔ جب تم کام سیکھ لوگی تو پھر دیکھا جائے گا'' ۔دلاور حسین نے جواب دیا۔''یہ کام کچھ ایسا مشکل نہیں۔ جو آدمی آئے اس سے پوچھو کہ اسے کیا چاہئے جو کچھ وہ مانگے باورچی سے جا کر کہو وہ سب انتظام کردے گا۔تم ٹرے اُٹھا کر گاہک کے پاس لے جاؤ اور سلیقہ سے سب چیزیں میز پر رکھ دو۔اور اگر وہ تمہیں اپنے پاس بٹھانا چاہے تو اس کے پاس بیٹھ جاؤ اور ہر ممکن طریقے سے اسے خوش کرنے کی کوشش کرلو بتاؤ یہ کون سا مشکل کام ہے''۔

شریفہ غریب کیا جواب دیتی۔

وقت گزر رہا تھا اور شریفہ ہوٹل میں کام کررہی تھی اور جہاں تک لوگوں کی خدمت کا تعلق تھا وہ دوسری لڑکیوں سے کچھ زیادہ ہی خوش اسلوبی سے کرتی اور دلاور حسین یہ معلوم کرکے دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ جب سے شریفہ ہوٹل میں آئی ہے ہوٹل کی رونق اور آمدنی بڑھ رہی تھی۔ ہوٹل میں ایک تو لوگوں کے بیٹھنے کا عام کمرہ تھا۔ کچھ کمرے ایسے بھی تھے جہاں شوقین دوسروں سے الگ بیٹھ سکتے تھے اور شریفہ کو عموماً ایسے ہی لوگوں کی فرمائشیں پوری کرنی ہوتیں جو عوام سے الگ بیٹھتے تھے۔لیکن جانے کی بات تھی کہ الگ بیٹھنے والوں میں سے شریفہ کو آج تک کسی سے شکایت کا موقع نہ ملا تھا۔لیکن کچھ روز سے ہوٹل میں ایک بہت بانکا سجیلا نوجوان آنے لگا تھا۔اس نوجوان کا نام تجمل تھا اور خاصا مالدار معلوم ہوتا تھا۔صبح کا کھانا بھی ہوٹل میں کھاتا اور رات کا بھی۔کبھی کبھی اس کے ساتھ اس کا ایک دوست بھی ہوتا جسے وہ ملک کہا کرتا۔

دلاور حسین کے ایما سے تجمل کی خدمت کا کام شریفہ کے سپرد کردیا جاتا۔تجمل علیحدہ کمرے میں جا بیٹھتا اور کسی لڑکی کو اس کے پاس جانے کی اجازت نہ ہوتی۔تجمل نے ایک دوبار شریفہ کو بھی کھانے میں شامل کرنے کی خواہش ظاہر کی لیکن وہ خوش اسلوبی سے ٹال دیتی مگر آخر اس کے پیہم تقاضوں سے اور کچھ دلاور حسین کی ناراضگی کے خوف سے وہ بھی کھانے میں شامل ہو جاتی۔لیکن کچھ برائے نام سی۔کبھی دلاور حسین بھی آ بیٹھتا۔ دلاور حسین کی موجودگی میں شریفہ تجمل سے کبھی بات نہ کرتی وہ مخاطب بھی کرتا تو وہ کچھ جواب نہ دیتی اور سر جھکائے خاموش بیٹھی رہتی اور دلاور حسین کو یہ بہت ناگوار گزرتا اور وہ طرح طرح سے اظہار ناراضگی کرتا رہتا۔

ایک روز تجمل اور شریفہ دونوں کھانے پر بیٹھے تھے اور ملک کی موجودہ بدامنی کے متعلق کچھ باتیں ہو رہی تھیں۔تجمل ارادتاً یا یہ بھی اس کی کوئی چال ہی تھی شریفہ سے کبھی ہنسی مذاق نہ کرتا۔ بات چیت جب ہوتی ملکی یا قومی معاملات پر ہوتی۔اس چال سے تجمل نے شریفہ کے دل میں بظاہر کچھ اعتماد بھی پیدا کرلیا تھا اور وہ بھی اس سے کچھ کھل کر باتیں کرنے لگی تھی۔

ایک روز باتوں باتوں میں تجمل بولا۔

''مس شریفہ! میں کئی دن سے کچھ ایسا محسوس کررہا ہوں کہ قدرت نے تمہیں اس کام کے لئے پیدا نہیں کیا۔کوئی خاص ہی وجہ ہوگی جو تم نے یہ پیشہ اختیار کر رکھا ہے''۔

تجمل ہمیشہ شریفہ کو مس شریفہ کہا کرتا تھا۔

''یہ خیال آپ کو کیسے ہوا؟'' شریفہ نے پوچھا۔

تجمل مسکرا کر بولا۔

''یہ تو تم نے بہت ٹیڑھا سوال کیا۔

''ٹیڑھا کیسے؟'' شریفہ بولی۔ ''میں نے تو ایک سیدھی سی بات پوچھی ہے''۔

''تمہارے لئے تو واقعی سیدھی سی بات ہے لیکن میرے لئے نہیں''۔ تجمل نے جواب دیا۔

''آپ کے لئے کیوں نہیں؟'' شریفہ نے پوچھا۔

''مجھے خوف ہے اگر میں نے سچ کہا تو تم ناراض ہو جاؤ گی''۔ تجمل نے مسکرا کر کہا۔ ''اور تمہیں ناراض کرنا مجھے کسی قیمت پر منظور نہیں''۔

''تو پھر معاف فرمائیے۔ میں بھی کوئی ایسی بات سننے کے لئے تیار نہیں''۔ شریفہ نے جواب دیا۔

''گویا!'' تجمل مسکرا کر بولا۔ ''جو کچھ میرے دل میں ہے یا کم از کم جو کچھ میں سمجھ رہا ہوں۔ وہی بات تم نے خود کہہ دی''۔

شریفہ نے ذرا تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ تجمل بولا۔

''ہوٹل میں جو لڑکیاں کام کرتی ہیں ان کا چال چلن کسی سے چھپا نہیں۔ ہوٹل میں آنے والے جانتے ہیں کہ یہ کس قماش کی عورتیں ہیں اور یہ عورتیں بھی اپنے کام میں اس قدر ہوشیار ہوتی ہیں کہ ایک ہی نظر میں گاہک کو بھانپ جاتی ہیں۔ لیکن میں اتنے روز سے دیکھ رہا ہوں کہ تم میں ایک بات بھی تو ایسی نہیں جو کوئی تمہیں بھی اسی قماش کا سمجھے۔ یا ہو سکتا ہے کہ میری سمجھ کی غلطی ہو''۔

''اور غالباً آپ بھی مجھے اسی قماش کا سمجھتے ہیں''۔ شریفہ نے ذرا جرأت سے کام لے کر پوچھا۔

''تم میری بات رہنے دو''۔ تجمل نے جواب دیا۔ ''میں اتنے روز سے یہاں آ رہا ہوں۔ اسلئے میرا خیال ہے کہ تم نے میرے متعلق بھی کوئی رائے ضرور قائم کی ہوگی۔ لیکن ہوٹل میں جو لوگ آتے ہیں یہ مشکل ہے کہ سبھی میرے ہی ہم خیال ہوں اور غالباً اسکا تجربہ تمہیں مجھ سے زیادہ ہو گا''۔

تجمل نے لفظوں کے ہیر پھیر سے وہ سب کچھ کہہ دیا جو وہ کہنا چاہتا تھا۔

''مجھے اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں کہ ہوٹل میں جو لوگ آتے ہیں کچھ تو محض وقت کاٹنے کو آ بیٹھتے ہیں اور کچھ......''

لیکن شریفہ نے فقرہ پورا نہ کیا۔

''اور کچھ کیا؟'' تجمل نے پوچھا۔

''کچھ ان لڑکیوں کے لئے''۔ شریفہ نے دبی زبان سے کہا۔

''اور تم بھی تو ان لڑکیوں میں شامل ہو''۔ تجمل نے واب دیا۔ ''گو اس کے ساتھ میں یہ کہنے سے بھی باز نہیں رہ سکتا کہ ان لڑکیوں کا اور تمہارا مقابلہ ایسا ہی ہے جیسے ذرے کا آفتاب سے اور جہاں تک میں دیکھتا ہوں کچھ لوگ تو محض تمہیں دیکھنے کو چلے آتے ہیں''۔

''اور اسی لئے آپ کو یہ احساس پیدا ہوا کہ میں اس کام کے لئے پیدا نہیں کی گئی''۔ شریفہ نے ذرا طنزاً مسکرا کر کہا۔

''کیا میں ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟'' تجمل نے کہا۔

''پوچھئے!'' شریفہ نے کہا۔

''تم نے کبھی کسی شخص کو قابل اعتماد بھی سمجھا؟'' تجمل نے پوچھا

''نہیں!''

''کیوں؟''

''جو لوگ ایسے ہوٹلوں میں آتے ہیں وہ قابل اعتماد نہیں ہوتے''۔شریفہ نے جواب دیا۔

''یہ تو تم نے بالکل ٹھیک کہا''۔تجمل بولا۔''اب ایک بات اور بھی بتا دو''۔

''کیا؟'' شریفہ نے پوچھا۔

''کسی شخص نے تم سے کبھی اظہار محبت بھی کیا؟'' تجمل نے پوچھا۔

''ہر روز''۔شریفہ نے مسکرا کر کہا۔

''اور ان میں سے کوئی شخص بھی تمہیں قابل اعتماد نظر نہیں آیا''۔تجمل نے پوچھا۔''میرا مطلب یہ ہے کہ سب مطلب پرست ہی ہوتے ہیں گویا''۔پھر ذرا مسکرا کر''یعنی صاف آنکھیں پھیر لیں مطلب نکل جانے کے بعد! یہی مطلب ہے نا تمہارا''۔

شریفہ ذرا غصے سے بولی۔

''معاف فرمایئے! میں اس قسم کی باتیں سننے کی عادی نہیں۔اور آپ جو کچھ سمجھ رہے ہیں غلط سمجھ رہے ہیں''۔

''میں جو کچھ سمجھ رہا ہوں وہ میں تم سے ابھی ابھی کہہ چکا ہوں''۔تجمل نے اس خوف سے کہ کہیں اس کی پیدا کردہ پاکبازی کا اثر زائل نہ ہو جائے جواب دیا۔''اور اس کے بعد میں نے جو کچھ پوچھا یا کہا وہ محض مزید اطمینان کے لئے تھا۔اور اب میرا خیال پہلے سے زیادہ پختہ ہو گیا ہے۔ لیکن ایک بات میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا کہ تمہیں اس جہنم میں کھینچ کر کون لایا؟''

''قسمت!'' شریفہ نے جواب دیا۔

''یہ تو میں ماننے کو تیار نہیں''۔تجمل نے کہا۔''قسمت اتنی سنگدل نہیں ہو سکتی''۔

''بہر کیف! میں تو یہی سمجھتی ہوں''۔شریفہ نے جواب دیا۔

''لیکن قسمت کے کھیل بگڑ کر بن بھی جاتے ہیں''۔تجمل نے کہا۔

''قسمت کی بات ہے''۔شریفہ نے آہ بھر کر کہا۔

کچھ دیر اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں پھر تجمل چلا گیا۔

تجمل ایک امیر آدمی تھا۔لیکن بری صحبت نے اسے بالکل بگاڑ دیا تھا۔وہ ابتدا میں اپنے ایک دوست کے ساتھ گرین ہوٹل میں صرف جوا کھیلنے آیا کرتا تھا۔ہوتے ہوتے دلاور حسین سے اس کے مراسم بہت گہرے ہو گئے۔اور وہ کبھی کبھی اس سے قرض بھی لے لیتا۔دلاور حسین ایسے شکار کی ہمیشہ گھات میں لگا رہتا تھا اُسے جب معلوم ہوا کہ تجمل ایک بہت بڑی جائیداد کا مالک ہے تو وہ اسے پھانسنے کو نئے نئے طریقہ اختیار کرنے

لگا۔ جن میں سے ایک خوبصورت عورتیں مہیا کرتا بھی تھا۔ تجمل حسن پرست بھی تھا اور قمار باز بھی۔ اور دلاور حسین اس کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لئے شریفہ کو بھی ہوٹل میں لے آیا۔ اور جب وہ اپنا کام کچھ سمجھ گئی تو اس کا تجمل سے تعارف کرا دیا اور شریفہ کو بھی سمجھا دیا کہ وہ ہر ممکن طریق سے تجمل کو قابو میں لانے کی کوشش کرے۔ لیکن اس کی یہ تدبیر ابھی تک کارگر نہ ہوئی تھی۔ ادھر تجمل کو بھی دوسرے شکاریوں کی طرح یہ امید تھی کہ ہوٹل کی یہ خوبصورت چڑیا سونے چاندی کی جھلک دیکھ کر خود بخود پھنس جائے گی۔ لیکن جب شریفہ نے اس سے کچھ لینے سے ہمیشہ انکار کیا تو اسے بہت تعجب ہوا اس لئے دلاور حسین کے مشورے سے اس نے اس پر اعتماد جمانے کی کوشش شروع کر دی اور غالباً اس میں وہ کچھ کامیاب بھی ہو گیا اور جیسا کہ امیر نوجوانوں کا دستور یا شوق ہوتا ہے تجمل کو اب شریفہ کا عام لڑکیوں کی طرح ہر کسی کا دل بہلانا بھی ناگوار ہونے لگا۔ اور اس نے دلاور حسین کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ شریفہ عام لڑکیوں کی طرح ہوٹل میں کام نہ کیا کرے اور یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ دلاور حسین کن شرائط پر اس بات پر آمادہ ہوا ہوگا۔ اس سے دلاور حسین کو ایک تو مالی فائدہ توقع سے زیادہ ہونے لگا دوسرے شریفہ کے خدشات بھی مٹ گئے اور اسے یہ امید ہونے لگی کہ شاید کسی روز تجمل اس سے شادی کے لئے کہے گا۔

لیکن دلاور حسین بھی کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا۔ اُس نے پیش بندی کے طور پر شریفہ کو تاکید کر دی تھی کہ وہ ہوٹل کی کبھی کوئی بات اپنی ماں سے نہ کہے۔ مثلاً تجمل سے ملاقاتوں کا ذکر اور شریفہ جو چچا کی طرف سے کچھ مطمئن ہو چلی تھی اب چچا کی ہدایات پر پوری طرح عمل کرنے لگی تھی۔ تو اس طرح دلاور حسین اور تجمل میں ساز باز ہو جانے کے بعد اب شریفہ اور تجمل ہوٹل کے ایک پرائیویٹ کمرے میں ملتے۔ لیکن شریفہ کی حیثیت وہی ایک ہوٹل گرل کی تھی۔

طاہرہ اور شریف حسین

اپنی راتوں کے تصور سے خود آپ آپ تھی وہ
اس کی نظروں کو تھی اک ایسے سہارے کی تلاش
جیسے گرداب میں کشتی کو کنارے کی تلاش
اپنا ماحول بدل لینے کو بیتاب تھی وہ !

(حفیظ اثر)

طاہرہ حسین تھی اور قدرت نے اسے وہ سب چیزیں عطا کر رکھی تھیں جن کی بدولت ایک عورت مرد کی نگاہ میں حسین سمجھی جاتی ہے۔جیسا کہ ہم آپ کو بتا چکے ہیں وہ صادق علی خاں کی بیٹی تو نہیں تھی لیکن دنیا اسے خاں صاحب کی بیٹی ہی سمجھتی تھی۔اب وہ جوان تھی۔اور صادق علی کو اگر کوئی فکر تھا تو وہ طاہرہ کا تھا۔صادق علی خاں بڑا مردم شناس۔جہاندیدہ اور تجربہ کار آدمی تھا۔شریف حسین کو دیکھتے ہی وہ بھانپ گیا تھا کہ یہ نوجوان غیر معمولی اوصاف کا مالک ہے اور اس نے اس کے متعلق جو فیصلہ کرتا تھا شہر سے صادق آباد آتے ہوئے راستے ہی میں کر لیا تھا اب صرف ایک مرحلہ باقی تھا اور وہ شریف حسین کی پرکھ تھی اور وہ اُسے ایسی کسوٹی پر پرکھنا چاہتا تھا جو فوراً کھرے اور کھوٹے میں فرق بتا دیتی ہے۔

گو طاہرہ کے آرام اور آسائش سے رہنے کے لئے سب کچھ موجود تھا لیکن پھر بھی وہ کچھ اُداس اُداس سی رہتی۔کچھ کھوئی سی۔وہ صادق آباد کی فضاؤں میں اس رنگین چڑیا کی طرح تھی جو اپنے نغموں سے آپ ہی جھوم جھوم جاتی۔اپنی مست اداؤں پر آپ ہی مست ہو ہو جاتی۔لیکن اس کے یہ میٹھے نغمے اور مست ادائیں اس کے لئے کچھ قدر و قیمت نہ رکھتیں۔وہ ایک خوبصورت پھول کی مانند تھی جس کی تابش حسن کی داد دینے والا کوئی نہ تھا۔جو دست گلچیں کو ترستا ہو وہ اس کنول کی طرح تھی جو کسی بھونرے کی محبت آمیز جھنجھناہٹ سننے کو بیتاب ہو۔وہ اس لالہ صحرا کی مانند تھی جس کی مستی بھری خوشبو صحرا کی گرم ہواؤں میں تلف ہو جاتی ہے وہ اس موتی کی طرح تھی جو کسی ساحل پر صدف کی آغوش میں بیٹھا ہوا کسی قدر شناس جوہری کی راہ دیکھتا ہے۔وہ ایک جگنو کی طرح تھی جو رات کے بھیانک اندھیاروں میں اپنی تابشوں سے ستاروں کی تابانی کا جواب دیتا ہے لیکن کسی حسینہ کے ماتھے کی بندیا بننے کی آرزو دل میں لئے رہتا ہے۔طاہرہ ایک حسینہ تھی جس کے شباب کی کلی پھوٹ چکی تھی لیکن شباب کسی محرم راز کی آغوش میں کھیلنے کے لئے مچل رہا تھا۔

طاہرہ اور شریف حسین کو ایک دوسرے کے ساتھ رہتے دو مہینے سے کچھ زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔شریف حسین بظاہر تو صادق علی خاں کی جائیداد کا منصرم تھا۔لیکن حقیقت میں اس کے ذمہ سب سے بڑی خدمت جو تھی وہ یہ تھی کہ وہ طاہرہ کے ساتھ ایک ساتھی یا دوست یا نگران کی حیثیت

سے رہے۔اور عمر کے تقاضے اور صادق آباد کی فضا کی مناسبت سے طاہرہ کے لئے صادق علی خاں کے عالیشان مکان کی فضائیں کچھ دلچسپی نہ رکھتی تھیں۔اسے خوشی حاصل ہوتی تو ندی کے کنارے شریف کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے سے ہوتی۔اس کے دل کی کلی کھلتی تو صادق آباد کے میدانوں کی کھلی فضاؤں میں کھلتی۔اس کے خوابوں کی دنیا اب شریف حسین کے خیال سے آباد تھی۔لیکن شریف حسین بولنے والا' باتیں کرنے والا' ہنسنے والا' صرف ایک کلدار کھلونا تھا۔وہ جوان تھا لیکن اس کا دل جوانی کی گرمی سے خالی معلوم ہوتا تھا۔لوگ کہتے تھے کہ قدرت نے اسے بڑی فراخدلی سے مردانہ حسن عطا کر رکھا ہے لیکن وہ قدرت کے اس عطیے سے بالکل بے خبر معلوم ہوتا تھا۔وہ جب سے صادق علی خاں کے سایہ عاطفت میں آیا تھا۔بظاہر اس کے تفکرات ختم ہو چکے تھے۔صادق آباد کے سب لوگ اسے عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔وہ دونوں وقت صادق علی خاں اور طاہرہ کے ساتھ کھانا کھاتا تھا اور اسے ہر طرح کی آسائش اور آزادی حاصل تھی لیکن ایک نگاہِ حقیقت شناس اسے دیکھتے ہی سمجھ جاتی کہ اس نوجوان کے دل کی پہنائیوں میں تفکرات اور پریشانیوں کے سوا کچھ بھی نہیں اور یہی وہ چیز تھی جو طاہرہ کو بھی کسی وقت پریشان کرنے لگتی۔

ایک روز دونوں ندی کے کنارے پتھروں پر بیٹھے تھے۔شام ہو رہی تھی۔بستی کی طرف سے طیور کے قافلے آسمان کی نیلی نیلی فضاؤں میں پرواز کرتے ہوئے کہسار کی وادیوں کی طرف جا رہے تھے۔ڈوبتے ہوئے سورج کی لالی ندی کے پانی اور تمام کائنات کو بھی سرخ قبا پہنا رہی تھی۔ندی کے اس پار جو کھیت تھے ان میں کہیں کہیں سارس اور کلنگ بیٹھے ابھی تک چہچہا رہے تھے۔طاہرہ چھوٹے چھوٹے پتھر اٹھا کر ندی میں پھینک رہی تھی۔پتھر جب سینۂ آب پر پڑتا تو ایک گرداب سا پیدا ہو جاتا اور جب یہ گرداب مٹنے کو ہوتا تو وہ ایک اور پتھر پھینک دیتی۔شریف اس کے پہلو میں خاموش بیٹھا افق کے اُس پار دور,بہت دور کچھ دیکھ رہا تھا۔طاہرہ کبھی کنکھیوں سے اس کی طرف بھی دیکھ لیتی۔وہ بیٹھے بیٹھے بولی۔

''کتنا تعجب ہے کہ پانی کا سینہ تو احساس سے خالی نہیں لیکن انسان کا دل اس جذبے سے بالکل ناآشنا ہے''۔

''کیونکہ پانی کو یہ معلوم نہیں کہ تفکرات اور پریشانی کسے کہتے ہیں''۔شریف نے جواب دیا۔اور طاہرہ نے جیسے چڑ کر کہا۔

''دو مہینے سے کچھ اوپر ہی ہو گئے مجھے یہ سنتے لیکن یہ آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ تمہیں کیا پریشانی اور کیا فکر ہے''۔

''طاہرہ!''شریف بولا۔''جس چیز سے تم واقف ہی نہیں اسے تم سمجھ بھی نہیں سکتیں۔دعا کرو تمہیں خدا محفوظ رکھے''۔

''ہاں خدا کا شکر ہے کہ مجھے تو کوئی فکر یا پریشانی نہیں''۔طاہرہ نے جواب دیا۔

دونوں میں اتنی بے تکلفی ہو چکی تھی کہ دونوں ایک دوسرے کو نام سے بلاتے تھے۔

''اسی لئے تو میں کہہ رہا ہوں کہ جس چیز کا تمہیں تجربہ نہیں اسے تم کیسے سمجھ سکتی ہو''۔شریف نے بھی ندی میں ایک چھوٹا سا پتھر پھینکتے ہوئے کہا۔

''تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ تمہیں مجھ پر اعتماد ہی نہیں''۔طاہرہ نے بھی اسی گرداب پر جو شریف کے پتھر پھینکنے سے ندی میں پیدا ہوا تھا ایک پتھر پھینکتے ہوئے کہا۔

پتھر پھینکنے سے ندی میں جو گرداب پیدا ہوا وہ پہلے گرداب سے زیادہ پھیل گیا۔

طاہرہ بولی۔

''لو دیکھو میرے پتھر سے کتنا بڑا گرداب پڑا''۔

''طاہرہ! تم نے کبھی غور نہیں کیا ورنہ تمہیں معلوم ہوتا کہ یہ دنیا بھی ایک مسلسل گرداب ہے اور ہم سب اس گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اور ہم میں سے ہر ایک ان میں سے نکلنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے اور......''

''اور!'' طاہرہ بات کاٹ کر بولی۔ ''یہ شام کا وقت ہے۔ شفق پھیلی ہوئی ہے اور دنیا کا نظام بدل رہا ہے۔ چرند و پرند بسیرا کرنے کا سامان کر رہے ہیں اور جنہیں اپنے گھونسلوں کی طرف سے اطمینان ہے شام کی دلفریبیوں اور شفق کی دلربائیوں سے مسرور ہو رہے ہیں۔ جیسے وہ سارس کا جوڑا۔ وہ جو اس ہرے ہرے کھیت میں بیٹھا ہے۔ لیکن ایک ہم دو ذی روح ہستیاں ہیں جو اس سہانے وقت میں بیٹھے تو ایک دوسرے کے دوش بدوش ہیں لیکن حقیقت میں ایک دوسرے سے اتنے دور جتنی زمین آسمان سے''۔

پھر شریف کی طرف دیکھ کر۔ ''کچھ غلط تو نہیں کہا میں نے؟''

''طاہرہ!'' شریف ایک آہ بھر کر بولا۔ ''لیکن جس طائر کا گھونسلہ صرصر حوادث سے اجڑ چکا ہو خیال تو کرو یہ شام کا وقت اس غریب کے لئے کتنا سوہان روح ہو رہا ہوگا جس مسافر کو منزل کا پتہ نہ ہو اور رات سر پر آ رہی ہو کیا تم اس کی پریشانی کا اندازہ کر سکتی ہو۔ بولو طاہرہ جواب دو''۔

''مسافر اگر اکیلا ہو تو واقعی اس کی پریشانی کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اگر کوئی ہم سفر بھی ہو تو پریشانی کچھ ایسی زیادہ نہ ہو گی۔ مثل مشہور ہے ایک سے دو بھلے''۔ طاہرہ نے جواب دیا۔

''اور جس کی قسمت ہی میں اکیلا رہنا لکھا ہو؟'' شریف نے جواب دیا۔

''قدرت نے ہر جاندار کا جوڑا پیدا کیا ہے۔ اگر ایک بچھڑ جائے تو دوسرا مل جاتا ہے''۔ طاہرہ نے جواب دیا۔ ''ہاں! اگر کوئی بیگانہ خو جان بوجھ کر اکیلا رہنا چاہے۔ یا دوسرے کو قابل اعتماد نہ سمجھے تو اس کا تو شاید لقمان کے پاس بھی علاج نہ ہو''۔

''اور جس کا گھر برباد ہو چکا ہو؟'' شریف نے پوچھا۔

''گھر برباد ہو چکا ہو تو نیا گھر بھی بن سکتا ہے بشرطیکہ دونوں ہمتی دامنگیر نہ ہو''۔ طاہرہ نے جواب دیا۔

''اور جس کے پاس نیا گھر بنانے کو کوئی سامان نہ ہو''۔ شریف نے پوچھا۔ ''جس کا خدا کی ذات کے سوا نہ کوئی معاون ہو نہ مددگار۔ وہ کیا کرے؟''

''ہمت ہو تو سب مشکلیں آسان ہو سکتی ہیں''۔ طاہرہ نے کہا۔ ''لیکن اگر دو مل کر کوئی کام شروع کریں تو کام آسان ہو جاتا ہے''۔

''طاہرہ تم جو کچھ کہہ رہی ہو ٹھیک ہے اور میں خود بھی یہی سوچ رہا ہوں لیکن مشکل یہ ہے کہ مجھے نہ کوئی ترکیب سوجھتی ہے نہ کوئی راستہ نظر آتا ہے اور نہ راہبر......''

شریف حسین نے جواب دیا۔

''جانتے ہو اس کی وجہ کیا ہے؟ طاہرہ نے پوچھا''۔

''کیا؟'' شریف نے پوچھا۔

''تمہیں کسی پر اعتماد نہیں!'' طاہرہ نے جواب دیا۔

''طاہرہ!'' ''تم جو کچھ کہہ رہی ہو میں سمجھ رہا ہوں۔ میں اس جذبہ سے محروم نہیں جو جذبہ تمہارے دل کی پہنائیوں میں تڑپ رہا ہے۔لیکن طاہرہ!......شریف نے فقرہ پورا نہ کیا اور ایک پتھر اٹھا کر ندی میں پھینک دیا۔ساتھ ہی ایک گرداب ندی کے چمکتے ہوئے سینے پر پڑا۔شریف بولا۔

''طاہرہ! مجھے قسمت نے ایک ایسے گرداب میں پھنسا دیا ہے کہ نجات کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا''۔

''اگر ملاح ایک ہو اور کشتی بھنور میں پھنس جائے تو کنارے پر پہنچنے کے امکان کچھ کم ہی ہوتے ہیں۔لیکن اگر دو ملاح ہوں تو دونوں کی متحدہ کوشش سے کشتی کنارے پر جا لگتی ہے''۔طاہرہ نے جواب دیا۔

پھر شریف کے زانو پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

''شریف! سچ بتاؤ آخر بات کیا ہے کہ میں جس قدر تم سے نزدیک ہونا چاہتی ہوں تم مجھ سے اتنا ہی دور ہونے کی کوشش میں لگے رہتے ہو''۔

''محض اس لئے کہ میری منزل بہت دور ہے اور مجھے ابھی راستہ بھی معلوم نہیں''۔شریف نے جواب دیا۔''میں خدا کا شکر گزار ہوں کہ اس نے خان صاحب کے دل میں ترس ڈالا۔اور خان صاحب کی نوازشات سے میں فکر معاش سے بے فکر ہوں لیکن کیا معلوم جو کسی وقت یہاں سے بھی بوریا بستر باندھنا پڑے۔میں اگر اکیلا ہوتا تو کوئی ایسی بات نہ تھی لیکن میرے کندھوں پر دو اور ہستیوں کا بھی بوجھ ہے اور یہ دونوں مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں''۔

''بیوی اور بچہ کیا؟'' طاہرہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔اس وقت ہوا ندی کے سینۂ آب پر اپنے آنکھوں سے اوجھل رہنے والے پاؤں سے رقص کر رہی تھی اور طاہرہ کے سر کے بالوں کی ایک خوبصورت لٹ سانپ کی طرح اس کے گلابی رخسار کی بلائیں لے رہی تھی۔

''نہیں! ماں اور بہن''۔شریف نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

طاہرہ کو کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے سینے پر سے ایک بوجھ اتر گیا ہے۔

''تم انہیں یہاں کیوں نہیں بلا لیتے''۔طاہرہ نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔''بابا ان کے رہنے سہنے کا بھی انتظام کر دیں گے''۔

شریف نے کچھ جواب نہ دیا۔شفق کی سرخی ماند پڑ چکی تھی۔ہوا میں خنکی بڑھ رہی تھی پر فضا میں کچھ اداسی پھیل رہی تھی اور بستیوں کی جانب سے ابھی تک پرندے رات کے بسیرے کے لئے پہاڑ کی طرف جا رہے تھے۔کھیتوں میں کلنگ اور سارس ابھی تک بیٹھے شام کی پر لطف اداسیوں کا لطف اٹھا رہے تھے۔طاہرہ بولی۔

''تو میں بابا سے کہوں؟ تمہیں تو اعتراض نہ ہوگا''۔

''ان کی نوازشات پہلے ہی کچھ کم ہیں کیا جو میں ان پر مزید بوجھ ڈالوں''۔شریف نے کہا۔

''میں تو جہاں تک دیکھتی ہوں انہیں تمہارے آرام کا بہت خیال رہتا ہے''۔طاہرہ نے جواب دیا۔

''اور میں نے کب انکار کیا؟'' شریف نے جواب دیا۔

''ایک بات پوچھوں؟'' طاہرہ بولی۔

''پوچھو!'' شریف نے کہا۔

''کہیں تمہیں میرا یوں ساتھ لگے رہنا بھی تو ناپسند نہیں''۔ طاہرہ نے پوچھا۔ ''دیکھو! جھوٹ مت کہنا''۔

''یہ خیال تمہیں کیسے ہوا؟''

''اس خیال کے محرک تم ہو''۔

''میں محرک ہوں؟'' شریف نے تعجب سے پوچھا۔ ''کیسے؟''

اور طاہرہ نے ذرا غصے سے کہا۔

''یا تو تم دیدہ و دانستہ مجھے دھوکا دے رہے ہو یا تم واقعی مجھ سے دور رہنا چاہتے ہو۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ جب تم میرے پاس ہوتے ہو تو مجھے گوناگوں خوشی ہوتی ہے کچھ اطمینان سا بھی ہونے لگتا ہے تم نے ابھی ابھی اپنی پریشانیوں کا ذکر کیا تھا۔ لیکن تم ایک جوان لڑکی کی پریشانیوں کو شاید آج تک نہیں سمجھ سکے......''

شریف نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

''تمہیں کیا پریشانی ہو سکتی ہے طاہرہ؟''

''یہ کہنا تو بہت آسان ہے لیکن سمجھنا سخت مشکل''۔ طاہرہ نے جواب دیا۔ گو تم نے آج تک مجھ پر کبھی اعتماد نہیں کیا۔ تم نے مجھے کبھی بھروسہ کے قابل نہیں سمجھا ہمیشہ مجھ سے سرد مہری اور بے تعلقی کا اظہار کیا ہے۔ لیکن میں ان سب باتوں کے باوجود تمہیں قابل اعتبار سمجھتی ہوں اور مجھے تم پر بھروسہ بھی ہے اور شاید بھروسہ سے کچھ زیادہ بھی۔ یہ اور بات ہے کہ تمہیں اس کا احساس ہو یا نہ ہو۔ تم پوچھتے ہو کہ تمہیں کیا پریشانی ہو سکتی ہے۔ مجھے تم سے گلہ نہیں کیونکہ جو کچھ تم سمجھ رہے ہو دنیا تو یہی سمجھتی ہے۔ لیکن سنو! مجھے آج تک یہ معلوم نہیں کہ میں کون ہوں اور میرے والدین کون تھے اور یہ میرے محسن یہ خان صاحب جنہیں میں ''بابا'' کہتی ہوں اور جو مجھے اپنی حقیقی بیٹی کی طرح پیار کرتے ہیں کون ہیں؟ شریف! میں اب جوان ہوں اور خان صاحب کی مہربانی سے کچھ تعلیم بھی میں نے پائی ہے۔ اب تم ہی خدا لگتی کہو کہ مجھے جب ان باتوں کا خیال آتا ہے تو میرے دل پر کیا گزرتی ہو گی''۔

''تمہیں شاید یہ معلوم نہ ہو کہ خان صاحب کی ایک ہمشیرہ بھی ہے۔ اور وہ بیوہ ہے اور وہ بڑی نیک عورت ہے اور میری پرورش بھی حقیقت میں اسی نیک خاتون نے کی تھی۔ لیکن وہ جب یہاں آ کر مقیم ہوئے تو مجھے بھی ساتھ لے آئے اور دیکھنے والوں نے مجھے ان کی بیٹی ہی سمجھا اور انہوں نے خود بھی ہمیشہ یہی ظاہر کیا۔ اس گھر میں میں نے تعلیم پائی اسی جگہ میں جوان ہوئی بے شک خان صاحب کی نوازشات کے باعث اس گھر میں میرے لئے دنیا کا آرام میسر ہے لیکن شعور کے نشو و نما کے ساتھ ساتھ مجھے کسی وقت ایک قسم کی بے گانگی کا بھی احساس ہونے لگتا وجہ معلوم نہیں اور غالباً خان صاحب کو بھی اس بات کا احساس ہوا اور شاید انہیں کچھ تعجب بھی ہو۔ وقت اسی طرح گزرتا رہا اور آخر ایک روز خان صاحب تمہیں یہاں لے آئے شوفر سے معلوم ہوا کہ وہ تمہیں اپنا کارندہ بنائیں گے۔ لیکن اسی رات جب رات کا کھانا کھانے کے بعد تم اپنے ڈیرے پر چلے گئے تو خان

صاحب نے تمہارے متعلق مجھ سے کچھ باتیں کیں۔ میں اس وقت تو ان کی باتوں کا کچھ صحیح مفہوم نہ سمجھ سکی لیکن جب وہ مجھے تم سے ملنے کا تمہارے ساتھ سیر کو جانے کا۔ ندی پر بیٹھ کر مچھلی کے شکار کا موقع دینے لگے تو ان کی اس رات کی باتوں کا مفہوم مجھ پر آشکار ہونے لگا۔ اور ہم دونوں کے درمیان جو ایک بے گانگی سی تھی۔ تم نے تو نہیں لیکن میں ہر ممکن طریق سے اسے اٹھانے کی کوشش میں لگی رہی میں ابھی ابھی تم سے پوچھ رہی تھی کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ میں جتنا تمہارے نزدیک آنے کی کوشش کرتی ہوں تم اتنا ہی مجھ سے دور ہونا چاہتے ہو تو تم نے کہا کہ صرف اسلئے کہ تمہاری منزل بہت دور ہے اور صرف دور ہی نہیں بلکہ تمہیں منزل کا راستہ بھی معلوم نہیں لیکن تم نے یہ بھی سوچا کہ مجھے ایک لڑکی کو جس کا سب سے بڑا وصف یا خوبی اس کا نسوانی حجاب ہے۔ کس بات نے تم سے آج یوں کھلم کھلا بات کرنے کی جرأت دلائی یا مجبور کیا۔ شریف بولو! جواب دو۔ کبھی سوچا تم نے؟''

''نہیں!'' شریف نے جواب دیا اور طاہرہ جھلا کر بولی۔

''تم جھوٹ کہہ رہے ہو شریف! اور ایک لڑکی کو جسے تم پر اعتماد ہو دھوکا دینا شرافت سے بعید ہے۔ شریف! سچ بتاؤ تم نے جھوٹ کیوں بولا؟''

''میں مجبور ہوں''۔ شریف نے ایک آہ بھر کر کہا۔

''اور میں بھی آج پوچھنے پر مجبور ہوں''۔ طاہرہ نے کہا۔ ''شریف! میں نے بھی آرزوؤں اور اُمیدوں کی کئی روز سے ایک دنیا آباد کر رکھی ہے۔ لیکن تمہاری سرد مہری سے اس دنیا میں کبھی ایک زلزلہ سا آ جاتا ہے طوفان پیدا ہو جاتا ہے۔ بتاؤ تم کیوں مجبور ہو''۔

''طاہرہ!'' شریف آہ بھر کر بولا۔ ''میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم مجھے اعتماد کے قابل سمجھتی ہو لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے اعتماد کے قابل نہیں۔ تم نے جو امیدوں اور آرزوؤں کی دنیا بسا رکھی ہے۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ تمہاری اس دنیا میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں۔ طاہرہ! میری زندگی کا ایک مقصد ہے اور میں جب تک اس مقصد میں کامیاب نہ ہو جاؤں اس دنیا میں میرے لئے نہ چین ہے نہ آرام۔ میں تم سے ابھی ابھی کہہ چکا ہوں کہ میری ماں بھی زندہ ہے اور بہن بھی اور میں تم سے یہ بھی کہے دیتا ہوں کہ ایک وقت وہ بھی تھا کہ یہ دونوں عورتیں عزت اور آرام سے زندگی بسر کر رہی تھیں اور آج ایک غالباً ماماگری کر رہی ہے اور دوسری بھی شاید کوئی ایسا ہی ذلیل کام۔ طاہرہ! یہ میرا ایک راز ہے جو میں نے تم سے کہہ دیا ہے۔ خدا کے لئے اسے ایک راز ہی رکھنا''۔

شریف کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ لیکن وہ اپنے جذبات پر قابو پا کر بولا۔

''ان دونوں کی نگاہیں مجھ پر لگی ہیں۔ میری زندگی کا مقصد ان دو عزیز ہستیوں کو آرام سے سکھ کی زندگی بسر کرتے دیکھنا ہے اور اس مقصد کے حاصل کرنے میں اگر مجھے اپنی جان بھی بھینٹ چڑھانی پڑے تو کبھی پس و پیش نہ کروں گا''۔

''خدا کی ذات کے سوا میرا اور کوئی ساتھ نہیں دے سکتا۔ اور مجھے اُسی کی ذات پر بھروسہ ہے''۔ شریف نے جواب دیا۔

''لیکن میں پوچھتی ہوں اگر کوئی آمادہ ہو جائے''۔ طاہرہ نے پھر پوچھا۔

''کوئی عقل مند آمادہ نہیں ہوگا''۔

''اور اگر کسی کو تم سے محبت ہو''۔ طاہرہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا

''محبت؟'' شریف نے آہ بھر کر کہا۔ ''ایک مفلس اور بے نوا سے؟''

''اور اگر کسی کو ہو تو کیا تم بھی اس سے محبت کرو گے؟'' طاہرہ نے پھر پوچھا۔ ''محبت کا جواب محبت سے دو گے؟''

''نہیں!'' شریف نے جواب دیا۔

''اگر میں کہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے؟'' طاہرہ نے پھر پوچھا۔

''طاہرہ!'' شریف نے آہ بھر کر کہا۔ ''محبت میرے لئے حرام ہے''۔

طاہرہ نے سر جھکا لیا۔ شام ہو چکی تھی۔ نیلے نیلے آسمان پر زحل اور مشتری ایک دوسرے سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہہ رہے تھے۔ سارس اور کلنگ کھیتوں سے جا چکے تھے اور شام کی اُداسی فضا کے ساتھ ساتھ دونوں کے دلوں پر بھی مسلط ہو رہی تھی۔

عزیز

زندگی قہر مسلسل ہے خوشی ہے نایاب
یاس و حرماں کے دہکتے ہوئے انگارے ہیں
رات دن درد کی صورت میں برستا ہے عذاب
غم کے ہر سمت اُچھلتے ہوئے فوارے ہیں

(نجیب خیرآبادی)

عزیز جیسا کہ ہمارے پڑھنے والوں کو معلوم ہے دلاور حسین کا بہت پرانا ملازم تھا اور اُس نے زمانے کے بہت سے سرد و گرم دیکھے تھے لیکن دیکھنے والے جانتے تھے کہ وہ دلاور حسین کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا رہتا ہے اور اس کے اشارہ پر چلتا ہے اور ان ہی اوراق میں ہم آپ کو یہ بھی بتا چکے ہیں کہ عزیز بھی اسی گاؤں کا تھا جس گاؤں کا رہنے والا دلاور حسین تھا۔ عزیز اور دلاور تقریباً ہم عمر تھے اور کبھی دونوں میں گاڑھی چھنتی تھی۔ عزیز کچھ پڑھا لکھا بھی تھا۔ دلاور حسین کی بدکرداریوں کا جہاں ہم نے ذکر کیا ہے وہاں آپ کو یہ بھی بتا چکے ہیں کہ باپ کی زندگی میں بھی اس کے یہی لچھن تھے اور گاؤں والوں کو اُس سے سخت شکایت تھی لیکن پیر مہتاب شاہ کی وجہ سے سب خاموش تھے۔

گاؤں میں ایک نائن لڑکی تھی۔ جوان اور خوبصورت اس لڑکی کا نام سلامت تھا۔ اور گاؤں کے سب جوان لڑکے سلامت کی شمع حسن کے پروانے تھے اور ان میں ایک عزیز بھی تھا بلکہ مشہور تو یہ تھا کہ وہ عزیز کی محبوبہ ہے۔ عزیز کی محبوبہ ہو یا کسی اور کی ناممکن تھا کہ دلاور حسین ایسے بدچلن آدمی کی اس پر نگاہ نہ ہو۔ دلاور حسین جو کچھ گاؤں میں کرتا عزیز کے صلاح و مشورے سے کرتا لیکن سلامت کے معاملہ میں وہ عزیز کو رازدار نہیں بنا سکتا تھا اس لئے عزیز مطمئن تھا کہ سلامت دلاور کی سازباز سے محفوظ ہے۔ لیکن یہ اس کی سمجھ کی غلطی تھی۔ دلاور حسین اپنے جوڑتوڑ میں برابر لگا ہوا تھا اور سلامت کے معاملہ میں اس کا رازدار گاؤں کا ایک مصلی گاموں تھا۔ گاموں کی سازباز سے دلاور حسین سلامت سے بھی چوری چھپے ملنے لگا۔ یہ ملاقات عموماً رات کے وقت گاؤں کے قریب کسی کھیت میں ہوتی۔ کچھ روز تو یہ بات پردہ راز میں ہی رہی۔ لیکن کسی نہ کسی طرح عزیز کو بھی بھنک پڑ گئی۔ اور اسے اپنے دوست کی دغابازی پر بہت سخت غصہ آیا۔ عزیز ایک مستون مزاج آدمی تھا اور چونکہ دلاور حسین کا کوئی راز ایسا نہ تھا جو عزیز کو معلوم نہ ہو اس لئے دلاور اس سے کچھ خائف بھی رہتا۔ چنانچہ ایک روز سلامت نے گاموں کی معرفت دلاور حسین کو پیغام بھیجا کہ عزیز کو کچھ بھنک پڑ گئی ہے اس لئے وہ کچھ روز اس سے نہ مل سکے گی اور وہ بھی اس سے ملنے کی کوشش نہ کرے۔ دلاور حسین جو فطرتاً بہت بزدل تھا یہ سن کر بہت گھبرایا اور اُسے یہ خوف ہونے لگا کہ عزیز کہیں اس سے انتقام لینے کے درپے نہ ہو جائے۔ اس لئے وہ ایک بہت خوفناک چال چلا۔ اُس نے گاموں سے کہا کہ جیسے بھی ہو وہ سلامت سے صرف دو چار منٹ کے لئے اس کی ملاقات کرا دے۔ چنانچہ گاموں کے کہنے سننے سے سلامت نے پھر ایک بار رات

کے وقت مکی کے ایک کھیت میں جو تھوڑے فاصلے پر تھا ملنے کا وعدہ کر لیا۔ گاموں مصلی نیچ ذات کا آدمی تھا اور دلاور حسین عموماً اس کی مٹھی گرم کرتا رہتا تھا۔ دلاور حسین نے گاموں سے یہ طے کیا کہ وہ اندھیرے میں سلامت کو کھیت میں لے آئے اور اس کے آنے کا انتظار کرے۔ گاموں کو کیا انکار ہو سکتا تھا سلامت کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ سیدھا عزیز کے ہاں پہنچا کیونکہ عزیز دو تین روز اس سے نہیں ملا تھا۔ عزیز کھاٹ پر لیٹا ہوا ہیر پڑھ رہا تھا۔ دلاور کو دیکھ کر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ دلاور حسین نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''کہاں رہے تم؟'' کتنے روز سے تمہیں دیکھا ہی نہیں۔

''کچھ کام کاج میں لگا رہا''۔ عزیز نے جواب دیا۔

''ایسا بھی کیا کام آپڑا جو دو روز سے تم مجھ سے ملنے بھی نہیں آئے''۔ دلاور حسین نے کہا۔ ''یہ کیوں نہیں کہتے کہ سلامت کی ناز برداریوں سے فرصت نہیں ملی''۔

''شاہ جی!'' عزیز نے جواب دیا۔ ''یہ قصہ آپ رہنے ہی دیں تو اچھا ہے۔ لیکن مجھے آپ سے یہ ہرگز اُمید نہ تھی''۔

''کیا کہہ رہے ہو تم؟'' دلاور حسین نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

''میں کہہ رہا ہوں کہ آپ یہ قصہ رہنے ہی دیں تو اچھا ہے''۔ عزیز نے کہا۔ ''جو ہو گیا سو ہو گیا''۔

''عزیز!'' دلاور حسین بولا۔ ''تم میرے دوست ہو اگر تمہیں مجھ سے شکایت ہے تو صاف صاف کہو''۔

''میں صاف کہوں گا تو آپ ناراض ہوں گے''۔ عزیز بولا۔ ''سچی بات ہمیشہ کڑوی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن آپ کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ہر کوئی بے غیرت نہیں ہوتا''۔

''خدا کرے کہ ایسا ہی ہو''۔ دلاور حسین نے مسکرا کر کہا اور عزیز نے اس کی طرف دیکھا۔ اور کہا

''شاہ جی! اگر آپ کی بجائے کوئی اور ہوتا تو اس کے گھر والے اُس کا اس وقت ماتم کر رہے ہوتے۔ آپ جانتے ہیں کہ محبت کی لاگ بری ہوتی ہے۔ آپ ہمارے پیر بھی ہیں اور میرے دوست بھی۔ آپ کو کم از کم اتنا ظلم نہیں کرنا چاہئے تھا''۔

''خدا کی قسم!'' دلاور حسین بولا۔ میں تو ایک حرف بھی نہیں سمجھا۔ ''آخر تم کہہ کیا رہے ہو؟''

''آپ سلامت سے نہیں ملتے؟'' عزیز نے اچانک پوچھا۔

''نہیں!'' دلاور حسین نے اُس کی طرف غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ اور سلامت رات کے وقت کھیتوں میں نہیں ملا کرتے کیا؟'' عزیز نے تعجب سے پوچھا۔

''ہرگز نہیں!'' دلاور حسین نے جواب دیا۔ ''لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ تمہاری سلامت کھیتوں میں کس سے چوری چھپے ملتی ہے؟''

''کس سے ملتی ہے؟'' عزیز نے پوچھا۔

''تمہیں معلوم نہیں''۔ دلاور حسین بولا۔ ''اندھے کب سے ہو گئے۔ اگر دیکھنا ہو تو آج عشا کی نماز کے بعد وہ جو گاؤں کے قریب مکی کا کھیت ہے وہاں جا کر دیکھ لینا''۔ پھر اٹھتے ہوئے۔ ''تمہاری غیرت کا بھی آج امتحان ہو جائے گا''۔

عزیز بھی اُٹھا اور منت سے بولا۔

''میری غلطی معاف کر دیجئے''۔میں بہت نادم ہوں''شاہ جی''۔

لیکن دلاور حسین نے کچھ جواب نہ دیا اور گھر واپس چلا گیا۔عزیز نے باقی وقت کیسے گزارا؟ یہ عزیز کو ہی معلوم ہوگا۔لیکن جب رات ہوئی تو وہ ٹکوا لے کر گھر سے باہر نکلا۔اور مکی کے اس کھیت کے پاس جس کا پتہ دلاور حسین نے دیا تھا جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ رہا۔کچھ دیر بعد موذن نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔اندھیری رات تھی۔عزیز چھپا بیٹھا گاؤں کی طرف سے جو راستہ آتا تھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا مگر اندھیرے کے باعث کچھ نظر نہ آتا۔لیکن اسے کچھ زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔کہیں قریب ہی قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھنے لگا۔آنے والے اسی کی طرف آ رہے تھے۔پھر اسے آواز آئی۔

''گاموں تم شادی کیوں نہیں کر لیتے''۔یہ سلامت کی آواز تھی۔

''چار پیسے ہوں گے تو شادی بھی کر لوں گا''۔گاموں نے جواب دیا۔

''پیر سے کیوں نہیں کہتے''۔سلامت نے کہا۔''دن بھر اس کی خدمت میں لگے رہتے ہو اتنا کام بھی وہ نہیں کر سکتا کیا؟''

''ابھی کچھ ایسی ضرورت بھی تو نہیں''۔گاموں نے ہنس کر کہا۔

''شادی کر لو۔گھر آباد ہو جائے گا''۔سلامت بولی۔''ایک سے دو بھلے''۔

''تم اگر مہربان ہو جاؤ تو سب کچھ ہو سکتا ہے''۔گاموں نے ہنس کر کہا۔

اب وہ دونوں جھاڑی کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔گاموں آگے آگے تھا اور سلامت پیچھے پیچھے۔سلامت کا دوپٹہ غالباً کسی جھاڑی میں اٹک گیا اور وہ وہیں رک گئی۔گاموں اسی جھاڑی کے پاس جہاں عزیز چھپا بیٹھا تھا پہنچ کر رک گیا۔عزیز چیتے کی طرح لپک کر نکلا۔اور ٹکوے سے گاموں پر حملہ کر دیا۔ٹکوا گاموں کے شانے پر پڑا اور اس نے خوف سے چیخ ماری۔سلامت تو خوفزدہ ہو کر گاؤں کی طرف بھاگ گئی اور عزیز نے گاموں کو وہیں قتل کر ڈالا۔اور چپکے سے گاؤں واپس چلا گیا۔

جب دن چڑھا اور لوگ گھروں سے نکل کر کھیتوں کو جانے لگے تو کسی نے گاموں کو مرا ہوا دیکھا اور اسی وقت سارے گاؤں میں گاموں کے قتل کی پکار پڑ گئی۔لوگ حیران تھے کہ گاموں کو کس نے قتل کیا۔ایک غریب مصلی سے کسی کو کیا عناد ہو سکتا تھا۔جو کوئی بھی تھا اس مکی کے کھیت کی طرف بھاگا جا رہا تھا جہاں گاموں کی لاش پڑی تھی۔ایک دلاور حسین تھا جو مطمئن تھا کہ اس کی یہ چال بھی کامیاب ہو گئی اور عزیز ایسا چالاک آدمی بھی اس کے قابو آ گیا۔ابھی سورج افق فلک پر نمودار ہوا ہی تھا کہ عزیز اس سے ملنے آ گیا وہ کچھ خوفزدہ معلوم ہوتا تھا۔

''آج صبح صبح کیسے آ گئے؟''دلاور حسین نے پوچھا۔

عزیز دلاور کے پاؤں پر گر پڑا۔

''شاہ جی! اب میری زندگی آپ کے ہاتھ میں ہے نمبردار پولیس تھانے میں رپورٹ کرنے گیا ہے''۔

''کیوں؟''دلاور حسین نے پوچھا۔

''آپ کو معلوم نہیں کیا؟''عزیز نے پوچھا۔''آپ نے انہیں سنا؟''

''میں گھر سے نکلتا تو کچھ سنتا بھی''۔دلاور حسین نے جواب دیا۔''بات کیا ہے؟''

''گاموں مرگیا ہے''۔عزیز نے کہا۔

''گاموں مرگیا ہے؟''دلاور حسین نے حیرت سے کہا۔''کیا ہوا اُسے؟''

''میں نے اسے قتل کر دیا ہے''۔عزیز نے خوفزدہ آواز سے کہا۔

''قتل؟''دلاور حسین نے بھی ذرا خوفزدہ آواز سے پوچھا۔''تم نے قتل کر دیا۔کیوں؟ کب؟ گاموں غریب کو کیوں مار دیا تم نے؟ کچھ بیر تھا اس سے تمہارا؟''

عزیز نے کچھ خوف سے کچھ منت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

''تھوڑی دیر بعد پولیس آ جائے گی شاہ جی! خدا کے بعد اب مجھے آپ کا ہی بھروسہ ہے آپ ہی بچائیں تو بچ سکتا ہوں''۔

''بہت برا کیا تم نے عزیز''۔دلاور حسین بولا۔''گاموں تو بہت غریب آدمی تھا بے گناہ کا خون کبھی چھپتا نہیں۔خون ضرور رنگ لائے گا''۔

عزیز نے پھر دلاور حسین کے پاؤں پر سر رکھ دیا اور بولا۔

''خدا کے لئے مجھ پر رحم کیجئے۔میں عمر بھر غلام بن کر رہوں گا۔اب میری موت اور زندگی آپ کے ہاتھ میں ہے''۔

''میں کیا کر سکتا ہوں''۔دلاور حسین نے کچھ بے اعتنائی سے کہا۔''سلامت سب کچھ بتا دے گی''۔

''سلامت نے مجھے نہیں دیکھا''۔عزیز نے جواب دیا۔

''نہیں دیکھا!''دلاور حسین بولا۔''کیسے نہیں دیکھا۔ضرور دیکھا ہوگا۔اس نے نہ دیکھا ہوگا تو کسی اور نے تمہیں رات کے وقت کھیتوں کو جاتے دیکھا ہوگا۔کسی بے گناہ کو مارنا کچھ ہنسی نہیں''۔

''شاہ جی!''عزیز ہاتھ جوڑ کر بولا۔''رحم کیجئے! آپ جو کچھ کہیں میں کرنے کو تیار ہوں لیکن مجھے پولیس سے بچا لیجئے''۔

''میں کیسے بچا سکتا ہوں''۔دلاور حسین غصے سے بولا۔''بہت ظلم کیا تم نے۔یہ خون ضرور رنگ لائے گا''۔

پھر وہ اُٹھا اور کاغذ قلم دوات اُٹھا لایا اور عزیز کی طرف بڑھا کر بولا۔

''اگر تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری مدد کروں تو جو کچھ میں کہتا ہوں تم اس کاغذ پر لکھ دو''۔

عزیز نے کاغذ اور قلم اٹھا لیا اور بولا۔

''لکھوائیے!''

''لکھو''دلاور حسین لکھوانے لگا۔

''میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ میں نے گاموں مصلی کو قتل کر دیا ہے مجھے سلامت سے محبت تھی اور گاموں سلامت سے چوری چھپے ملتا تھا۔ایک رات میں نے دونوں کو گاؤں کے قریب ایک کھیت کے پاس دیکھ لیا اور گاموں کو قتل کر ڈالا''۔

مرتا کیا نہ کرتا۔دلاور حسین نے جو کچھ لکھوایا عزیز نے بے چون وچرا لکھ کر دے دیا

''اب اس کے نیچے اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھ دو اور تاریخ بھی ڈال دو''۔عزیز نے اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھ دیا اور تاریخ بھی ڈال دی۔

دلاور حسین نے یہ تحریر اپنے قبضے میں کی اور عزیز سے وعدہ کیا کہ وہ اس پر آنچ نہ آنے دے گا۔ پولیس آئی اور تحقیقات ہونے لگی! اور تحقیقات میں مدد دینے والوں میں دلاور حسین اور عزیز دونوں پیش پیش تھے۔ پولیس نے شک میں کئی ایک آدمی گرفتار کر لیے۔ لیکن عزیز بچ گیا۔ لیکن یہ بچنا موت سے بھی بدتر تھا کیونکہ اب وہ دلاور حسین کے جال میں پھنس چکا تھا۔ اور وہ جس ناچ نچواتا وہی ناچ وہ ناچتا۔ لیکن جب اپنی بدکرداریوں کے باعث دلاور حسین کو مجبوراً گاؤں چھوڑنا پڑا تو وہ عزیز کو بھی ساتھ لے گیا۔ چنانچہ دلاور حسین کی خاطر عزیز کو کئی بار اپنی جان خطرے میں ڈالنی پڑی۔ دلاور حسین نے جس جس طرح اس غریب کو آلہ کار بنایا یہ ایک طویل اور گھناؤنی داستان ہے اور طول داستان ہمارا مقصد نہیں۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا دلاور حسین نے اپنے قول اور فعل سے ہمیشہ یہی ثابت کیا کہ اسے عزیز کی جان کی کاہ برابر بھی پروا نہیں اور عزیز کی وہی حالت تھی کہ اُگلے تو اندھا نگلے تو کوڑھی۔ لیکن بتدریج عزیز کے دل میں بھی دلاور حسین کی طرف سے کچھ نفرت پیدا ہونے لگی پہلے تو عزیز ہر کام میں دلاور حسین کا مشیر اور صلاح کار تھا لیکن کچھ روز سے دلاور حسین ہر بات پردہ خفا میں رکھنے لگا۔ اور یہ بات عزیز کو بھی کھٹکنے لگی۔ آخر عزیز بھی ایک چال چلا اور آئے دن کان کے درد کی شکایت کرنے لگا۔ پھر اس فرضی کان کے درد نے یہاں تک طول کھینچا کہ اس نے اپنے آپ کو بہرا ظاہر کرنا شروع کر دیا۔ بجائے اس کے کہ دلاور حسین کو اس کے بہرا ہونے کا افسوس ہوتا وہ دل میں بہت خوش تھا اور عزیز کا بہرا ہونا اپنے حق میں ایک نیک فال سمجھتا تھا۔ وقت اسی طرح گزرتا رہا اور عزیز اب دلاور حسین کی ہر حرکت پر کڑی نگاہ رکھنے لگا۔ اس روز جب افضل اس سے ملنے آیا تو عزیز کا ماتھا ٹھنکا اور اسے خیال ہونے لگا کہ افضل ایسے اُجڈ اور مفلوک الحال آدمی کو بھلا دلاور حسین سے کیا کام اور جیسا کہ ہم آپ کو بتا چکے ہیں وہ غسل خانہ میں چھپ کر دونوں کی باتیں سننے لگا۔ اور موقع پاتے ہی وہ نیلا لفافہ جس میں دلاور حسین نے افضل سے اپنی دستاویزیں خرید کر رکھی تھیں، تجوری سے نکال لیا۔

عزیز کی کالے خاں پنواڑی سے مدت سے راہ و رسم تھی اور اس نے اسکی دوکان کے اوپر کا بالاخانہ بھی اس سے کرایہ پر لے رکھا تھا لیکن یہاں وہ کبھی کبھی ہی آیا کرتا تھا۔ عزیز کو جب فرصت ملی تو وہ اس مکان پر آیا اور وہ کاغذ جو اس نے نیلے لفافے سے نکالے تھے دیکھنے لگا۔ یہ تین دستاویزیں تھیں۔ ایک تو وہی بیگم بدنصیب کا فرضی نکاح نامہ تھا دوسری وہی دستاویز تھی جو اس نے گاموں مصلی کے قتل کے بعد خود اس سے لکھوائی تھی اور تیسرا کاغذ دلاور حسین کے اپنے قلم کا لکھا ہوا تھا اس میں اس نے اس بات کا اقرار کیا تھا کہ اسکی بیوی مر گئی ہے اور معصوم بچی کو سنبھالنے والا کوئی نہیں اس لئے وہ اسے زندہ گاڑ رہا تھا۔ جب افضل کہیں سے آ نکلا اور اسے یہ جرم کرتے پکڑ لیا۔ اس تحریر میں دلاور حسین نے بچی کی پرورش کے معاوضہ کے طور پر ایک رقم ہر سال افضل کو دینے کا وعدہ کیا تھا۔ حالانکہ یہ بچی کی پرورش کا معاوضہ نہیں تھا بلکہ اپنا جرم چھپانے کی قیمت تھی۔ عزیز نے یہ تینوں دستاویزات لفافے میں ڈال کر اپنے ٹرنک میں رکھ دیں اور ساتھ ہی صادق علی خاں کو شریف حسین کے حسب و نسب اور حالات سے آگاہ کر دیا۔

شاید آپ کو یہ تعجب ہو کہ ایک معمولی ملازم کو صادق علی خاں ایسے صاحب ثروت اور صاحب اقتدار شخص کو اس قسم کا خط لکھنے کی جرات کیسے ہوئی تو اس وقت ہم صرف اتنا ہی بتانا کافی سمجھتے ہیں کہ دلاور حسین عموماً صادق علی خاں سے کچھ روپے قرض لیتا رہتا تھا اس لئے خان صاحب کو ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو دلاور حسین کے کاروباری حالات سے وقتاً فوقتاً اسے مطلع کرتا رہے اور دلاور حسین کے سب نوکروں میں سے خان صاحب کی نظر انتخاب عزیز پر پڑی۔ تو خیر! یہ دستاویزات قابو میں آ جانے سے عزیز اب اس فکر میں تھا کہ وہ ان سے کس طرح فائدہ اٹھائے۔ اب جو اُس نے دلاور حسین کا اپنے مرحوم بھائی دلدار حسین کی بیوہ اور اس کے بچوں سے ایسا غیر شریفانہ برتاؤ دیکھا تو اس نے دلاور حسین کو زک دینے اور دلدار حسین کے بچوں کی ہر ممکن مدد کرنے کا دل میں عہد کر لیا۔ اور موقع کا منتظر رہنے لگا۔

شریفہ ہوٹل میں کام کرتی تھی اور شریفہ کے حسن و جمال کی شہرت عیاش نوجوانوں کو ہر روز ہوٹل میں کھینچ لاتی۔ اور یہ تو صرف تائید ایزدی تھی یا خود شریفہ کی ہمت کہئیے کہ کوئی آدمی ابھی تک اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب نہیں ہوا تھا صرف ایک تجمل تھا جس نے چاپلوسی یا عیاری سے شریفہ کا کچھ اعتماد حاصل کر لیا تھا اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کچھ روز سے شریفہ اور تجمل ایک علیحدہ کمرے میں ملتے تھے۔ یہ کمرہ اس مکان سے ملحق تھا جس میں دلاور حسین رہتا تھا۔ یہ مکان بھی ہوٹل ہی کا ایک حصہ تھا اور جس کمرے میں تجمل آ کر بیٹھتا اس کا ایک دروازہ جو دوسری جانب سے بند رہتا تھا دلاور حسین کے کمروں کی طرف کھلتا تھا۔ اس طرح دلاور حسین جب موجود نہ ہوتا تو عزیز کو تجمل اور شریفہ کی باتیں سننے کا موقع مل جاتا۔ لیکن عزیز بھی اس غلط خیال میں مبتلا تھا کہ تجمل غالباً شریفہ سے شادی کر لے گا۔ لیکن تجمل اب کچھ روز سے اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہو رہا تھا۔ اب اس کی گفتگو سراپا ایک عیاش نوجوان کی گفتگو ہوتی اور تجمل کی باتوں سے اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس سے یوں علیحدگی میں ملنے کیلئے اسے دلاور حسین کو بھی معقول نذرانہ پیش کرنا ہوتا ہے چنانچہ ایک روز جب شام کے بعد وہ اس سے ملنے آیا تو کچھ اسی قسم کی باتیں کرنے لگا۔ شریفہ نے جو کچھ عرصہ ہوٹل کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے اب کچھ تجربہ کار ہو چکی تھی تجمل سے پوچھا۔

''تو گویا شاہ جی آپ سے دلالی لیتے ہیں''۔

''دلالی کہہ لو یا نذرانہ بات تو ایک ہی ہے''۔ تجمل نے کہا۔ ''لیکن مجھے ایک بات پر تعجب ضرور ہے؟''

''کیا؟'' شریفہ نے پوچھا۔

''کبھی تم نے بھی یہ دل میں سوچا کہ تم کب تک اپنی پارسائی کا ڈھونگ رچائے رکھو گی''۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی؟'' شریفہ نے کہا۔

''تعجب ہے''۔ تجمل نے جواب دیا۔ ''کہ کام تو تم ہوٹل میں کرو اور تم میری بات کا مطلب نہ سمجھ سکو۔ کبھی تم نے غور کیا کہ میں جو اتنا روپیہ تمہاری وجہ سے برباد کر رہا ہوں کیوں کر رہا ہوں؟ کبھی تم نے سوچا کہ تم میں اور ہوٹل کی دوسری لڑکیوں میں کیا فرق ہے کبھی تمہیں اس بات کا بھی خیال آیا کہ تم ہوٹل میں کام کرتے ہوئے مردوں سے کب تک بچ کر رہ سکو گی۔ گو دلاور حسین مجھے ابھی تک یہی یقین دلا رہا ہے کہ تمہیں کسی مرد نے ابھی تک نہیں چھوا۔ لیکن مجھے یہ بھی اس کی ایک چال ہی معلوم ہوتی ہے اور اس کی اس چال میں جہاں تک میں سوچتا ہوں تم بھی شامل ہو۔ میں جو کچھ آج تک دے چکا ہوں آج سب وصول کر لوں گا''۔

''کس سے؟'' شریفہ نے پوچھا۔

''تم سے اور کس سے؟'' تجمل نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ لیکن شریفہ اس کا ہاتھ جھٹک کر اُٹھتے ہوئے بولی۔

''آپ کو اگر کچھ لینا ہے تو شاہ جی سے لینا ہے۔ میرا آپ کا کیا واسطہ؟''

یہ کہہ کر جو وہ دروازے کو چلی تو تجمل نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ ''مجھے شاہ جی سے کیا کام۔ میں نے تو جو کچھ دیا ہے تمہارے لئے دیا ہے اور اب تم سے وصول کروں گا''۔

یہ کہہ کر اس نے شریفہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنی طرف کھینچا اور اس کا بوسہ لینا چاہا لیکن شریفہ نے زور سے اس کے منہ پر طمانچہ مارا اور اس کی گرفت سے علیحدہ ہو کر دروازے کی طرف بھاگی۔ لیکن تجمل نے لپک کر اسے پکڑ لیا اور اٹھا کر صوفے پر لٹا دیا۔ شریفہ نے خوفزدہ ہو کر چیخ

ماری۔عزیز جو دوسری طرف دروازے سے لگا سب کچھ سن رہا تھا۔فوراً دروازہ کھول کر اندر آ یا۔تجمل نے غصے سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

''چلے جاؤ!تم یہاں کیوں آئے؟''

لیکن پیشتر اس کے کہ عزیز کچھ جواب دے اسی دروازے سے دلاور حسین بھی آ گیا اور تعجب سے بولا۔''یہاں کیا ہو رہا ہے؟''

تجمل مسکرا کر بولا۔''مس شریفہ نے مجھ سے رومال چھین لیا تھا۔میں وہی ان سے لے رہا تھا''۔

''تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟''دلاور حسین نے غصے سے عزیز کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''چائے لاؤں؟''عزیز نے آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا۔

شریفہ بھی دوپٹہ سنبھالتی ہوئی صوفے سے اٹھی اور روتے ہوئے بولی۔

''چچا جان!مجھے......''

''خاموش رہو''۔دلاور حسین دانت پیس کر بولا۔

''نہیں میں اب خاموش نہیں رہ سکتی''۔شریفہ بھی غصے سے بولی۔''آپ کے ناپاک ارادوں کا علم مجھے آج ہی ہوا ہے چچا جان!اگر آج آپ کی بیٹی ہوتی تو کیا آپ اس کے بھی اسی طرح غیروں سے دام وصول کرتے''۔

''بکواس مت کرو''۔دلاور حسین نے گھور کر کہا۔

''چچا جان!''شریفہ بھی غصے اس اس کی طرف دیکھ کر بولی۔''یہ مت بھولئے کہ میں آپ کے مرحوم بھائی کی بیٹی ہوں اور میرا ایک جوان بھائی بھی ہے......''

''میں کہتا ہوں بکواس بند کرو تم''۔دلاور حسین غصے سے کانپتے ہوئے بولا۔''ورنہ زبان گدی سے کھینچ لوں گا''۔

پھر عزیز کی طرف جو دروازے کے ساتھ خاموش کھڑا تھا۔قہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر''تم یہاں کیوں کھڑے ہو جاؤ''۔

''میں نے پوچھا تھا''۔عزیز آنکھیں جھپکا کر بولا۔''چائے لاؤں یا کھانا؟دو

''نکل جاؤ یہاں سے''۔دلاور حسین نے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گرج کر کہا۔

لیکن شریفہ نے لپک کر عزیز کا ہاتھ پکڑ لیا اور روتے ہوئے کہا۔

''بابا!خدا کے لئے مجھے گھر پہنچا دو''۔

''چلو!''عزیز نے اسی کے دوپٹے سے اُس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔دلاور اور تجمل دیکھتے ہی رہ گئے اور عزیز شریفہ کو لے کر کمرے سے نکل گیا۔

پریشانیاں

شمع خاموش ہوئی صبح کا تارہ ٹوٹا
آخری باب کھلا زیست کے افسانے کا

شریفہ اور عزیز کے چلے جانے کے بعد دلاور حسین اور تجمل کچھ دیر تو خاموش کھڑے رہے۔ پھر دلاور حسین صوفے پر بیٹھ گیا اور بولا۔

''بندۂ خدا! کم از کم دروازہ تو اندر سے بند کر لیا ہوتا''۔

تجمل بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور دلاور حسین کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''لیکن آپ یہ کھیل کیا کھیل رہے تھے۔ شریفہ کا آپ سے کیا رشتہ ہے؟

''تمہیں اس سے کیا؟'' دلاور حسین نے جواب دیا۔ ''میں تو تمہیں بہت ہوشیار آدمی سمجھتا تھا مگر تم تو بالکل اناڑی ہی نکلے''۔

''یعنی آپ لوٹتے رہے اور میں لٹتا رہا''۔ تجمل غصے سے بولا۔

''میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ تم عشق بازیوں کے دفتر کھول بیٹھو''۔ دلاور حسین نے جواب دیا۔

لیکن آپ نے مجھ سے یہ تو کہا تھا کہ شریفہ اگر قابو میں آئے گی تو چال سے ہی آئے گی''۔ تجمل نے جواب دیا۔ ''اور آپ مجھے ہمیشہ یہی سبق دیتے رہے کہ کچ پکے سو میٹھا''۔

دلاور حسین نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا۔

''کہیں سچ مچ ہی تو دل نہیں آ گیا تھا شریفہ پر یا لے اُڑنے کا ارادہ تھا کہیں''۔

تجمل نے غصے سے دلاور حسین کی طرف دیکھا لیکن وہ ہنس کر بولا۔

''بھئی اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ تم جیسے کہتے رہے میں اسی طرح کرتا رہا پہلے تم ہوٹل میں ملتے تھے۔ پھر تم نے علیحدگی میں ملنے کے لئے کہا۔ میں نے وہ بھی انتظام کر دیا اور ایک کمرہ تمہاری تحویل میں کر دیا۔ آخر ان سب کا معاوضہ بھی تو تمہیں دینا تھا۔ دام کا انتظام میں نے کر دیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں دانہ ڈالنے کا شعور نہ تھا۔ ورنہ چڑیا کب سے دام میں پھنس چکی ہوتی''۔

''گویا آپ اپنی بیٹی کا مجھ سے سودا کر رہے تھے''۔ تجمل نے غصے سے کہا۔

''خاموش رہو''۔ دلاور حسین غصے سے بولا۔ ''ورنہ......''

''ورنہ صبح تک سب کو معلوم ہو جائے گا کہ شاہ جی اپنی لڑکی سے بھی رنڈی کا کام لیتے ہیں''۔ تجمل نے بات کاٹ کر کہا۔

''نکل جاؤ یہاں سے اسی وقت''۔ دلاور حسین دروازے کی طرف اشارہ کر کے بولا ''ورنہ ابھی پولیس کے حوالے کر دوں گا''۔

''مجھے؟''

''ہاں تمہیں!''

''کیوں؟''

''تم ایک شریف زادی کے کمرے میں گھس کر اس کی آبروریزی کرنا چاہتے تھے''۔ دلاور حسین نے کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح آخری پانسہ پھینکتے ہوئے کہا۔

''شاہ جی!'' تجمل مسکرا کر بولا۔''معلوم ہوتا ہے شکار ہاتھ سے نکل جانے سے آپ کے ہوش وحواس درست نہیں رہے۔ آپ جسے شریف زادی کہتے ہیں دنیا اسے ایک ہوٹل گرل سمجھتی ہے اور یہ تو مجھے آج ہی معلوم ہوا کہ وہ آپ کی کوئی قریبی رشتہ دار بھی ہے۔ لیکن اگر آپ اپنے گاہکوں سے اسی طرح درشت مزاجی سے پیش آئیں گے تو ہوٹل کی ساکھ میں فرق آئے گا۔ عوام تو اسے ابھی سے ایک قحبہ خانہ ہی سمجھ رہے ہیں اور یہ کسے معلوم نہیں کہ آپ کی سرپرستی میں یہاں قمار بازی کا میدان بھی چاروں پہر گرم رہتا ہے اور ہوٹل کی پیشہ ور لڑکیاں نوجوانوں کو طرح طرح سے پھانستی ہیں اور آپ کی مٹھی گرم کرتی ہیں اور آپ اپنی ساکھ قائم رکھنے کے لئے دوسروں کی مٹھی گرم کرتے رہتے ہیں۔ لیکن آپ نے کبھی یہ بھی سوچا کہ یہ فریب کب تک چلے گا۔ اور وہ لوگ جنہیں آپ تباہ کر چکے ہیں کب تک خاموش رہیں گے''۔

''مجھے تمہاری پند ونصیحت کی ضرورت نہیں۔ خاموش رہو تم''۔ دلاور حسین نے غصہ سے جواب دیا۔

''خاموش رہو تو آپ کا تکیہ کلام ہے شاہ جی!'' تجمل نے مسکرا کر کہا۔''لیکن آپ کے صرف ''خاموش رہو'' کہنے سے لوگوں کی زبان بند نہیں ہو سکتی۔ خیر! آپ کے ہاتھ سے تو وہ خوبصورت چڑیا نکل گئی لیکن تھوڑے روز صبر کیجئے۔ کسی روز آپ اسے میری بغل میں بھی دیکھیں گے۔ سادات کی لڑکی اور پیشہ ور اور دلال گرین ہوٹل کا مالک سید دلاور حسین شاہ۔ واہ شاہ جی! کیا کہنے ہیں آپ کے''۔

یہ کہہ کر تجمل اُٹھا اور ٹوپی سر پر رکھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

''تجمل جا چکا تھا اور دلاور حسین اسی طرح صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ بجلی کی روشنی میں اس کا چہرہ اس وقت کچھ بھیانک سا نظر آتا۔ آج پہلا روز تھا کہ کسی نے اس سے بھی کھری کھری کہی تھی۔ کتنی زبردست چوٹ تھی''۔ ''سادات کی لڑکی اور پیشہ ور اور دلال سید دلاور حسین شاہ!'' اس خیال کے آتے ہی اس کے بدن میں ایک کپکپی سی پیدا ہوئی اور ندامت سے اس کا سر خود بخود جھک گیا۔ اور عرق انفعال کے قطرے اس کی پیشانی پر چمکنے لگے اور آج اسے پہلی بار یہ خیال آیا کہ جو کھیل وہ کھیل رہا ہے اور جو ڈھونگ اس نے رچا رکھا ہے اس کا انجام کیا ہوگا۔ تجمل کا یہ کہنا کہ دنیا تو ہوٹل کو ابھی سے ایک قحبہ خانہ سمجھ رہی ہے ایک حقیقت تھی۔ اس کی بھنک تو کئی بار اس کے کان میں پڑ چکی تھی اور یہ کسے معلوم نہ تھا کہ گرین ہوٹل ایک فیشن ایبل قمار خانہ ہے اور ہوٹل گرل انہی لوگوں کی خاطر اس نے مقرر کر رکھی تھیں۔ لیکن یہ ہوٹل گرل کون تھیں۔ آوارہ لڑکیاں! یہ لڑکیاں ہوٹل کی ملازم نہیں تھیں بلکہ انہیں ''روزانہ اجرت'' ملتی تھی۔ اور جو لوگ ان کی ''خدمات'' حاصل کرنا چاہتے تھے انہیں دلاور حسین سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ ہر ایک لڑکی کا ''حق خدمت'' اور ''وقت'' مقرر تھا۔ ہوٹل کے منیجر کو مقررہ شدہ رقم دے دو اور قصہ ختم! اپنے طور پر ان لڑکیوں کو کوئی جو کچھ دے دے دلاور حسین کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ہم آپ سے پہلے کہہ چکے ہیں کہ دلاور حسین کا دین ایمان مذہب جو کچھ تھا پیسہ تھا۔ لیکن افسوس دولت بھی وفا کرتی نظر نہ آتی۔ وہ دن بھر زیادہ سے زیادہ روپیہ پیدا کرنے کی کوشش میں لگا رہتا اور مختلف قسم کے کاروبار میں روپیہ لگاتا رہتا لیکن منافع

حاصل ہونا تو رہا درکنار کئی بار اصل رقم بھی ڈوب جاتی۔اس لئے اسے اپنی ساکھ قائم رکھنے کے لئے عموماً قرض لینا پڑتا تھا پہلے تو اسے آسانی سے قرض مل جاتا۔لیکن جب اس کا اصل کیریکٹر لوگوں پر ظاہر ہونے لگا تو اسے قرض لینے میں بھی مشکلات کا سامنا ہونے لگا۔اور اس قرض کے سلسلے میں صادق علی خاں سے اس کی ملاقات ہوئی اور ہم آپ کو یہ بھی بتلا چکے ہیں کہ بہت سے سرد و گرم دیکھنے کے بعد صادق علی خاں کو جب خدا نے فراغت اور آسودگی عطا کی تو اس نے اپنی زندگی کا مقصد خدمت خلق بنالیا اور ہر طرح سے حاجت مندوں کی مدد کرنے لگا جسے خیرات کی ضرورت ہوتی خیرات دیتا۔اور جسے قرض کی ضرورت ہوتی قرض حسنہ دیتا اور قرض اس خوش اسلوبی سے وصول کرتا کہ دینے والے کو مطلق بار نہ ہوتا۔دلاور حسین پہلے پہل صادق آباد میں ہی اس سے ملا اور اس کے سامنے اپنی حاجت بیان کی اور ضرورت کے مطابق اس سے قرض لے آیا۔پھر یہ سلسلہ حسب ضرورت بڑھتا گیا اور آج صادق علی خاں کی ایک بہت بڑی رقم اس کے ذمہ تھی۔نہ جانے آج کیا بات تھی کہ دلاور حسین کو اپنی زندگی کا ہر پہلو بہت تاریک نظر آ رہا تھا۔اگر ہوٹل کی ساکھ جاتی رہی تو کیا ہوگا؟ اگر صادق علی خاں نے روپے کا تقاضا کیا تو ادائیگی کا کیا انتظام ہوگا۔لیکن ان سب باتوں کے علاوہ آج اسے ایک نیا خطرہ بھی محسوس ہو رہا تھا۔شریفہ کے دو الفاظ "میرا ایک جوان بھائی بھی ہے"۔اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔شریفہ کا بھائی! اس کے مرحوم بھائی دلدار حسین کا بیٹا! ایک غیور نوجوان۔اس کی بھاوج اس کے پاس مدد کے لئے آئی تھی۔لیکن اس نے ان بیکسوں کی مدد کیا کی۔شریف کو صادق علی خاں کے پاس ایک معمولی نوکر کی حیثیت سے بھجوا دیا اور ساتھ ہی غریب شریف کے خلاف خاں صاحب کے کان بھی بھر دیئے۔بھاوج کو ماماگری کرنے پر مجبور کیا اور شریفہ کو یتیم خانے میں یتیم لڑکیوں کی دیکھ بھال کے لئے ملازم کروا دیا۔پھر یتیم خانے کی مہتمم بیگم کے مرنے پر شریفہ کو ہوٹل میں لے آیا اور اسے ہوٹل گرلز کی فاحشہ لڑکیوں کے ساتھ شامل کر دیا۔اس وقت تو وہ انجام سے بالکل بے خبر اور بے پروا تھا لیکن آج ایک بہت بڑا خطرہ سامنے تھا۔شریفہ کے بھائی سے نبٹنا آسان نہ تھا۔

بجلی کے بلب کا دو چار پروانے طواف کر رہے تھے اور دیوار پر دو ایک چھپکلیاں شکار کی تاک میں لگی تھیں ایک پروانہ اپنے بال و پر جلا کر دلاور حسین کے کوٹ پر گرا۔اور بال و پر جل جانے کے باوجود وہ اُڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔دلاور حسین نے اُسے پکڑ کر ایک طرف پھینک دیا۔دیوار پر سے ایک چھپکلی تیر کی طرح آئی اور منہ کھول کر اسے ہڑپ کر گئی۔اور پھر دیوار پر چڑھ گئی۔دلاور حسین نے جو یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا ایک دو بار سر ہلایا اور بولا "دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے"۔اس نے سر اٹھا کر بجلی کے بلب کی طرف دیکھا۔پروانے اسی طرح شمع کے رُخِ آتشیں پر جل مرنے کے لئے بے تاب تھے۔وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے صوفے پر بیٹھا تھا۔اوپر کی ٹانگ کسی وقت خود بخود ہلنے لگتی۔بیٹھے بیٹھے اب اس کے خیالات نے اس کی کتاب زندگی کا ایک نیا ورق اُلٹ دیا۔

اُس کے گاؤں میں سلامت نامی نائن ایک خوبصورت لڑکی تھی۔گاؤں کے ایک نوجوان عزیز کو اس سے محبت تھی اور عزیز اس کا بچپن کا دوست تھا۔لیکن اُس نے گاموں مصلی کی معرفت جو اس کی خدمت کیا کرتا تھا سلامت سے ناجائز تعلق پیدا کر لیا۔اور جب اسے بھانڈا پھوٹنے کا خوف ہوا تو ایک خوفناک چال سے عزیز کے ہاتھوں گاموں کو قتل کروا دیا اور عزیز سے قتل کا تحریری اقبال کروالیا۔اس طرح ایک آسودہ حال نوجوان کی زندگی تباہ کر دی۔اب اس کے خیال نے کتاب زندگی کا دوسرا ورق اُلٹا اُس نے دنیا کو لُوٹنے کے لئے چند بدقماش آدمیوں کو ساتھ ملا کر پیری کا روپ دھارا اور فریب مکر ریاکاری اور شعبدہ بازی سے کئی ایک کو تباہ کیا اور آخر ایک معزز زمیندار کی اکلوتی لڑکی بیگم کو جو حسن و جمال میں چاند کو شرماتی تھی لے اڑا۔اور ایسا غائب ہوا کہ اُس کے ساتھی بھی اسے بہت روز تلاش کرنے کے بعد تھک ہار کر بیٹھ گئے۔

وہ کچھ عرصہ بیگم کو ساتھ لئے اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ آخر بیگم کے پیہم تقاضوں یا دھمکی سے مجبور ہو کر اس نے اس سے نکاح کر لیا۔ لیکن وہ خود ہی نکاح خواں تھا اور خود ہی وکیل اور نکاح کا گواہ وہی بد نصیب عزیز تھا۔ ایک سپید کاغذ پر حق مہر وغیرہ بھی لکھا گیا اور یہ کاغذ اس نے بیگم کو دے دیا۔ لیکن کچھ روز بعد یہ فرضی نکاح نامہ بھی کہیں گم ہو گیا۔

پھر تصور نے اس کی کتاب زندگی کا ایک اور ورق اُلٹ کر دکھایا۔ اب وہ ایک بارونق شہر میں ایک شاندار ہوٹل کا مالک تھا اور بیگم کی گود میں ایک ننھی سی بڑی خوبصورت لڑکی تھی۔ لیکن وہ چاہتا تھا کہ بیگم اس کے ہوٹل میں آنے جانے والوں کا دل بہلایا کرے لیکن بیگم اس کے لئے تیار نہ تھی۔ آخر وہ اس کی سختیوں سے تنگ آ کر ہوٹل میں کام کرنے لگی۔ لیکن ایک روز موقع پا کر بچی کو ساتھ لیکر گھر سے بھاگ گئی۔ لیکن اُس نے اسے پھر پکڑ لیا۔ اور بچی اُس سے چھین کر بیگم کو گھر سے نکال دیا۔ لیکن وہ اتنا سنگ دل تھا کہ اس معصوم جان کو بھی ٹھکانے لگانے کے لئے آمادہ ہو گیا۔ اور اسی رات اسے کمبل میں لپیٹ کر گھر سے نکلا۔ شہر سے کچھ فاصلے پر اینٹوں کا ایک پژاوہ تھا۔ اس بے رحم نے اس ننھی سی جان کو وہیں کہیں اینٹوں کے نیچے دبا دیا۔

اُس وقت ایک آدمی جس کا نام افضل تھا پژاوہ کے پاس سے گزرتا تھا اُس نے اچانک بچی کے چلانے کی آواز سنی اور آواز کے رخ پر جا کر بچی کو زندہ نکال لیا۔ افضل ابھی کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ اس معصوم جان کو یہاں کس نے زندہ گاڑ دیا کہ اسے کسی کے قدموں کی آواز آئی اور اُس نے لپک کر اسے (دلاور حسین کو) بھاگتے ہوئے پکڑ لیا۔ اور اسے پولیس کی چوکی پر لے جانا چاہا۔ آخر دلاور حسین نے اپنی عزت اور جان بچانے کے لئے افضل کی مرضی کے مطابق ایک تحریر اسی وقت اسے لکھ کر دی اور جان بچی لاکھوں پائے کہتا ہوا گھر واپس آ گیا۔

افضل کون تھا؟ کہاں کا رہنے والا تھا؟ اسے کچھ معلوم نہ تھا۔ لیکن جس طرح اس نے چالبازی سے عزیز کو قابو میں کر رکھا تھا آج قدرت نے اسی طرح اسے اس نا معلوم افضل ایسے پاجی کے قبضہ اختیار میں دے دیا اور آخر وہ افضل سے بھی گلو خلاصی کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ ایک خوفناک خطرے سے یوں بچ جانے کے خیال سے اسے اپنے بدن میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ وہ بڑے اطمینان سے صوفے سے سر لگا کر اور دونوں ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا اور چھت کی طرف دیکھ کر بولا۔

"دنیا بڑی چالباز ہے لیکن شاید دنیا کو یہ معلوم نہیں کہ دلاور حسین کی چالیں کبھی ناکام نہیں رہیں اور کوئی شخص میری آزادی پر ہاتھ نہیں ڈال سکا۔ لیکن اب یہ خطرناک دستاویزات پاس رکھنے سے کیا فائدہ۔ انہیں تلف کر دینا ہی اچھا ہے۔ ہاں! ابھی ابھی!"۔

ابھی ابھی! کہتے ہوئے وہ صوفے سے اٹھا اور اس کمرے میں جہاں اس نے اپنی تجوری رکھی تھی گیا۔ جیب سے چابی نکال کر اس نے تجوری کھولی اور کاغذوں کا ایک بنڈل کھولا اور اس میں سے نیلا لفافہ نکال لیا۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ لفافہ خالی ہے اور کاغذات گم ہیں اس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اس وقت خوف سے اس کی آنکھیں اُبل کر باہر آتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ گردن کی رگیں پھولی ہوئی تھیں۔ بدن کانپ رہا تھا اور پسینے چھوٹ رہے تھے۔ وہ کچھ دیر اسی حالت میں بیٹھا رہا۔ جب ہوش کچھ ٹھکانے ہوئے تو اس نے عزیز کو آواز دی۔ جب جواب نہ ملا تو اس نے پھر ایک اور آواز دی۔ لیکن پھر بھی کچھ جواب نہ ملا۔ اس وقت اُسے یاد آیا کہ عزیز تو شریفہ کے ساتھ چلا گیا تھا۔ دس بج چکے تھے اور عزیز ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔

نقلِ مکانی

دبے دبے ہوئے شعلے بھڑک بھی اُٹھتے ہیں
مری شکستہ نوائی میں بھی ہے رُستا خیز!

دلاور حسین کے مکان سے نکلتے ہی عزیز نے ایک تانگہ پکڑا۔شریفہ کو اس میں سوار کرالیا اور تانگے والے کو چوک چلنے کو کہا۔رات کا وقت تھا بازاروں میں ابھی خاصی چہل پہل تھی۔شریفہ چونکہ برقع نہیں اوڑھے ہوئے تھی کئی گزرنے والے ایک آدھ بار پلٹ کر کچھ دلچسپی سے اس کی طرف دیکھ لیتے اور وہ بیٹھی بیٹھی جھینپ جھینپ سی جاتی۔تانگہ دو ایک بازاروں سے گزر کر چوک میں آ گیا۔

''کہاں چلوں اب؟'' تانگے والے نے پوچھا۔

''بس یہیں رک جاؤ''۔عزیز نے کہا۔

عزیز اور شریفہ دونوں اس جگہ اترے۔عزیز نے تانگے والے کو کرایہ دے کر رخصت کر دیا اور شریفہ سے کہا۔

''بس اب تھوڑی ہی دور جانا ہے ہمیں۔تانگہ تو مکان تک بھی جا سکتا تھا۔لیکن میں نے احتیاطاً یہیں اُترنا مناسب سمجھا۔تم میرے ساتھ چلی آؤ بیٹی''۔

''اماں تو سرائے میں رہتی ہے''۔شریفہ نے دبی زبان سے کہا۔

''ہاں ہاں مجھے معلوم ہے''۔عزیز نے جواب دیا۔''کچھ فکر مت کرو بیٹی میرے ساتھ ساتھ چپکی چپکی چلی آؤ''۔

شریفہ ساتھ ہو لی۔چوک سے کوئی فرلانگ ایک کے فاصلے پر کالے خاں پنواڑی کی دوکان تھی۔دوکان پر دو چار گاہک کھڑے پان لے رہے تھے۔دوکان ایک گلی کے نکڑ پر پڑتی تھی گلی میں اندھیرا تھا۔عزیز نے شریفہ کو گلی میں کھڑے ہونے کو کہا اور خود دکان پر چلا گیا۔شریفہ دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔کوئی دو منٹ میں عزیز کالے خاں سے چابی اور دیا سلائی لے کر آ گیا۔اسی گلی میں اس بالاخانے کا جو کالے خاں کی دکان کے اوپر تھا دروازہ تھا۔عزیز نے تالا کھولا اور دیا سلائی جلا کر شریفہ کو سیڑھیوں کا راستہ دکھاتا ہوا اوپر لے گیا۔اوپر جا کر اس نے ٹٹول کر ایک لالٹین روشن کی۔ایک بڑا کمرہ تھا۔بغل میں ایک اور کوٹھری تھی۔یہ غالباً غسل خانے کا کام دیتی تھی۔ایک کمرے میں ایک طرف ایک معمولی سی کھری چارپائی پڑی تھی دوسری میں قفل لگا ہوا تھا۔

''بیٹھ جاؤ بیٹی!'' عزیز نے لالٹین کھونٹی سے لٹکاتے ہوئے کہا۔

شریفہ کچھ سہمی سہمی نظروں سے سیڑھیوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔عزیز نے پھر کہا۔

''بیٹی کچھ اندیشہ مت کرو۔تم یہاں بیٹھ جاؤ۔میں تمہاری ماں کو ابھی لاتا ہوں''۔

''بابا!تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو۔سرائے میں جہاں اماں رہتی ہے وہاں کیوں نہیں چلتے''۔شریفہ نے پوچھا۔

''شریفہ بیٹی!عزیز اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔''ابھی تم مجھ سے مت کچھ پوچھو ایک منٹ ضائع کرنا بھی اس وقت خطرناک ہے۔تم یہاں بلا خدشہ بیٹھو اور اوپر کا دروازہ بند کرلو۔میں باہر کا دروازہ بند کر جاؤں گا۔اگر ڈر لگتا ہو تو بازار کی جانب کی ایک کھڑکی کھول لو۔شاباش میری بیٹی۔اب بیٹھ جاؤ تم۔میں تمہاری ماں کو لاتا ہوں''۔

پیشتر اس کے کہ شریفہ کچھ کہے وہ نیچے چلا آیا اور باہر سے قفل ڈال دیا۔بازار میں آکر اس نے ایک تانگہ لیا اور اسے سرائے چلنے کو کہا۔

زینب کھانا پکا چکی تھی اور کوٹھری کا آدھا کواڑ کھولے کھاٹ پر لیٹی لالٹین کی روشنی میں کوئی کتاب دیکھ رہی تھی۔عزیز نے باہر سے دروازے پر دستک دی۔

''کون ہے؟''زینب نے پوچھا۔

''میں ہوں عزیز بی بی جی!''باہر سے عزیز نے جواب دیا۔''آپ چلنے کی تیاری کریں میں تانگہ لے کر آیا ہوں''۔

''دلاور حسین نے گھر پر رہنے کو بلایا ہے''۔زینب نے خوشی سے پوچھا۔''مجھے وہاں لے جانے کو تانگہ بھیجا ہے''۔

''شاہ جی کے ہاں آپ کو نہیں جانا''۔عزیز نے باہر سے جواب دیا۔''میں نے اور جگہ آپ کے رہنے کا انتظام کیا ہے۔لیکن جلدی کیجئے ذرا۔آپ کہیں تو میں اندر آکر سامان باندھ دوں''۔

''دلاور حسین نے ہی کوئی مکان ہمارے لئے لیا ہوگا''۔زینب اندر سے بولی''میرے.....''

لیکن عزیز بات کاٹ کر بولا۔

''آپ چلنے کے لئے جلدی تیار ہو جائیں۔وقت ضائع ہو رہا ہے بی بی جی!''

''شریفہ کے بغیر کیسے چلی جاؤں''۔زینب نے جواب دیا۔''وہ آئے گی تو بہت پریشان ہوگی''۔

''چھوٹی بی بی جی کو تو میں مکان پر چھوڑ آیا۔''عزیز نے جواب دیا۔''آپ جلدی کریں وہ بیٹھی انتظار کر رہی ہوں گی''۔

''شریفہ کو آج ہوٹل سے اتنی جلدی فرصت کیسے ہوگئی''۔زینب نے پوچھا۔''شاید اس کے چچا نے ہی اسے نئے گھر کی دیکھ بھال کے لئے بھیج دیا ہوگا''۔

''آپ جلدی کریں بی بی جی!''عزیز نے باہر سے پھر کہا۔آپ پردہ کرلیں میں سامان سمیٹنے اندر آتا ہوں''۔

''میری بات سنو تم!''زینب نے اندر سے کہا۔''کھانا پکا رکھا ہے تم شریفہ کو یہیں لے آؤ کھانا کھا کر چلیں گے۔ایسی بھی کیا جلدی ہے''۔

''آپ کھانا ساتھ لے لیں''۔عزیز نے کہا''یا یہاں کسی کو دے دیں۔کھانے کا انتظام وہاں بھی ہو جائے گا۔لیکن جلدی کریں ذرا''۔

''تو پھر تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ دلاور حسین نے کھانا بھی ہوٹل سے بھجوا دیا ہے''۔زینب نے اندر سے کہا۔

''آپ برقع لے لیں میں اندر آتا ہوں''۔عزیز نے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا۔تانگے والا ابھی جانے کو کہتا ہے''۔''بھائی!''زینب

بولی۔ ''تم تو اپنے آدمی ہو۔تم سے کیا پردہ۔آ جاؤ اندر''۔

عزیز اندر چلا گیا اور ادھر اُدھر سے سامان سمیٹ کر تانگے پر لادا اور زینب کو سوار کرا کر کالے خاں کے بالا خانے پر لے آیا اور مزدور کو بلوا کر سامان بھی اوپر رکھوا دیا۔زینب بیٹی کے پاس ہی کھاٹ پر بیٹھ گئی۔ماں کو دیکھ کر شریفہ رونے لگی۔

''کیا ہوا شریفہ؟'' ماں نے تعجب سے پوچھا۔''تم رونے کیوں لگیں؟''

''روتی ہوں اپنی قسمت کو''۔شریفہ نے ساری کے پلو سے آنکھیں خشک کر کے کہا۔

''اری! تم ابھی تک ناراض ہی ہو''۔ماں بولی۔''آخر تمہارے چچا نے یہ مکان لے ہی دیا نا۔کیوں اب تو......''

لیکن شریفہ بات کاٹ کر بولی۔''اماں! اس مردود کا آج سے میرے سامنے کبھی نام مت لینا۔وہ انسان نہیں شیطان ہے''۔

''سمجھی!'' ماں بولی۔''آج کسی بات پر اس نے تمہیں سرزنش کی ہوگی اور تم وہاں سے روٹھ کر آ گئی ہو۔کبھی یہ بچپن جائے گا بھی تمہارا۔ میں تم سے یہ کہتے کہتے ہار گئی کہ اپنے چچا کو کبھی ناراض مت کرو لیکن تم پر کچھ اثر ہوتا ہی نہیں۔آخر تمہیں اس کی جائیداد کا ایک روز مالک بننا ہے۔وہ''

''آگ لگے اس مردود کی جائیداد کو''۔شریفہ نے ناک سنک کر کہا۔''میں تو تھوکوں گی بھی نہیں اس کی جائیداد پر۔تم کل ہی شریف بھائی کو کسی طرح بلوا بھیجو۔اس لعین سے وہی لپٹ سکے گا''۔

''شریفہ ہوش کرو''۔ذرا غصے سے بولی۔''یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟''

اتنے میں عزیز بھی نیچے سے آ گیا۔وہ ماں بیٹی کے لئے بازار سے مٹھائی لایا تھا۔مٹھائی دونوں کے آگے رکھ کر بولا۔''یہ لیجئے کھائیے''۔

''دلاور حسین نے بھیجی ہے؟'' زینب نے پوچھا۔''صبح اُسے بلوا کر کہوں گی کہ مکان میں بجلی بھی لگوا دے''۔پھر بیٹی سے۔''دیکھا تمہارے چچا کو ہمارا کتنا خیال ہے۔کتنا اچھا آدمی ہے تمہارا چچا''

عزیز ایک دو بار آنکھیں جھپکا کر بولا۔''بی بی جی! آپ خدا کا شکر کریں کہ اُس نے آج آپ کی لاج رکھ لی۔آپ کو مناسب نہ تھا کہ آپ شریفہ بی بی کو ہوٹل میں کام کرنے پر مجبور کرتیں۔میں کہتا ہوں آپ خدا کا شکر کریں کہ آپ کی بیٹی آج ایک جہنم سے نکل آئی ہے''۔

''میں تو خاک بھی نہیں سمجھی!'' زینب بولی۔''جانے تم کیا کہہ رہے ہو؟''

عزیز نے مختصر الفاظ میں اسے سب قصہ سنا دیا اور کہا۔''بی بی جی! شریف میاں کے آنے تک آپ کو یہیں رہنا ہوگا۔اور میں بھی آپ کے پاس ہی رہوں گا''۔

''لیکن وہاں سرائے میں کیا ہرج تھا'' ۔زینب نے پوچھا۔''اس مکان کا کرایہ بھی دس بیس سے کم نہ ہوگا''۔

''آپ کرایہ کا فکر نہ کریں۔اللہ انتظام کر دے گا۔ہاں آپ کو یہاں لانے کی وجہ یہ ہے کہ اس واقعہ کے بعد اگر آپ سرائے میں رہتیں تو ممکن تھا کہ دلاور حسین آپ کو پھر پریشان کرتا۔اس لئے اُس کے شر سے محفوظ رہنے کیلئے آپ کو یہاں لے آیا ہوں آپ صرف اس وقت تک یہاں رہیں گی جب تک شریف میاں نہیں آ جاتے''۔

''شریف بھائی کب آئے گا؟'' شریفہ نے پوچھا۔

''کل انہیں خط لکھوں گا امید ہے دوسرے روز تک آ جائیں گے''۔عزیز نے جواب دیا۔

''تم خود جا کر لے آؤ''۔شریفہ نے کہا۔

''میں چلا گیا تو آپ کی نگہداشت کون کرے گا؟''عزیز نے جواب دیا۔''صادق آباد کو جو لاریاں جاتی ہیں ان کے شوفروں میں سے بعض سے میری علیک سلیک ہے ان میں سے کسی کے ہاتھ خط بھجوا دوں گا آپ کچھ فکر مت کریں''۔

''اب تم ہوٹل واپس نہیں جاؤ گے کیا؟''شریفہ نے پوچھا۔

''نہیں!''عزیز نے جواب دیا۔''خدا نہ کرے کہ میں پھر اس پاجی کی شکل دیکھوں۔اس کے کرتوت دیکھ دیکھ کر تو شیطان بھی کان پکڑتا ہو گا''۔

''دل نہیں مانتا کہ دلاور حسین ایسا برا آدمی ہو''۔زینب نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

''اماں!''شریفہ دونوں ہاتھ جوڑ کر ذرا غصے سے بولی۔''میری طرف دیکھو میں ہاتھ جوڑتی ہوں خدا کیلئے اس ملعون کا میرے سامنے اب پھر نام مت لینا ورنہ میں دیوار سے ٹکر مار کر سر پھوڑ لوں گی''۔

اور عزیز دانت پیس کر بولا۔''بی بی جی!آپ چونکہ خود بڑی نیک ہیں اس لئے دوسروں کو بھی اچھا سمجھتی ہیں لیکن اگر میں اس انسان نما شیطان کی سیاہ کاریوں کی داستان آپ سے کہوں تو آپ کی راتوں کی نیند اُچاٹ ہو جائے گی۔خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ آپ اس کے ہتھکنڈوں سے بچ گئیں لیکن اب اُسے مجھ سے۔عزیز سے نبٹنا ہے دعا کیجئے خدا اس پر رحم کرے مجھے بھی اس ملعون سے کبھی کا حساب چکانا ہے''۔

''تمہیں بھی دلاور حسین سے کچھ شکایت ہے کیا؟''

''ہاں وہی جو کسی مسافر کو راہ مار سانپ سے ہوتی ہے''۔عزیز نے جواب دیا۔''آپ جس پاجی کا بار بار نام لیتی ہیں یہ انسان کے روپ میں شیطان ہے بھیڑ کے روپ میں خونی بھیڑیا ہے۔یہ سیدؔ نہیں بلکہ یزید ہے۔یہ وہ ملعون ہے جس کا ہر سانس بس میں بھرا ہوا ہے۔جو فریب کاری اور عیاری میں شیطان کے بھی کان کاٹتا ہے۔یہ خونی بھیڑیا تمام عمر بنی نوع انسان کا خون چوستا رہا ہے لیکن اب اس کا معاملہ عزیز سے ہے اس کی سیاہ کاریوں کے حساب کا دن قریب آ گیا ہے اور جہنم کا داروغہ مالک جہنم کے دروازے پر کھڑا اس کی راہ دیکھ رہا ہے''۔

''عزیز!''زینب بولی۔''تمہاری باتیں سن کر مجھے تو کچھ خوف آنے لگا ہے۔میں تو دل میں کچھ اور سمجھ رہی تھی اور سن کچھ اور رہی ہوں''۔

''بی بی جی!''عزیز دو ایک بار آنکھیں جھپکا کر بولا۔''آپ جو کچھ سمجھ رہی تھیں گستاخی معاف!غلط سمجھ رہی تھیں اور جو کچھ آپ سن رہی ہیں یہ اس خوفناک داستان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جو میں کسی روز آپ سے عرض کروں گا۔آپ آج سے مجھے اپنا خادم سمجھیں اور خدا سے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو دلاور حسین کے شر سے محفوظ رکھے''۔

''آمین!''شریفہ نے کہا۔

رات کافی جا چکی تھی۔سب سونے کا انتظام کرنے لگے۔اگلے روز عزیز نے کسی بس کے شوفر ہاتھ شریف حسین کو ایک خط لکھ کر بھیج دیا۔

رمز و کنایات

دیکھتا ہوں تو بہت کچھ ہے خمارِ غم دوست
سوچتا ہوں تو مئے ہوش رُبا کچھ بھی نہیں
میں تہیدست ہوں تسلیم مجھے بھی ہے مگر
دل ہی سب کچھ ہے یہاں دل کے سوا کچھ بھی نہیں
ان کی منشائے طلب اور ہی کچھ اور یہاں
چند ٹوٹی ہوئی سانسوں کے سوا کچھ بھی نہیں

(ساغر چشتی)

شریف حسین کے ان الفاظ سے "طاہرہ محبت میرے لئے حرام ہے"۔ طاہرہ کی دُنیا پر اُداسی کی گھٹا چھا گئی۔ وہ جب گھر واپس آئی تو اتنی پریشان تھی کہ صادق علی خاں بھی یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"طاہرہ بیٹی خیر تو ہے؟"

"ہاں اچھی ہوں بابا جان!" طاہرہ نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن تمہارا چہرہ تو آج غیر معمولی طور پر اُترا ہوا ہے"۔ خاں صاحب نے پوچھا۔ "کہاں گئی تھیں؟"

"کہیں بھی نہیں"۔ طاہرہ نے جواب دیا۔

"کہاں سے آ رہی ہو؟" خاں صاحب نے پوچھا۔

"ندی پر سے"۔ طاہرہ نے جواب دیا۔

"کوئی مچھلی ملی؟" خان نے پوچھا۔

"آج تو میں ایسے ہی جا بیٹھی تھی!" طاہرہ نے کہا۔

"اکیلی ہی کیا؟" خان نے پوچھا۔

"نہیں! شریف حسین بھی تھا"۔ طاہرہ نے جواب دیا۔

"شریف حسین بہت شریف لڑکا ہے"۔ خان صاحب نے کہا۔ "اور ہے بھی سادات خاندان سے!"

''لیکن اسے تو یہ کام پسند نہیں''۔طاہرہ بولی۔''مجھے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہیں جانے کی سوچ رہا ہے''۔

''کچھ کہا تھا تم سے؟''

''مجھ سے تو نہیں کہا''۔طاہرہ نے جواب دیا۔''لیکن اس کی باتوں سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ خوش نہیں''۔

''ہاں!''خان صاحب نے جواب دیا۔''مجھے بھی وہ بڑا عالی ہمت لڑکا معلوم ہوتا ہے۔اور اس میں کام کرنے کی صلاحیت نظر آتی ہے''۔

''جب تک وسائل نہ ہوں صلاحیت سے کیا بنتا ہے ابا جان!''طاہرہ نے کہا۔''اور غالباً اسی فکر میں وہ گھلا جا رہا ہے''۔

''اوہو!''صادق علی خان مسکرا کر بولا۔''گویا تم دونوں ایک دوسرے کے راز دار ہو''۔

''بابا جان!''طاہرہ ذرا شرما کر بولی۔''اس میں اگر کچھ نقص ہے تو یہی ہے۔یا تو وہ کسی پر اعتماد کرنا نہیں چاہتا یا اسکی طبیعت ہی کچھ ایسی ہے''۔

''ہاں!''صادق علی خاں بولا۔''یہ تو میں بھی دیکھتا ہوں کہ نوجوانوں میں جو ایک چلبلاہٹ ہوتی ہے اس میں نہیں تاہم مجھے اس کے ارادے بہت بلند معلوم ہوتے ہیں''۔

''مجھے تو کچھ مظلوم سا معلوم ہوتا ہے''۔طاہرہ نے کہا۔

''لیکن ہے تو شریف طبیعت!''خان صاحب نے کہا۔

''ہاں!بہت شریف طبیعت''۔طاہرہ نے جواب دیا۔

''بہر کیف میں خوش ہوں کہ تمہیں ایک اچھا ساتھی مل گیا''۔صادق علی خاں نے مسکرا کر کہا۔

''بابا جان!لیکن ایسا شخص جسے کسی پر اعتماد نہ ہو کیسے اچھا ساتھی ہو سکتا ہے''۔طاہرہ نے جواب دیا۔

''بیٹی!''صادق علی مسکرا کر بولا۔''تم نے اگر اس کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کی ہوتی تو شاید تمہیں اس سے گلہ نہ ہوتا''۔

''بابا جان!''طاہرہ نے کہا۔''میرے خیال میں تو جو اعتماد کوشش سے حاصل کیا جائے وہ اعتماد نہیں ہوتا۔پھر ایسے شخص کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کیا کرنا جو جانے کب یہاں سے چلا جائے۔آپ ابھی ابھی فرما رہے تھے کہ وہ ایک عالی ہمت آدمی ہے لیکن یہاں بیٹھ کر وہ اپنے ارادوں میں کیسے کامیاب ہو سکتا ہے۔پھر ملازمت میں ترقی کا میدان ہمیشہ محدود ہوتا ہے اور جہاں تک میں دیکھتی ہوں غالباً اسے فکر بھی یہی ہے''۔

''بیٹی!''صادق علی خاں بولا۔''ہر بات کے لئے ایک وقت مقرر ہے۔وقت سے پہلے کچھ نہیں ہو سکتا۔میں عموماً شریف کے متعلق سوچتا رہتا ہوں۔دیکھو خدا کو کیا منظور ہے''۔

اسی رات جب تینوں کھانے پر بیٹھے تو شریف حسین آج خلاف معمول کچھ خاموش نظر آتا تھا۔کچھ علمی ادبی بحث چھڑ گئی۔جہاں تک اُردو ادب کا تعلق تھا طاہرہ کا مطالعہ بہت وسیع معلوم ہوتا۔اس نے ترقی پسندانہ ادب کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔اور باوجود ایک ترقی پسند ماحول میں رہنے کے ترقی پسند ادیبوں کی مخالف تھی''۔

''اگر تمہیں ان لوگوں کا لٹریچر پسند نہیں تو پھر پڑھتی کیوں ہو؟''صادق علی خاں نے پوچھا۔اور طاہرہ نے جواب دیا۔

''بابا جب تک کسی چیز کا انسان کو علم نہ ہو وہ اس کے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کرسکتا۔ میں نے جب تک ان لوگوں کی تصانیف دیکھی نہیں تھیں میری رائے ان کے متعلق بہت اچھی تھی۔ لیکن جب میں نے ان کی تصانیف اور مضامین پڑھے اور ان پر غور کیا تو بابا جان یقین مانئے مجھے کچھ افسوس ہونے لگا کہ میں نے یہ کتابیں کیوں منگوائیں۔ میں جن ایام میں بورڈنگ میں تھی کبھی کوئی لڑکی کوئی ادبی رسالہ لے آئی تھی اور کبھی کسی ترقی پسندانہ ادب کی جھلک بھی ان رسائل میں نظر آجاتی تھی۔ میرے خیال میں وہ اس دور کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اس وقت تو اس قسم کی تحریر پڑھنے میں بہت لطف آتا۔ لیکن اس کے بعد وہ زمانہ جسے آپ غالباً ترقی پسندانہ ادب کے عروج کا زمانہ کہیں گے یعنی یہ موجودہ دور تو یہ لوگ اپنے اصلی رنگ میں نظر آنے لگے اور مجھے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ وہ لٹریچر جو یہ لوگ پیش کررہے ہیں تعمیری ہونے کی بجائے سخت تخریبی ہے''۔

''شریف!'' خان صاحب نے پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے؟''

''مجھے تو لٹریچر کے مطالعہ کا کچھ ایسا موقع نہیں ملا''۔ شریف نے جواب دیا۔ ''لیکن کم وبیش جتنا بھی میں نے دیکھا ہے میرا بھی یہی خیال ہے کہ یہ کوئی سودمند چیز نہیں''۔

''مجھے تو تم دونوں کی رائے سے اختلاف ہے''۔ خان صاحب نے مسکرا کر کہا۔ ''میں نے بھی کچھ اس قسم کی کتابیں دیکھی ہیں۔ چونکہ لکھنے والے نوجوان ہیں اس لئے ان کی تحریر میں جوانی کی جھلک یا بے باکی کا ہونا ایک قدرتی بات ہے''۔

''جوانی کی جھلک کا ہونا تو واقعی ایک فطری چیز ہے لیکن جناب جوانی کی بے باکیوں کو اجاگر کرنا تو پرلے درجے کی بدمذاقی ہے''۔ شریف نے جواب دیا۔

''شاباش!'' صادق علی خاں نے خوش ہو کر کہا۔ ''یہی میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔ میں تو خیر اب بوڑھا ہوں لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے گزشتہ زمانے میں بھی اس قسم کی تحریر کچھ زیادہ پسند نہ کی جاتی تھی۔ بلکہ ایسے مصنف پھکڑ سمجھے جاتے تھے۔ اصل چیز تو تربیت ہے۔ اگر اوائل عمر میں کسی کی تربیت اچھی ہوئی ہو تو جوانی میں بھی اس کا اثر قائم رہتا ہے۔ جہاں تک میں سوچتا ہوں میرے خیال میں وہ نوجوان جن کی تحریر اخلاق اور تہذیب کی حدود سے تجاوز کرجاتی ہے۔ ان کی اس بے راہروی کی وجہ یقیناً یہ ہوتی ہے کہ اوائل عمر میں ان کی تربیت کے جو لوگ ذمہ دار تھے انہوں نے اپنا فرض پورا نہیں کیا''۔

''بابا جان!'' طاہرہ بولی۔ ''ستم تو یہ ہے کہ بیباکی اور عریانی میں ترقی پسند ادیب عورتیں مردوں سے بھی پیش پیش ہیں۔ میں حیران ہوتی ہوں کہ ان کا نسوانی حجاب کیا ہوا؟''

تمہیں ترقی پسند ادیب عورتوں سے شکایت ہے اور مجھے عام مسلمان عورتوں سے یہی شکوہ ہے''۔ صادق علی خاں نے کہا۔ ''یاد ہے گئے سال جب گرمیوں کے موسم میں ہم پہاڑ پر گئے تھے خدا کی قسم! مسلمان عورتوں کی بیباکی' بے پردگی' زیب وزینت اور فیشن پرستی دیکھ دیکھ کر جو کچھ میرے دل پر گزرتی تھی وہ میرا ہی دل کچھ جانتا ہے۔ اللہ! اللہ ایک وقت تھا کہ یہی دختران اسلام' اسلام کے نام پر جان قربان کرتی تھیں اور آج بھی وہی دختران اسلام ہیں جو اسلام کے نام پر کلنک کا ٹیکہ بنی ہوئی ہیں۔ نہ غیرت' نہ شرم' نہ حیا۔ ایک مسلمان عورت اور ایک غیر مسلمہ میں اب کوئی تمیز نہیں رہی۔ نماز روزہ کے نام سے اس طرح گھبراتی ہیں جیسے کوئی وبا سے۔ مسلمانوں پر جو تباہی آئی ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم اسلام سے بہت

دور ہو گئے ہیں“۔

”خاں صاحب!“ شریف نے کہا۔”جب مردوں میں غیرت نہیں رہی تو عورتوں میں کہاں سے آئے۔ دو ایک بار مجھے بھی گرمی کا موسم پہاڑ پر گزارنے کا موقع ملا ہے۔ مجھے تو ان مسلمان بھائیوں کی غیرت پر افسوس ہوتا تھا جو اپنی مستورات کو بے حجابانہ ساتھ لئے پھرتے تھے“۔

”شریف!“ صادق علی خاں مسکرا کر بولا۔”خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ ماشاءاللہ تم بھی جوان ہو۔ کہیں تم بھی اس رو میں مت بہ نکلنا“۔

”خاں صاحب!“ شریف نے جواب دیا۔”میں ایک غریب آدمی ہوں۔ آپ کی بندہ پروری سے اطمینان کا سانس لے رہا ہوں۔ دعا کیجئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ مجھے اسلام کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا کرے۔ گو مجھے دنیا کا کچھ ایسا تجربہ نہیں لیکن میں نے دیکھا ہے کہ ماحول کا اثر انسان پر ضرور پڑتا ہے اور اس کا کم وبیش تجربہ مجھے کالج لائف میں ہوا تھا۔ کالج کا ماحول آزادی کا ماحول ہوتا ہے۔ کالج میں اکثر لڑکے چولا بدل لیتے ہیں۔ اور مذہب اور قومی تہذیب سے کورے ہو جاتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر وہی جن کے پلے چار پیسے ہوں“۔

”درست ہے“۔ صادق علی خاں نے کہا۔”میری دعا ہے خدا تمہیں ہمیشہ راہِ راست پر چلنے کی توفیق عطا کرے لیکن مجھے تم سے ایک شکوہ بھی ہے“۔

شریف نے تعجب سے خان صاحب کی طرف دیکھا اور وہ مسکرا کر بولا۔

”نہیں! نہیں! مجھے نہیں! طاہرہ تم سے کچھ ناراض ہے“۔

”کیا خطا ہوئی مجھ سے؟“ شریف نے پوچھا۔

”طاہرہ کو تم سے شکایت ہے کہ تم کسی کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھتے“۔ صادق علی خاں نے مسکرا کر کہا۔

شریف نے سر جھکا لیا اور پھر خان صاحب کی طرف دیکھ کر بولا۔

”قبلہ! آپ کے اور ان کے احسانات سے تو میں مر کر بھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ اعتماد کا کیا سوال۔ بیشک میں غریب ہوں لیکن احسان فراموش نہیں۔ مجھے تعجب ہے کہ طاہرہ بیگم کو مجھ سے کیوں شکایت ہوئی“۔

”یہ اسی سے پوچھو“۔ صادق علی نے مسکرا کر جواب دیا۔”طاہرہ نے مجھ سے شکایت کی تھی اور میں نے تم سے کہہ دیا۔ رہا احسان مند ہونا تو اگر ہم کچھ تمہاری مدد کر رہے ہیں تو یہ کوئی احسان نہیں۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں اور تم اس کے مستحق ہو“۔

”آپ کی عنایت ہے قبلہ!“ شریف حسین نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔

”طاہرہ!“ خاں صاحب نے محبت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔”تم بتاؤ تمہیں کیا شکایت ہے شریف سے؟“

”مجھے یہ ہر وقت کی خاموشی اور اُداسی کچھ بھلی نہیں معلوم ہوتی“۔ طاہرہ نے میز پر سے اُٹھتے ہوئے کہا۔”جو آدمی ہر بات کا تاریک پہلو سوچے وہ نہ تو خود خوش رہ سکتا ہے اور نہ کسی دوسرے کو خوش رکھ سکتا ہے“۔

صادق علی اور شریف بھی اپنی اپنی جگہ سے اُٹھے

"شریف سنتے ہو؟" صادق علی نے ہنس کر کہا۔

"ہاں قبلہ سن رہا ہوں؟" شریف نے جواب دیا۔

"تو پھر جواب دو نا"۔صادق علی خاں نے تولیہ سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"قبلہ باروشنی کے بعد جب آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جائے تو ہر چیز تاریک ہی نظر آتی ہے"۔شریف نے جواب دیا"۔رات کی تاریکی میں چمکنے والے تارے آفتاب کی ضیا پاشیاں کیا جانیں"۔

تینوں ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔

"اگر ستاروں کو احساس کمتری ہوتا تو شاید چمکنے کی کبھی جرأت نہ کرتے"۔طاہرہ نے جواب دیا اور صادق علی خاں مسکرا کر بولا۔

"بھئی خوب ادیبانہ نوک جھوک ہے"۔

طاہرہ اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور ایک کتاب اُٹھا لائی۔

"یہ کیا کتاب ہے؟" صادق علی خاں نے پوچھا۔

"ایک ناول ہے......رقص بہار......" طاہرہ بولی۔"میں یہ ناول دوبار پڑھ چکی ہوں میرے خیال میں شریف کو بھی یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہئے"۔

"کوئی خاص بات ہے کیا؟" خاں صاحب نے پوچھا۔

"ہاں!" طاہرہ نے جواب دیا۔"اس ناول کے مطالعہ سے پڑھنے والے کو یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ مایوسی اور تاریکی میں بھی ہمت والے کبھی گھبراتے نہیں۔بڑا دلچسپ رومان ہے"۔

"پھر تو میں بھی پڑھوں گا"۔صادق علی خاں نے طاہرہ کے ہاتھ سے کتاب لیتے ہوئے کہا۔

"ضرور پڑھئے بابا جان!" طاہرہ نے کہا۔"آپ دیکھیں گے کہ آزاد ملک کے رہنے والوں کے حوصلے اور عزائم کتنے بلند ہوتے ہیں۔بڑی ہی دلچسپ کتاب ہے"۔

"کوئی محبت کی داستان ہوگی"۔خان صاحب نے"رقص بہار" کے ورق اُلٹتے پلٹتے کہا۔"مگر محبت کے بغیر تو انسان کی زندگی بھی مکمل نہیں ہوتی۔شریف کیا خیال ہے تمہارا؟"

"قبلہ! مجھے تو کچھ تجربہ نہیں"۔شریف حسین نے جواب دیا۔

"ارے!" خاں صاحب مسکرا کر بولے۔"محبت اور جوانی کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔اور تم کہہ رہے ہو کہ تمہیں کچھ تجربہ نہیں۔کیا تم محبت کے قائل نہیں"۔

"یہ تو پریشانیوں اور تفکرات کے قائل ہیں"۔طاہرہ نے مسکرا کر کہا۔

"کیسے تفکرات؟" صادق علی خاں نے پوچھا۔"نوجوان ان باتوں کی پروا نہیں کیا کرتے۔مصیبت تو ایک امتحان ہے۔جو طالب علم

امتحان کی تیاری سے گھبرائے وہ امتحان میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔دنیا میں ایسے امتحان سے انسان کو عموماً گزرنا ہی ہوتا ہے۔امتحان سے کیا گھبرانا"۔

"اور جس شخص کے پاس کوئی وسیلہ ہی نہ ہو وہ کیا کرے قبلہ؟" شریف حسین نے پوچھا۔

"جس نے پیدا کیا ہے وہ وسیلہ بھی پیدا کرسکتا ہے"۔صادق علی خاں نے جواب دیا۔"تم جوان ہو تمہیں ایسی باتوں سے فکرمند نہیں ہونا چاہئے۔جوانی کا خواب تو بہت سہانا ہوتا ہے"۔

"خوابِ جوانی!" شریف نے ایک آہ بھر کر کہا۔ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے صادق علی خاں اور طاہرہ نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔شریف حسین رومال سے آنکھیں خشک کرتا ہوا اُٹھا اور بولا۔

"قبلہ!اس وقت اجازت دیجئے۔صبح قدم بوسی کو حاضر ہوں گا"۔

یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔صادق علی خاں اور طاہرہ دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔پھر صادق علی خاں بولا۔

"بہت ستم رسیدہ ہے غریب!"

"معلوم ہوتا ہے اس نے کچھ بھلے دن بھی دیکھے ہیں"۔طاہرہ نے کہا۔

"کبھی تم سے اپنے حالات تو نہیں کہے"۔خان صاحب نے پوچھا۔

ممکن تھا طاہرہ اس کا راز فاش کردیتی۔لیکن اسے اپنا وعدہ یاد آگیا۔

"مجھ سے تو کبھی کچھ ذکر نہیں کیا"۔اس نے جواب دیا۔"لیکن اس کی باتوں سے ہمیشہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں عزت اور آبرو سے رہنا چاہتا ہے"۔

"انشاءاللہ!" صادق علی خان نے کہا۔طاہرہ نے اٹھ کر ریڈیو کھول دیا اور صادق علی خاں "رقصِ بہار" دیکھنے لگا۔

شریف حسین جس وقت اپنے مکان پر پہنچا تو میز پر ایک خط رکھا تھا۔لیکن یہ خط ڈاک سے نہیں آیا تھا۔شریف حسین نے چوکیدار کو بلایا اور پوچھا۔

"یہ خط کون لایا؟"

"ایک شوفر دے گیا تھا جناب!" چوکیدار نے جواب دیا۔

"کب آیا تھا؟" شریف حسین نے پوچھا۔

"آپ کے خان صاحب کے پاس جانے کے بعد ہی"۔چوکیدار نے جواب دیا۔

پھر لفافہ پر اپنا نام پتہ دیکھا۔یہ تحریر اُس کے لئے نئی تھی۔اس نے لفافہ پھاڑ کر خط نکالا۔یہ عزیز کا خط تھا۔

شریف میاں!

السلام علیکم!آپ کے جانے کے بعد حالات تیزی سے بدلتے رہے۔غالباً بڑی بی بی جی کے خطوں سے آپ کو معلوم ہوتا رہتا ہوگا۔یا ہو سکتا ہے کہ بی بی جی نے اس خیال سے کہ کہیں آپ پریشان ہو کر واپس نہ چلے آئیں آپ کو نہ لکھا ہو۔لیکن کل ایک ایسا واقعہ ہوا جو بالکل خلاف توقع

تھا۔ آپ یہ خط دیکھتے ہی واپس تشریف لے آئیں اور سیدھے کالے خان پنواڑی سے آ کر ملیں آپ کو معلوم ہی ہے کالے خاں کی دکان چوک سے ذرا آگے ایک گلی کے نکڑ پر ہے۔ بڑی بی بی جی اور چھوٹی بی بی بفضل خدا خیریت سے ہیں۔

آپ کا خادم

عزیز

شریف حسین نے کھڑے کھڑے یہ خط پڑھ لیا۔ پھر وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور پھر ایک بار پڑھا۔ وہ حیران تھا کہ کون سا ایسا خلاف توقع واقعہ ہوا جو عزیز نے اسے فوراً واپس آنے کو لکھا۔ جب اس کی ماں اور بہن بخیریت ہیں تو ایسا خلاف توقع واقعہ کیا ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دلاور حسین نے کچھ سخت رویہ اختیار کیا ہو۔ دلاور حسین سے اس سے زیادہ توقع ہی کیا ہو سکتی تھی۔ اس وقت رات کے دس بجے تھے اور صبح کی بس یا لاری آٹھ بجے جاتی تھی۔ اس نے خط جیب میں ڈالا اور حویلی کو چل دیا۔ نوکر سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ خان صاحب اور طاہرہ ابھی ڈرائنگ روم ہی میں بیٹھے ہیں۔ اس کے اطلاع کرانے پر صادق علی نے اسے اسی وقت بلوا لیا۔

''شریف!'' صادق علی خاں نے پوچھا۔ ''خیر تو ہے تم پھر واپس آ گئے؟''

''قبلہ! میں کل واپس جانے کی اجازت مانگنے آیا ہوں''۔ شریف حسین نے جواب دیا۔

طاہرہ اور صادق علی خاں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم کل واپس جانا چاہتے ہو۔ کیوں؟'' صادق علی خاں نے پوچھا۔

''کچھ کام ہی ایسا آ پڑا ہے جناب!'' شریف حسین نے جواب دیا۔

''کوئی آدمی آیا ہے کیا؟'' صادق علی خاں نے پوچھا۔

''خط آیا ہے قبلہ!'' شریف حسین نے جواب دیا۔

''شاہ جی کا؟'' صادق علی نے پوچھا۔

''نہیں! ایک دوست کا''۔

''لیکن میں نے تو سنا تھا کہ تم اس شہر میں بالکل اجنبی ہو''۔ صادق علی خاں نے کہا۔

شریف حسین نے کچھ جواب نہ دیا۔ صادق علی خاں بولا۔

''شریف! معلوم ہوتا ہے کہ تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو''۔ اور طاہرہ نے کہا۔

''بابا جان! میں آپ سے کہہ چکی ہوں کہ انہیں کسی پر اعتبار نہیں''۔

شریف حسین نے طاہرہ کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔ صادق علی نے پوچھا۔

''شریف! دنیا کا کام اعتماد اور اعتبار سے چلتا ہے''۔

''قبلہ!'' شریف نے جواب دیا۔ ''خدا بہتر جانتا ہے کہ میں آپ کو کہاں تک قابل اعتماد سمجھتا ہوں''۔

''تو پھر بتاؤ جاتے کیوں ہو؟'' صادق علی خاں نے پوچھا۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں تعمیل ارشاد سے قاصر ہوں''۔ شریف نے جواب دیا۔

''تم جانو!'' صادق علی خاں صوفے سے اُٹھتے ہوئے بولا۔

''تو مجھے اجازت ہے؟'' شریف نے پوچھا۔

''ٹھہرو! میں ابھی آتا ہوں''۔ صادق علی خاں نے کہا اور بغلی کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

شریف حسین سر جھکائے بیٹھا تھا اور طاہرہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''کب جانے کا ارادہ ہے؟'' طاہرہ نے پوچھا۔

''صبح کی بس سے!''

''اسباب بھی لے جا رہے ہو کیا؟'' طاہرہ نے پوچھا۔

''فی الحال تو نہیں''۔ شریف نے کہا۔

''واپس کب آؤ گے؟'' طاہرہ نے پوچھا۔

''ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا''۔ شریف نے جواب دیا۔ ''واقعات پر منحصر ہے''۔

صادق علی آیا۔ شریف تعظیم کے لئے کھڑا ہو گیا۔ صادق علی اس کی طرف ایک لفافہ بڑھا کر بولا۔

''یہ لو اس میں کچھ روپے ہیں۔ گو تم مجھے اپنا راز دار بنانا نہیں چاہتے لیکن اگر میری ضرورت ہو تو مجھے فوراً اطلاع دینا۔ لیکن کوئی کام بلا سوچے سمجھے مت کرنا''۔

شریف حسین شاید کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن صادق علی بولا۔

''طاہرہ! تمہارا ساتھی جا رہا ہے دروازہ تک ساتھ تو چلی جاؤ''۔

شریف حسین نے کچھ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنے محسن کا شکریہ ادا کیا اور جھک کر سلام کر کے کمرے سے نکلا۔ طاہرہ بھی ساتھ آئی۔

حویلی کے دروازے تک دونوں خاموش چلے آئے۔ دروازے پر پہنچ کر شریف رُکا اور بولا۔

''طاہرہ! گو مجھ سے تمہیں شکایت ہے لیکن یقین مانو میں مرتے دم تک تمہاری نوازشات نہ بھولوں گا''۔

''یہ بھی کوئی جگہ ہے باتیں کرنے کی''۔ طاہرہ بولی۔ ''چلو ذرا ندی تک چلیں''۔

دونوں ندی کو ہو لئے۔ چاندنی رات تھی اور ماہ منیر کی درخشانیوں سے کائنات چاندی کی طرح چمک رہی تھی۔ ہوا درختوں میں سنک رہی تھی اور ندی کا پانی دور سے سیماب کی طرح چمکتا نظر آ رہا تھا۔ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

''تم جا کیوں رہے ہو؟'' طاہرہ نے پوچھا۔ ''یوں اچانک تم نے ارادہ کیسے کر لیا''۔

''میں ابھی ابھی کہہ چکا ہوں کہ شہر سے ایک خط آیا ہے''۔شریف نے جواب دیا۔

''کیسا خط؟'' طاہرہ نے پوچھا۔

''طاہرہ! تمہیں معلوم ہے میری ماں اور بہن شہر میں ہیں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بلوایا ہے''۔

''تو پھر بابا سے کیوں نہ کہہ دیا''۔طاہرہ بولی۔''جب انہوں نے پوچھا تھا تو بتا دینے میں کیا ہرج تھا؟''

''طاہرہ!'' شریف حسین بولا۔''مجھے تعجب ہے کہ تم نے یہ کیسے جان لیا کہ مجھے تم پر اعتماد نہیں مجھے تم پر اعتماد نہ ہوتا تو میں کیا اپنی ماں اور بہن کا تم سے ذکر کرتا''۔

''یہ تو کوئی ایسی بڑی بات نہ تھی''۔طاہرہ نے جواب دیا۔''لیکن دیکھ لو میں نے بابا سے ذکر نہیں کیا''۔

''شکریہ!'' شریف نے کہا۔

''شکریہ زبان سے کہنے سے کیا''۔طاہرہ نے چلتے چلتے کہا۔

''میں دلی شکریہ ادا کر رہا ہوں''۔شریف نے جواب دیا۔

''شریف! کیا میں ایک بات تم سے پوچھ سکتی ہوں''۔طاہرہ نے جواب دیا۔

''کیوں نہیں؟''

''سچ کہو گے؟''

''کم از کم تم سے جھوٹ نہیں کہوں گا''۔شریف نے کہا۔

''تمہارا یہ کہنے سے کیا مطلب تھا کہ محبت تمہارے لئے حرام ہے''۔طاہرہ نے پوچھا۔''دیکھو جھوٹ مت بولنا''۔

شریف نے پہلے تو چاہا کہ اس کے یہاں آنے کے پہلے روز ہی خان صاحب نے اس کے متعلق جو کچھ کہا تھا طاہرہ سے کہہ دے لیکن اس نے مصلحتاً جھوٹ بولا۔

''محض اس لئے کہ میں کسی سے محبت کرنے کے قابل نہیں''۔

''کیوں؟'' طاہرہ نے پوچھا۔

''ایک مفلس آدمی کسی سے کیا محبت کر سکتا ہے''۔شریف نے جواب دیا۔

''لیکن محبت میں مفلسی اور امیری کا کیا سوال؟'' طاہرہ بولی۔دل کو دل سے راہ ہو تو اس قسم کی باتوں کو قابل التفات نہیں سمجھا جاتا''۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے!'' شریف نے جواب دیا۔

دونوں ندی کے کنارے پہنچ گئے اور پتھروں پر بیٹھ گئے۔کبھی کبھی پانی کے کنارے سے کہیں بن کووں کے بولنے کی آواز آنے لگتی۔طاہرہ بولی۔

''جب تم یہ تسلیم کرتے ہو تو پھر یہ عذر کیسا؟''

''مجبوری!'' شریف نے جواب دیا۔اور طاہرہ ذرا جھلا کر بولی۔

''شریف! خدا کے لئے صاف صاف کہو۔کاش تمہیں دوسرے کے جذبات کا کچھ احساس ہوتا''۔

''طاہرہ!'' شریف آہ بھر کر بولا۔''میں اس سے پہلے بھی تمہیں یقین دلا چکا ہوں کہ میرے پہلو میں بھی ایک دل ہے اور یہ دل احساسات سے خالی بھی نہیں۔لیکن میں مجبور ہوں واقعات پر میری دسترس نہیں۔بس خدا کے لئے مجھ سے اس سے زیادہ کچھ مت پوچھو۔لیکن میں تمہیں یہ یقین دلاتا ہوں کہ صبح شام کھیتوں میں گھومنا۔ندی کے کنارے بیٹھ کر مچھلی کا شکار کرنا تمہاری عنایات اور مدارات کی یاد میں کبھی نہ بھول سکوں گا۔دعا کرو! خدا میری زندگی کا خواب پورا کر دے پھر شاید......''

لیکن اس کی آواز بھرا گئی اور وہ فقرہ پورا نہ کر سکا اور اُٹھ کر بولا۔

''آؤ! واپس چلیں۔خاں صاحب انتظار کر رہے ہوں گے''۔

طاہرہ بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔

''شاید کیا؟''

''شاید تمہیں میرے احساسات سے پھر شکوہ نہ ہو''۔شریف نے جواب دیا۔

اس کے بعد طاہرہ نے کچھ نہ پوچھا اور دونوں حویلی تک خاموش چلتے رہے۔دروازہ پر پہنچ کر دونوں نے ایک دوسرے کو الوداع کہا اور دوسرے روز شریف حسین نے لاری میں سوار ہو کر شہر کی راہ لی۔

واپسی

دنیا یہ اگرچہ طرب انگیز ہے لیکن!
بھولے سے کبھی درد کے ماروں کی طرف دیکھ

شریف حسین لاری سے اتر کر پوچھتا پاچھتا سیدھا کالے خاں پنواڑی کی دوکان پر پہنچا۔کالے خاں دوکان پر بیٹھا چھالیا کاٹ رہا تھا۔سر پر کشتی نما سپید ٹوپی تھی۔سپید ململ کا تنگ آستین کا کرتا تھا اور سپید پاجامہ اور جسم کے رنگ کی مناسبت سے کالے خاں نام بھی خوب تھا۔ہاتھ میں سروتا کلے میں پان ٹھنسا ہوا۔لال لال ہونٹ آنکھیں سرخ' انگلیاں کتھے کے رنگ سے سرخ اور کالے خاں کے چہرے پر سپید داڑھی ایسی معلوم ہوتی جیسے کالی ساری میں مقیش کی جھالر۔شریف حسین نے پاس جا کر پوچھا۔

''تمہارا نام کالے خاں ہے؟''

''آپ کو کچھ شک ہے کیا''۔کالے خاں نے جو ایک بڑا با مذاق آدمی تھا مسکرا کر کہا۔''میرا نام تو میرا رنگ ہی بتا رہا ہے۔فرمایئے کیا ارشاد ہے''۔

''میں شریف حسین ہوں''۔شریف حسین نے کہا۔

''حکم؟'' کالے خاں نے پوچھا۔

''مجھے عزیز سے ملنا ہے''۔شریف حسین نے کہا۔

''تشریف رکھئے''۔کالے خاں بولا۔''کرسی لے لیجئے''۔

شریف حسین کرسی پر بیٹھ گیا۔

''آپ کہاں سے آئے ہیں؟'' کالے خاں نے ایک گلوری پیش کرتے ہوئے کہا۔

''شکریہ!'' شریف حسین نے گلوری لیتے ہوئے کہا۔''میں صادق آباد سے آیا ہوں''۔

''کچھ اسباب بھی ہے ساتھ''۔

''نہیں!''

کالے خاں سروتا اور چھالیا تھال میں رکھ کر دکان سے اُترا اور بولا۔

''تشریف لایئے میرے ساتھ''۔

شریف حسین ساتھ ہولیا۔گلی کے نکڑ پر جو پہلا مکان تھا کالے خاں نے دروازے پر کھڑے ہوکر زنجیر کھڑ کائی۔گلی کی جانب کا دریچہ کھلا اور عزیز نے جھانک کر دیکھا۔پھر جلدی سے نیچے اُتر کر دروازہ کھولا اور شریف حسین کو سلام کر کے کہا۔

''اوپر آ جایئے!''

''کسی چیز کی ضرورت ہو تو کہہ دینا''۔کالے خاں نے عزیز سے کہا۔

''ایک آدمی کا کھانا زیادہ بھجوا دینا''۔عزیز نے کہا اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

شریف جب اوپر گیا تو اس کی ماں نے لپک کر اسے سینے سے لگا لیا اور شریفہ اس کے شانے پر سر رکھ کر رونے لگی۔عزیز چٹائی پر دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔شریف کی آنکھوں میں بھی آنسو چھلک رہے تھے۔

''تم کب آئے میرے لال؟''ماں نے پوچھا۔

''ابھی آ ہی رہا ہوں اماں!''شریف نے کھاٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

شریفہ اپنی ماں کے پاس دوسری چارپائی پر بیٹھ گئی۔شریف نے پوچھا۔

''اس مکان میں کب آئیں؟''

''ہو گئے دو ایک روز''۔ماں نے جواب دیا۔''تم تو اچھے رہے''۔

''خدا کا شکر ہے''۔شریف بولا۔''شریفہ تم کیوں چپ بیٹھی ہو؟''

شریفہ کی آنکھوں سے پھر آنسو گرنے لگے۔شریف نے پوچھا۔

''شریفہ!کیا ہے۔روتی کیوں ہو؟''

''صبر کرو بیٹی''۔ماں نے کہا۔

''میاں عزیز!''شریف بولا۔''تم تو اچھے رہے؟''

''دعا ہے آپ کی''۔عزیز نے مسکرا کر کہا۔''آپ کے مزاج تو اچھے ہیں''۔

''شکر ہے!''

''میرا خط مل گیا تھا؟''عزیز نے پوچھا۔

''تمہارا خط پا کر ہی تو آیا ہوں''۔شریف نے جواب دیا۔''کچھ مفصل تو لکھا ہوتا۔تمہارے خط نے تو بہت پریشان کیا مجھے''۔

زینب بولی۔

''شریف!عزیز تو ہمارے لئے فرشتہ رحمت ہے''۔

''میں تو خادم ہوں بی بی جی آپ کا''۔عزیز نے کہا۔

''خیریت تو ہے جو مجھے تم نے جلدی آنے کو لکھا''۔شریف نے پوچھا۔

''ہاں!'' عزیز بولا۔ ''خیریت ہی ہے۔ آپ سے کچھ مشورہ کرنا تھا''۔

''اماں!'' شریف نے پوچھا۔ ''تم تو اچھی رہیں''۔ پھر بہن کی طرف دیکھ کر۔

''شریفہ! تم کیوں چپ ہو۔ ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو یہاں؟''

شریفہ اٹھ کر بھائی کے پاس جا بیٹھی۔

''کچھ ناراض ہو مجھ سے؟'' شریف نے مسکرا کر پوچھا۔

''نہیں؟'' شریفہ نے ہولے سے کہا۔

''شریف!'' ماں نے پوچھا۔ ''اسباب کہاں ہے تمہارا؟''

''اسباب تو وہیں صادق آباد میں چھوڑ آیا ہوں''۔ شریف نے جواب دیا۔

''قصبے میں رہتے تھے کہیں؟'' شریفہ نے پوچھا۔

''نہیں! خاں صاحب نے اپنی حویلی کے پاس ہی ایک مکان دے دیا تھا''۔ شریف نے جواب دیا۔ ''شریفہ! صادق آباد بڑی اچھی جگہ ہے اور مکان بھی ندی کے کنارے ہے''۔

''اسی لئے واپس آنے کو تمہارا دل نہ چاہا''۔ شریفہ نے مسرا کر کہا۔

''دل چاہنے کی بات نہیں''۔ شریف نے جواب دیا۔ ''بلکہ میں اس فکر میں تھا کہ تمہیں بھی وہیں بلالوں''۔

''پندرہ روپے ماہوار تنخواہ میں تین کی کیسے گزر ہوسکتی''۔ ماں نے کہا۔

''اماں! مجھے تو کچھ معلوم ہی نہیں کہ میری تنخواہ کیا ہے''۔ شریف حسین نے جیب سے کچھ نوٹ نکالتے ہوئے کہا۔ ''یہ دیکھو! کل رات ہی خاں صاحب نے مجھے یہ سو روپے دیئے تھے''۔

عزیز جو اُس وقت تک خاموش بیٹھا تھا بولا۔

''اور رہتے بھی تو آپ بہت عزت سے ہوں گے''۔

''ہاں بڑی عزت سے''۔ شریف نے جواب دیا۔ ''اور دونوں وقت کا کھانا بھی خاں صاحب کے ساتھ کھاتا تھا۔

''میرا پہلے سے ہی یہی خیال تھا کہ خاں صاحب آپ کو عزت سے رکھیں گے''۔ عزیز نے کہا۔ اور زینب ہنس کر بولی۔

''یہ جو کچھ ہوا ہے تمہارے چچا کی مہربانی سے ہی ہوا ہے۔ تمہیں شاید یقین نہ ہو لیکن مجھے پہلے ہی خیال تھا کہ بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ دلاور حسین اپنے بھتیجے کو پندرہ روپیہ ماہوار پر کسی زمیندار کے پاس ملازم کروادے گا۔ خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ابا جان مرحوم کو وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ امیر لوگ جو بے اولاد ہوتے ہیں انہیں جب کسی کو اپنا وارث بنانا ہوتا ہے تو شروع شروع میں کچھ بیگانگی کا برتاؤ کیا کرتے ہیں۔ تم سب دلاور حسین کو برا کہتے ہو لیکن حقیقۃً وہ برا نہیں۔ اس کے کہنے سے ہی خاں صاحب تمہاری عزت کرتے ہوں گے۔ اور گو عزیز نے مجھ سے تو کچھ کہا نہیں لیکن میں سمجھتی ہوں کہ یہ بھی دلاور حسین کی ہی مہربانی ہے اور دونوں وقت کھانا بھی اسی کے ہاں سے آرہا ہے''۔

''اماں!'' شریفہ غصے سے بولی۔''جانے تمہیں کب عقل آئے گی۔ جانتے بوجھتے بھی اگر تم یہی کہے جاؤ تو اللہ کی مرضی''۔

''بات کیا ہے؟'' شریف حسین نے پوچھا۔''میاں عزیز! کچھ تم ہی بتاؤ مجھے تم نے کیوں بلوایا ہے؟''

''شریف میاں!'' عزیز بولا۔''آپ کی بہن کی عزت خطرے میں تھی اس......''

''عزیز!'' شریف حسین ذرا غصے سے بولا۔''کیا کہہ رہے ہو تم؟''

''شریف میاں!'' عزیز دو ایک بار آنکھیں جھپکا کر بولا۔''پہلے میری بات سن لیں آپ پھر جو دل چاہے کہئے''۔

اور زینب بولی۔

''عزیز! اس میں تو کچھ شک نہیں کہ تم بہت اچھے آدمی ہو۔ لیکن خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ابا جان کو وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ ہر ایک دوسرے کو اپنے ہی نقطۂ نگاہ سے دیکھتا ہے جن حالات میں کوئی شخص زندگی بسر کرتا ہے انہی حالات کی روشنی میں وہ دوسروں کو پرکھتا ہے۔ تم برا مت مانو لیکن سچی بات آخر کہنی ہی پڑتی ہے تمہاری چونکہ تمام عمر دوسروں کی خدمت کرتے گزر گئی اس لئے تمہاری نگاہ بھی تمہاری حد نظر سے دور نہیں جا سکتی اور میں آج تم سے یہ بھی کہے دیتی ہوں کہ اگر تمہیں کچھ عقل ہوتی تو تم اس مصیبت میں بھی نہ پھنستے۔ لیکن اس معاملہ کا چونکہ میرے بچوں کے چچا اور میرے دیور سے تعلق ہے اس لئے میں اس کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتی۔ اگر اپنے ہی اپنوں کا راز فاش کرنے لگیں تو اپنے اور بیگانے میں تمیز بھی نہ رہے۔ شریف کے ابا جان کی مجھ سے خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے عموماً یہی بحث رہا کرتی تھی انہیں اپنوں پر کچھ ایسا اعتماد نہ تھا اس لئے وہ ان سے ہمیشہ الگ تھلگ رہتے اور میں ان کی اس پالیسی کے خلاف تھی اور وہ اکثر مجھ سے ناراض بھی ہو جایا کرتے۔ لیکن اب تو یہ باتیں کہانی ہو گئیں اب اس کا ذکر ہی کیا......''

''اماں!'' شریف بولا۔''پہلے مجھے......''

''شریف!'' ماں نے ذرا رعب سے کہا۔''خاموش رہو تم! یہ کہاں سے سیکھ آئے آج کہ تمہاری ماں نے ابھی بات بھی ختم نہیں کی اور تم بیچ میں ٹوکنے لگے۔ پہلے مجھے بات ختم کر لینے دو پھر اپنی بھی کہہ لینا۔ تو ہاں میں کہہ رہی تھی کہ عزیز نے جو قصہ مجھ سے کہا تھا اور شریفہ نے بھی کچھ ایسا ہی بتایا تھا۔ لیکن میں ماننے کے لئے تیار نہیں۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ جو کچھ عزیز اور شریفہ نے مجھ سے کہا بہت شرمناک ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ عزیز بھی اور شریفہ نے بھی دلاور حسین کا اصلی مقصد سمجھنے میں غلطی کی ہو۔ ابا جان مرحوم خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اکثر کہا کرتے تھے کہ شک سب سے بری بیماری ہے اور شکی آدمی دنیا میں کبھی خوش نہیں رہتا۔ اسلئے شریف بیٹا! تم عزیز کی بات بھی سن لو اور جو کچھ تمہاری بہن کہتی ہے اس پر بھی غور کر لو اور میرا خیال ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ تم بھی اسی نتیجہ پر پہنچو گے کہ ان دونوں نے دلاور حسین کو سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ لو اب جسے کہنا ہو وہ کہے''

ماں کی اس طویل تقریر سے شریفہ کے چہرے سے بیزارگی ظاہر ہو رہی تھی۔ عزیز سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا اور شریف حسین کا دل نہ جانے کیوں دھڑک رہا تھا۔

''میاں عزیز!'' اس نے کہا۔''آخر یہ قصہ کیا ہے۔ کیا کہا تھا تم نے کہ میری بہن کی عزت خطرے میں تھی''۔

عزیز نے تجمل اور شریفہ کا سارا قصہ شریف سے کہہ دیا۔ گو حسب عادت شریفہ کی ماں نے اسے دو ایک بار ٹوکنا بھی چاہا لیکن وہ جب تک

ساری داستان کہہ نہ چکا چپ نہ ہوا۔

عزیز سے یہ شرمناک داستان سن کر شریف کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا اور وہ بہن کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔

''شریفہ! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ موت نہ آ گئی تمہیں ہوٹل میں جانے سے پیشتر۔ تم نے تو مجھے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رکھا''۔

''شریف بھائی!'' شریفہ روتے ہوئے بولی۔ ''اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں نے ہزار بار انکار کیا لیکن اماں نے میری ایک نہ سنی۔ جانے اس پاجی دلاور نے اماں پر کیا جادو کر رکھا ہے''۔

''مجھ پر کسی نے جادو نہیں کیا''۔ زینب بولی۔ ''میں نے دنیا دیکھی ہے اور تم......''

''اماں!'' شریف حسین بات کاٹ کر غصے سے بولا۔ ''خاموش رہو تم! غضب خدا کا مولوی دلدار حسین کی بیٹی اور ہوٹل میں کام کرے۔ اماں تمہاری غلط خیالیوں نے یہ سب غضب ڈھایا۔ میں اس حرامزادے کو کبھی زندہ نہیں چھوڑوں گا''۔

''شریف میاں!'' عزیز بولا ''آپ کا غصہ بالکل بجا ہے لیکن آپ کا باپ ایک شریف آدمی تھا۔ آپ کو بھی شریفانہ انتقام لینا چاہئے۔ عقلمندی یہ ہے کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ اگر آپ اس غلام کے مشورہ پر چلیں گے تو شاہ جی دنیا کی نگاہوں میں ایسے ذلیل ہوں گے کہ جینا اجیرن ہو جائے گا''۔

شریفہ رو رہی تھی اور زینب سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔

عزیز دو ایک بار آنکھیں جھپکا کر بولا۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو یہ لکھنا بھول گیا کہ آپ سب سے آخری بس میں جو شام کے بعد یہاں آتی ہے آئیں۔ خدا کرے کہ شاہ جی یا ان کے آدمیوں میں سے کسی نے آپ کو دیکھ نہ لیا ہو''۔

''کیا مطلب؟'' شریف حسین نے پوچھا۔ ''دن کی بس میں آنے سے کچھ خطرہ تھا کیا؟''

''ہاں میاں!'' عزیز نے پھر دو ایک بار آنکھیں جھپکا کر کہا۔ ''میرا دل کہہ رہا ہے کہ اس رات کے واقعہ کے بعد سے دلاور حسین سکھ کی نیند نہیں سوئے گا۔ اس نے مجھے تلاش کرنے کے لئے کئی ایک آدمی مقرر کر رکھے ہیں۔ اگر وہ آپ کو دیکھ لیتے تو پھر میرا سراغ بھی لگا لیتے۔ اسی لئے میں جب وقت سے بی بی جی کو یہاں لایا ہوں گھر سے باہر نہیں گیا''۔

''لیکن تم کیوں چھپے بیٹھے ہو؟'' شریف نے پوچھا۔

''تاکہ آپ اپنے دشمنوں سے انتقام لے سکیں''۔ عزیز نے آنکھیں جھپکا کر کہا۔

''میں اس بوڑھے مکار سے نہیں ڈرتا''۔ شریف حسین نے غصے سے کہا۔ ''مجھے اس سے ایک طویل حساب چکانا ہے اور میں مردوں کی طرح چکاؤں گا''۔

زینب جو اس وقت تک خاموش بیٹھی تھی بولی۔

''شریف! تم ابھی ناتجربہ کار ہو۔ اس لئے تم اس معاملہ میں دخل مت دو مجھے دلاور حسین کے پاس جانے دو یا اسے یہاں بلواؤ۔ میں خود

اس سے نپٹ لوں گی۔ تمہیں یاد ہوگا کہ تمہارے ابا جان مرحوم خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے تم دونوں کو بڑوں کی باتوں میں دخل دینے سے منع کیا کرتے تھے اور سعادت مندی بھی یہی ہے کہ بزرگوں کی نصیحت پر ہمیشہ عمل کیا جائے۔ خواہ نصیحت کیسی ہی کڑوی کیوں نہ ہو"۔

"اماں!" شریف حسین بولا۔ "خدا کے لئے آج سے تم اس معاملہ میں مت دخل دو۔ میں اپاہج نہیں۔ محنت مزدوری کر سکتا تھا۔ لیکن تمہاری خام خیالیوں نے یہ دن دکھایا۔ وہ شخص جس کی صورت دیکھنے کے بھی ابا جان مرحوم روادار نہ تھے آج اس شخص کے ہاتھوں ہم یوں ذلیل ہو رہے ہیں اور اس کی صرف تم ذمہ دار ہو"۔

اور شریفہ جو اس وقت خاموش بیٹھی تھی بولی۔

"شریف بھائی! چلو کسی اور جگہ چلے چلیں۔ تم کہتے ہو خاں صاحب تم پر بہت مہربان ہیں کیا وہ ہماری کچھ مدد نہ کر سکیں گے"۔

"ضرور کریں گے"۔ عزیز نے آنکھیں جھپکا کر کہا۔

"میاں عزیز!" شریف بولا۔ "یہ حرام زادہ تجمل کون ہے؟"

"ہے تو ایک امیر زادہ لیکن بہت بدچلن ہے"۔ عزیز نے دو ایک بار آنکھیں جھپکا کر کہا۔ "لیکن ایسے لوگوں کے منہ آنا آپ کی اور آپ کے خاندان کی شان کے خلاف ہے خدا نے چاہا تو آپ کسی روز شاہ جی اور تجمل میں جو تم بیزار ہوتے بھی دیکھ لیں گے"۔

"کیوں؟" شریف نے پوچھا۔

"وہ شاہ جی کے یہاں جوا بھی کھیلتا ہے اور وقتاً فوقتاً اس سے قرض بھی لے لیتا ہے اور دلاور حسین اس سے پچیس کے پچاس لکھواتا ہے"۔

عزیز نے جواب دیا۔

"جمع کرنے دو"۔ زینب بولی۔ "جن کی قسمت میں ہے ملے گا انہی کو"۔

"بی بی جی!" عزیز نے آنکھیں جھپکا کر کہا۔ "سب لفافہ بازی ہے۔ حرام کی کمائی کبھی وفا نہیں کرتی۔ جس شخص کی تمام عمر مکاری اور فریب کاری کرنے میں گزری ہو اس کا انجام بھی عبرتناک ہی ہوتا ہے"۔

"عزیز!" زینب بولی۔ "ایسی بات مت کہو تم! دلاور حسین میرا دیور ہے اور میرے بچوں کا چچا ہے۔ ابا جان مرحوم خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ اپنے عزیزوں میں سے خواہ کوئی کیسا ہی برا کیوں نہ ہو اس کے عیوب پر ہمیشہ پردہ ڈالنے کی کوشش کرنی چاہیئے"۔

"پھر صلاح کیا ٹھہری؟" شریفہ نے پوچھا۔ "کب تک ہم یوں چھپے بیٹھے رہیں گے۔ اگر اسے پتا لگ گیا تو جیسے بابا عزیز کہتا ہے جانے کیا قیامت برپا کرے"۔

"اس ملعون کو جو قیامت برپا کرنی تھی کر چکا"۔ عزیز نے جواب دیا۔

اور زینب بولی۔

"بہرکیف جو کچھ کرو سوچ سمجھ کر کرو۔ بعض وقت ایک معمولی سی غلط فہمی سے بھی بہت برے نتائج پیدا ہو جاتے ہیں۔ شریفہ! تمہیں تو یاد

ہوگا ہمارے پڑوس میں وہ جو ایک پیرو تیلی رہتا تھا اس نے ایک روز محض ایک معمولی سی غلط فہمی پر اپنی جورو کو مار مار کر اُتو کر ڈالا اور عورت کے میکے والوں نے غصے میں آ کر پولیس......"

"اماں!" شریف بولا۔ "اب چھوڑو یہ پرانی باتیں"۔

پھر عزیز سے......"میاں عزیز! یہ تو ہو نہیں سکتا کہ دلاور حسین کو یوں سستے داموں چھوڑ دیا جائے تم ابھی ابھی شریفانہ انتقام کا کہہ رہے تھے۔ کیا سوچ رکھا ہے تم نے؟"

"شریف میاں!" عزیز نے آنکھیں جھپکا کر کہا۔ "میں نے جو کچھ سوچ رکھا ہے اسے پورا کرنے کو ہی تو میں یہاں چھپا بیٹھا ہوں لیکن میں ابھی آپ سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں! اتنا پھر کہے دیتا ہوں کہ مجھ پر قابو پانے کو اگر دلاور حسین کو جان کی بازی بھی لگانی پڑی تو وہ رکے گا نہیں"۔

"عزیز!" زینب ذرا رعب سے بولی۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو تم! خبردار کوئی ایسی حرکت مت کرنا جس سے ہمارے خاندان کے نام پر دھبہ آئے"۔

شریف ماں کی تنبیہ نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

"میاں عزیز! تو پھر ارادہ کیا ہے مجھ سے تو بزدلوں کی طرح چھپ کر نہ بیٹھا جائے گا"۔

"چھپ کر بیٹھنے کی ضرورت بھی تو نہیں"۔ عزیز نے جواب دیا۔ "اللہ کا نام لے کر صادق آباد چلے چلئے۔ پھر جو اللہ کو منظور!"

"لیکن اگر ہم چلے گئے تو دور بیٹھ کر کیا کر سکیں گے"۔ شریف نے پوچھا۔

"شریف میاں!" عزیز نے اسی طرح دو ایک بار آنکھیں جھپکا کر کہا۔ "میں آپ کے خاندان کا پرانا خادم ہوں۔ میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں آپ اسی طرح کریں۔ ہاں! خدا سے دعا کریں کہ خیر و عافیت سے صادق آباد پہنچ جائیں"۔

شریف نے کچھ جواب نہ دیا۔ ماں نے پوچھا۔

"تم کیا سوچ رہے ہو؟ تمہارا کیا ارادہ ہے۔ میں تمہیں اس بات کی کبھی اجازت نہیں دے سکتی کہ تم اپنے چچا سے بگاڑ پیدا کرو۔ بیشک آج حالات کچھ ایسے امید افزا نہیں لیکن مجھے اللہ کی بارگاہ سے پوری امید ہے کہ ایک روز میری زندگی کا خواب ضرور پورا ہو کر رہے گا۔ ابا جان مرحوم خدا انہیں کروٹ کروٹ......"

"اماں!" شریف جھلا کر بولا۔ "خدا کے لئے ذرا چپ بھی رہو تم"۔ پھر عزیز سے

"میاں عزیز! میں صرف یہ سوچتا ہوں کہ خاں صاحب پر اتنا بار ڈالنا کہاں تک مناسب ہے۔ میرے خیال میں پہلے ان کی اجازت لے لینی چاہئے"۔

"آپ جب وہاں سے چلے تھے تو انہوں نے آپ سے کچھ کہا بھی تھا"۔ عزیز نے پوچھا

"ہاں انہوں نے کہا کہ اگر مجھے ان کی مدد کی ضرورت ہو تو انہیں فوراً لکھوں"۔ شریف نے جواب دیا۔

"تو بس اب مزید کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں"۔ عزیز نے کہا۔ "سوال یہ ہے کہ جانے کا انتظام کیا ہو؟"

''بس جو جاتی ہے''۔شریفہ نے کہا۔

''بس تو جاتی ہے''۔عزیز نے کہا۔''لیکن اگر آپ کے چچا کے آدمی بھی وہاں موجود ہوں تو کچھ تعجب نہیں''۔

اور زینب بولی۔''عزیز! تمہاری باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کچھ جرم کیا ہے اس لئے تم اتنے خوفزدہ ہو رہے ہو''۔

''بی بی جی!''عزیز آنکھیں جھپکا کر بولا۔''جرم تو میں نے بیشک کیا ہے لیکن شاہ جی کے جرائم کے مقابلہ میں میرا جرم کوئی حقیقت نہیں رکھتا''۔

''تم نے اتنی مدت دلاور حسین کا نمک کھایا ہے۔یادر کھو دنیا تمہیں نمک حرام کہے گی''۔زینب نے کہا۔''میرا ابا......''

''بی بی جی!''عزیز ہنس کر بات کاٹ کر بولا۔''دنیا تو جب کہے گی دیکھا جائے گا' لیکن آپ تو ابھی سے کہہ رہی ہیں''۔

''اسباب کتنا ہے؟''شریف نے پوچھا۔

''اسباب تو کافی ہے''شریف کی ماں نے جواب دیا۔''ٹرنک ہیں۔گھر کا سامان ہے بستر ہیں۔ایک تانگہ کا بوجھ تو ہے ہی''۔

''میاں عزیز! کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اسباب یہیں چھوڑ دیا جائے پھر جب موقع ہو منگوالیں گے۔کالے خاں سے پوچھو تو سہی شاید وہ مان جائے''۔شریف حسین نے کہا۔

''شریف میاں!''عزیز بولا۔''کالے خاں سے کیا پوچھنا ہے۔جیسا مناسب ہو آپ کریں۔اُس کیطرف سے مطمئن رہیں آپ''۔

اور زینب بولی۔

''نا بھائی! ایک غیر آدمی پر کیسے اعتبار کر لیا جائے۔اسباب چھوڑ کر جانا مناسب نہیں۔میرے ابا جان مرحوم خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ یہ دنیا اب اعتبار کے قابل نہیں۔کوئی اپنا......''

لیکن شریف بات کاٹ کر بولا۔''اماں ہمیں تو نصیحت کرتی ہو اور خود اس کے خلاف کرتی ہو۔تم نے اپنے دیور پر کیسے اعتبار کر لیا''۔

''اللہ کی شان ہے!''زینب بولی۔''میرے دیور کو تمہیں چچا کہنا بھی گوارا نہیں آج! ناخن سے گوشت کبھی جدا نہیں ہو سکتا۔یوں جو تمہارا دل چاہے کرو میں دخل نہیں دیتی''۔

''بی بی جی!''عزیز دو ایک بار آنکھیں جھپکا کر بولا۔دنیا میں اعتبار کے بغیر کام نہیں چلتا۔کالے خاں بہت شریف آدمی ہے اور میرا دوست ہے۔میں تو کب سے پکڑا گیا ہوتا یہ کالے خاں کی بدولت ہی ہے جو یہاں اطمینان سے بیٹھے ہیں سب!''

''دلاور حسین نے اس سے بھی پوچھا تھا کیا؟''زینب نے پوچھا۔''اسے بھی تو معلوم ہوگا کہ کالے خاں سے تمہاری دوستی ہے''۔

''بی بی جی!''عزیز بولا''یہ تو اسے معلوم نہیں کہ میری کالے خاں سے دوستی ہے لیکن ہوٹل کے دو ایک ملازموں کو یہ معلوم ہے کہ میں بازار سے آتے جاتے کبھی کالے خاں کے پاس بھی دو چار منٹ کے لئے رک جاتا ہوں''۔

''پھر تو دلاور حسین نے اس سے بھی پوچھا ہوگا''۔زینب بولی۔

''ہاں!''عزیز نے جواب دیا۔''کل رات اسے ہوٹل میں بلوایا تھا اور مجھے پکڑوانے کیلئے پچاس روپے کے انعام کا لالچ بھی دیا تھا''۔

''کچھ نقصان کا بھی کہا ہوگا''۔شریف نے کہا۔''شاید پولیس میں بھی رپورٹ کی ہو''۔

''آپ فکرمت کریں''۔عزیز نے جواب دیا۔''پولیس میں رپورٹ کرنے کی وہ جرأت نہیں کر سکتے۔بہرکیف ابھی تک تو نہیں کی''۔

''تم سے یہ باتیں کالے خاں نے ہی کہی تھیں''۔زینب نے پوچھا۔

''ہاں اُسی نے!''عزیز نے جواب دیا۔

''پھر تو بڑا باوفا دوست نکلا''۔زینب نے کہا۔

''بی بی جی!''عزیز آنکھیں جھپکا کر بولا۔''آپ اچھے جگ اچھا۔آپ برے جگ برا''۔

شریف جو خاموش بیٹھا تھا بولا۔

''میاں عزیز!تو پھر جیسے مناسب ہو کرو۔مجھ سے پوچھنے کی ضرورت نہیں''۔

اور زینب نے کہا۔''شریف!میں پھر کہتی ہوں جو کچھ کرنا ہے سوچ سمجھ کر کرو۔کم ازکم ہمیں اتنا تو معلوم ہونا چاہیئے کہ عزیز تمہارے چچا کے یہاں سے کیوں بھاگ آیا ہے تمہارے ابا جان مرحوم خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ نوکروں پر اعتبار نہیں کرنا چاہیئے۔کہیں یہ نہ ہو کہ ہمیں دلاور حسین سے اُلٹا شرمندہ ہونا پڑے۔تمہارے ابا جان خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے میری اس صاف گوئی پر عموماً مجھ سے ناراض بھی ہوا کرتے تھے لیکن شرع شریف کا بھی حکم یہی ہے کہ جو بات کرو لاگ لپٹ کے بغیر کرو۔اور لگی لپٹی کہنے کی تم بہن بھائیوں کو معلوم ہی ہے میری عادت نہیں''۔

لیکن زینب کی اس تقریر کا کسی نے کچھ جواب نہ دیا۔شریف نے کہا۔

''میاں عزیز!میرا تو خیال تھا کہ جانے سے پیشتر میں دلاور حسین سے نپٹ لوں۔لیکن جہاں تک میں نے غور کیا ہے تمہارا کہنا ہی ٹھیک ہے۔اب جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔بات بڑھانے سے رسوائی کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔اور......''

اور شریف کی ماں بات کاٹ کر بولی۔''پھر وہ تمہارا چچا بھی تو ہے اور باپ کی جگہ ہے۔بیٹا اگر باپ سے گستاخی سے پیش آئے گا تو دنیا کیا کہے گی''۔

اور شریف مسکرا کر بولا۔''اماں تم خوش تو خدا بھی خوش!''

پھر عزیز سے۔''تو میاں عزیز!پھر اگر چلنا ہی ہے تو جلدی چلنے کا انتظام کرو''۔

''اگر ہو سکے تو کل ہی چلنا چاہیئے''۔شریفہ نے کہا عزیز بولا۔

''شریف میاں شہر سے میل بھر کے فاصلے پر نہر کا پل ہے۔میں کالے سے کہہ دیتا ہوں کہ کل صبح کی بس سے چار آدمیوں کے لئے جگہ کا انتظام کرلے۔ہم یہاں سے کچھ رات رہے نکل جائیں گے اور نہر کے پل پر سے سوار ہو جائیں گے''۔

یہ تجویز سب کو پسند آئی۔کالے خاں نے شام سے پہلے ہی چار آدمیوں کی جگہ کا بس میں انتظام کرلیا اور ایک تانگے والے سے بھی بات چیت کرلی۔چنانچہ اس تجویز کے مطابق اگلے روز یہ چاروں منزل مقصود کو روانہ ہو گئے۔

جیسی کرنی ویسی بھرنی

نہ سہی دل کو تسلی کے سہارے بھی نہیں
غم کے بربط پہ بھی کیا گیت نہیں گا سکتا
اپنی آنکھوں میں بھی کیا اشک نہیں لا سکتا
کیا مرے بس میں یہ بجھتے سے شرارے بھی نہیں

(ڈاکٹر شہرت)

دستاویز کا چوری ہو جانا دلاور حسین کے لئے قیامت کا ٹوٹ پڑنا تھا۔ دس بج چکے تھے اور عزیز ابھی تک نہیں آیا تھا۔ دلاور حسین کمرے میں ادھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ کبھی چلتے چلتے غصے سے اس کا چہرہ تمتما جاتا اور وہ زور سے مٹھیاں بھینچ لیتا۔ کبھی اچانک اس کے چہرے پر مردنی سی چھا جاتی۔ کبھی اس کا قدم کمرے میں اس بیمار کی طرح اٹھتا جو چلتے وقت ہر چیز کا سہارا لیتا ہے اور کبھی وہ اس تیزی سے قدم اٹھاتا جیسے اسے کہیں مقررہ وقت پر پہنچنا ہو اور وقت گزرا جا رہا ہو کبھی اپنے آپ سے کہتا۔

"لیکن یہ دستاویزات لے کون گیا۔ کون تھا اس وقت میرے پاس۔ جب میں نے یہ دستاویزات سیف میں رکھی تھیں۔ میں تھا اور افضل تھا۔ افضل! ہاں افضل! جو سولہ سترہ برس مجھے لوٹتا رہا۔ افضل! لیکن افضل کیسے لے جا سکتا تھا۔ سیف کی چابی تو ہمیشہ میرے پاس ہوتی ہے۔ پھر تینوں کاغذ! تینوں دستاویزات! کون لے گیا؟ افضل! نہیں یہ افضل کا کام نہیں۔ پھر کون لے گیا؟ عزیز!......عزیز!......میری چالبازیوں کا رازدار (اس کا قدم پھر سست اٹھنے لگا) عزیز کہاں تھا اس وقت۔ ٹھہرو! عزیز! ہاں یاد آ گیا۔ وہ کمرے میں سٹول پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اونگھ رہا تھا یا مجھے بتانا چاہتا تھا کہ وہ سو رہا ہے۔ لیکن عزیز تو بہرا ہے۔ گزشتہ دو تین سال سے وہ یہی ظاہر کر رہا ہے کہ وہ بہرا ہو گیا ہے اور بینائی کی شکایت بھی کرنے لگا ہے۔ عزیز! (اس کا قدم پھر تیز اُٹھنے لگا) میرا خیال ہے......ہاں میرا خیال ہے......ہاں خیال! وہ کچھ عرصے سے میری ہر بات پر نگاہ رکھنے لگا ہے۔ بیس چوبیس سال کا نوجوان۔ قتل عمد کا مرتکب......خوب قابو آیا......سانپ بوڑھا بھی ہو جائے تو سانپ ہی رہتا ہے۔ خوفناک دشمن۔ ہر وقت ڈسنے کے لئے تیار!......عزیز! نمک حرام! بیگم کا رازدار......دلدار حسین کی اولاد کا ہمدرد!......لیکن لڑکی کا تو اسے کچھ علم نہ تھا۔ جانے اس روز مجھے کیوں اتنا جوش آ گیا۔ ہو سکتا ہے کہ افضل سے جو میری باتیں ہوئیں اس نے بھی سن لی ہوں......لیکن ایک بہرا آدمی کیسے سن سکتا ہے۔ شاید بہرا نہ ہی ہو......لیکن تجوری کیسے اس نے کھولی۔ تجوری بند تھی (اس کا قدم پھر سست پڑنے لگا) سیف بند تھا۔ سیف......بند......تھا (قدم اور بھی سست اٹھنے لگا) سیف! ......عزیز!......عزیز باہر سٹول پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ سیف! سیف کی چابی......سیف کی چابی؟ (وہ چلتے چلتے کرسی پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔ بیٹھے بیٹھے وہ

تیز تیز سانس لینے لگا) سیف کی چابی سیف کے تالے میں تھی...... (پیشانی پر شکن پڑ گئے معلوم ہوتا تھا پسینے چھوٹ رہے ہیں) سیف...... کی چابی...... سیف...... کے...... تالے میں تھی۔ وہ کرسی سے اُٹھا اور کمرے میں اِدھر اُدھر لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا۔ پھر وہ دروازے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ سٹول جس پر عزیز بیٹھا کرتا تھا اسی جگہ رکھا تھا جہاں ہمیشہ رکھا ہوتا وہ تیز تیز نگاہوں سے سٹول کی طرف دیکھنے لگا۔ گویا وہ لکڑی کے اس بے جان سٹول کے دل کا راز معلوم کرنا چاہتے...... وہ پھر کرسی پر آ کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔ سیف یا تجوری کرسی کے قریب ہی دیوار کے ساتھ رکھا تھا۔ اس نے جیب سے چابی نکالی بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھا کر سیف کھولا۔ پھر اس نے سیف کا دروازہ اپنی طرف کھینچا۔ دروازہ کھل گیا لیکن دروازہ کھلنے کی مطلق آواز نہ آئی۔ اُس نے دو ایک بار اسی طرح کیا۔ پھر سیف بند کر کے چابی جیب میں ڈال لی اور زور سے میز پر ہاتھ مار کر بولا۔ عزیز!...... نمک حرام! ہاں! یہ عزیز ہی کا کام ہے۔ عزیز نے ہی دستاویزات چرائی ہیں۔ آ جانے دو کھال کھینچ دوں گا حرامزادے کی۔ گھڑی نے گیارہ بجائے۔ عزیز ابھی تک نہیں آیا تھا۔ اس نے ابھی تک کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ کھانا وہ عموماً دس بجے سے پہلے ہی کھا لیا کرتا تھا۔ اس نے کرسی سے اٹھ کر بازار کی جانب کی کھڑکی کھول دی اور بازار کی طرف جھانکنے لگا۔ لوگوں کی آمدورفت قریباً بند ہو چکی تھی۔ رات تاریک تھی۔ وہ کچھ دیر کھڑکی کے پاس کھڑا بازار کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر کھڑکی بند کر کے کرسی پر آ بیٹھا۔ اور سوچنے لگا۔

''عزیز کو دستاویزات چرا کر کیا حاصل ہو سکتا ہے اور کاغذ تو اس کے کسی کام کے نہ تھے۔ ہاں وہ اقبال جرم کی تحریر...... اس سے عزیز کو تو فائدہ ہو سکتا ہے۔ لیکن مجھے۔ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا...... نقصان! اگر یہ دستاویزات میرے کسی دشمن کے ہاتھ آ جائیں! بیگم کا فرضی نکاح نامہ؟ بیگم ہی جب اس دنیا میں موجود نہیں تو میرا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔ محض بے کار کاغذ ہے...... میرے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر؟...... جرم کا اقبال!...... قتل عمد! افسوس! ہزار افسوس! جانے کیا پردہ پڑ گیا اس وقت میری عقل پر۔ پردہ پڑ گیا؟ نہیں!...... افضل کی دھمکی! عینی شہادت اور پولیس آزادی یا قید! عزت یا بے آبروئی (وہ تیز تیز سانس لینے لگا) میرے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر...... میں نے بھی کیا غضب کیا؟ اُف! خوفناک غلطی! کتنی مہلک غلطی! میں نے بھی وہ کاغذ اسی وقت تلف کیوں نہ کر ڈالا...... تباہی بربادی! اپنے ہاتھوں بربادی...... اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑا مار لیا۔ (اس کے پسینے چھوٹنے لگے)...... اور اگر یہ کاغذ شریف کے ہاتھ لگ گیا۔ سانپ کا بیٹا سانپ!...... اس نے بیٹھے بیٹھے آنکھیں بند کر لیں۔ شاید اسے اونگھ سی آ گئی تھی۔ گھڑی نے ایک بجایا۔ اس نے ایک پھریری لی۔ اور باہر کے کمرے کی طرف جھانکا۔ عزیز ابھی تک نہیں آیا تھا۔ اس کا شک اب یقین میں بدل گیا تھا۔ یہ دستاویز عزیز ہی نے نکالی تھیں۔''

رات جیسے کٹی سو کٹی۔ جب دن ہوا تو وہ سوچنے لگا کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے پولیس میں اطلاع دے۔ عزیز کو چوری کے الزام میں گرفتار کروائے۔ کئی ایک پولیس کے افسروں سے اس کے اچھے مراسم تھے۔ لیکن کچھ ایسے بھی تھے جن کی نگاہ میں وہ کھٹکتا بھی تھا اور اگر عزیز گرفتار بھی ہو گیا لیکن دستاویزات اس کے پاس سے نہ نکلیں...... شاید اس وقت یہ کاغذ کسی اور کے ہاتھ میں پہنچ چکے ہوں۔ آخر بہت سوچ بچار کے بعد اس نے یہی فیصلہ کیا کہ فی الحال اسے پولیس میں اطلاع نہیں دینی چاہئے۔ شہر کے اکثر غنڈوں اور شہدوں سے بھی اس کی یاد اللہ تھی۔ چنانچہ ان میں سے دو چار جو بھروسے کے آدمی تھے اس نے انہیں عزیز کو ڈھونڈنے پر لگا دیا۔ لیکن عزیز تو ایسا غایب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ!

عزیز تو غائب ہوا ہی تھا۔ لیکن یہ معلوم کر کے اسے اور بھی تعجب ہوا کہ اس کی بھاوج اور شریف بھی سرائے سے غائب ہو چکی ہیں۔ اس نے

بہت سر مارا۔ زور لگایا۔ جو کچھ امکان میں تھا' سب کچھ کیا لیکن نہ زینب اور شریفہ کا ہی اسے کچھ پتہ لگا اور نہ کہیں عزیز کا سراغ ملا۔ جانے کیوں اور کیسے اسے یہ یقین ہونے لگا کہ عزیز یہ دستاویزات لے کر شریف کے پاس صادق آباد گیا ہوگا۔ اس خیال سے اسے ایک نیا خوف دامن گیر ہونے لگا۔ اگر شریف نے یہ دستاویز صادق علی خاں کو دکھا دیں تو پھر؟ گو وہ صادق علی خاں کا مقروض تھا لیکن خاں صاحب اسے ایک بااصول آدمی سمجھتے تھے۔ اور اگر شریف نے یا عزیز نے اس کا کچا چٹھا کھول سنایا تو؟ یہ خیال آتے ہی وہ صادق آباد جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ اور شریف حسین وغیرہ کی روانگی کے کوئی ایک گھنٹہ بعد اس نے بھی صادق آباد کی راہ لی۔

ادھر صادق آباد پہنچتے ہی شریف حسین نے ماں اور بہن کو تو اپنے ڈیرے پر چھوڑا اور عزیز کو ساتھ لے کر صادق علی خاں سے حویلی پر ملنے آیا۔ خاں صاحب ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ شریف حسین کے آنے کی اطلاع پا کر اسی وقت بلوایا۔ شریف حسین جب اندر گیا تو ایک اور نوجوان خاں صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔ شریف حسین اور عزیز نے ادب سے سلام کیا۔

صادق علی خاں نے بیٹھے بیٹھے شریف سے ہاتھ ملایا اور مسکرا کر کہا۔

''شریف آ گئے تم۔ بہت اچھا کیا تم نے''۔ پھر اس نوجوان کی طرف دیکھ کر''۔

''شریف! یہ میرا بھانجا نوازش علی ہے۔ یہ کل ہی یہاں آیا ہے۔ نوازش! دیکھو میں نے تمہارے آنے سے پہلے ہی تمہارے ایک دوست کا انتظام کر رکھا ہے''۔

نوازش علی نے مسکراتے ہوئے شریف حسین سے ہاتھ ملایا اور مزاج پرسی کی۔ پھر دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

''عزیز!'' صادق علی بولا۔ ''تم کیسے آئے۔ اچھے تو ہو؟''

''جان و مال کو دعا دیتا ہوں''۔ عزیز نے ادب سے کہا۔

''بیٹھ جاؤ''۔ صادق علی بولا۔ ''شاہ جی تو اچھے تھے''۔ پھر شریف سے۔

''شریف بہت جلد آ گئے تم!'' لیکن پیشتر اس کے کہ شریف حسین کچھ جواب دے عزیز بولا۔

''خاں صاحب! شریف حسین کی والدہ اور بہن بھی آئی ہیں''۔

''اوہو! سمجھا''۔ صادق علی نے مسکرا کر کہا۔ ''تم اپنی والدہ اور بہن کو لانے گئے تھے لیکن ہم سے تو تم نے کبھی ذکر بھی نہ کیا۔ انہیں وہاں کیوں چھوڑ رکھا تھا''۔

''اب تو حاضر ہو گئیں ہیں''۔ شریف نے جواب دیا۔ ''گو میں نادم ہوں کہ میں آپ سے اجازت لئے بغیر ہی انہیں یہاں لے آیا ہوں اور ٹھہرایا بھی اسی مکان میں ہے جہاں میرا ڈیرا ہے''۔

''تم نے بہت اچھا کیا جو انہیں لے آئے۔ مکان اگر چھوٹا ہو تو دوسرے مکان کا بھی انتظام ہو سکتا ہے''۔ صادق علی نے کہا۔ ''لیکن تم آئے کب؟''

''کوئی ایک گھنٹہ ہوا''۔ شریف نے جواب دیا۔

''اوران کے کھانے کیا انتظام کیا؟'' صادق علی نے پوچھا۔

''پک جائے گا وہیں''۔شریف حسین نے کہا۔

''نہیں نہیں!'' صادق علی بولا۔''کھانا یہاں سے پک کر جایا کرے گا''۔

اس وقت طاہرہ بھی آ گئی۔شریف اور عزیز تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔

''شریف!'' خاں صاحب بولے۔''یہ کیا؟ تم اور طاہرہ کو تعظیم دو۔یہ مجھے پسند نہیں!''

''کب آئے؟'' طاہرہ نے پوچھا۔

''ابھی آئے ہیں اور ان کی والدہ اور ہمشیرہ بھی ساتھ ساتھ ہیں''۔صادق علی نے کہا۔''ذرا خان ساماں سے کہو کہ کھانا وہاں جلد بھیج دے۔اپنی ماما کو بھی بھیج دو''۔

طاہرہ پھر باہر چلی گئی۔نوازش علی کچھ تعجب سے شریف کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''عزیز! تم کیسے آئے؟ شاہ جی نے اجازت کیسے دے دی؟''

''جناب! سانپ کا قرب ہمیشہ خطرناک ہوتا ہے''۔عزیز نے جواب دیا۔

''سانپ کون؟'' خاں صاحب نے ذرا تعجب سے پوچھا۔

''قبلہ!'' عزیز دو ایک بار آنکھیں جھپکا کر بولا۔''شاہ جی اور کون؟ انسان کے روپ میں شیطان''۔

صادق علی نے کچھ اور بھی تعجب سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔''تو بگڑ گئی شاہ جی سے کیا؟ ناراض کیوں ہو گئے؟''

طاہرہ پھر آ گئی۔

''بیٹی! کھانا بھجوا دیا؟'' خاں صاحب نے پوچھا۔

''ابھی چلا جائے گا بابا جان!'' طاہرہ نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا اور صادق علی بولا۔کسی وقت خود بھی جا کر مل آنا۔ان کی ضروریات کا اب تمہیں خیال رکھنا ہوگا''۔

پھر ذرا مسکرا کر۔''طاہرہ تم تو بہت خوش ہو گی کہ تمہیں ایک سہیلی بھی مل گئی''۔

''خاں صاحب!'' عزیز بولا''چھوٹی بی بی بڑی خوبیوں کی لڑکی ہے''۔

''کیا عمر ہے؟'' خاں صاحب نے پوچھا۔

''مجھ سے ایک سال چھوٹی ہے''۔شریف حسین نے جواب دیا۔

''خاں صاحب!'' عزیز حسب عادت آنکھیں جھپکا کر بولا۔''میرا عریضہ تو جناب کو مل گیا ہوگا''۔

''ہاں مل گیا تھا''۔خاں صاحب نے جواب دیا۔''اور میں تمہارا مشکور ہوں کہ مجھے ایک سید زادے کی خدمت کا موقع مل گیا''۔

''سادات اگر سادات کی عزت نہ کریں گے تو کون کرے گا''۔عزیز نے کہا۔''غلام نے بھی ایک دنیا دیکھی ہے۔لیکن یقین مانئے!

شریف میاں ایسا خوددار نوجوان میں نے آج تک نہیں دیکھا اور یہی خودداری شریفہ بی بی نے بھی ورثہ میں پائی ہے"۔

"لڑکی کا نام شریفہ ہے؟" خاں صاحب نے پوچھا۔

"ہاں جناب!" عزیز نے جواب دیا۔

"شریف!" صادق علی مسکرا کر بولا۔ "تم نے تو ہم سے کبھی ذکر ہی نہ کیا"۔

"خاں صاحب!" عزیز آنکھیں جھپکا کر بولا۔ "دلاور حسین ان کے چچا ہیں......"

"شریف کے چچا؟" صادق علی نے بات کاٹ کر تعجب سے پوچھا۔

"ہاں جناب! شریف حسین کے چچا!" عزیز نے جواب دیا۔ "اور چچا نے جو سلوک اپنے مرحوم بھائی کی بیوہ اور اس کے بچوں سے کیا اگر میں عرض کروں تو شاید آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ میں اپنے عریضہ میں تو کچھ مفصل عرض نہ کر سکا۔ شریف میاں کے والد سید دلدار حسین مرحوم ایک بہت معزز آدمی تھے۔ ان کے دادا سید پیر مہتاب شاہ کے ہزاروں مرید تھے۔ سید دلدار حسین مرحوم اور یہ آپ کے دلاور حسین ماں کی طرف سے سوتیلے بھائی ہیں فسادات میں سید صاحب مرحوم کی شاندار حویلی اور تمام اثاثہ جل کر تباہ ہو گیا اور سید صاحب مرحوم بھی جل گئے اور اسی روز ہسپتال میں جاں بحق ہوئے۔ اب خدا کے سوا اور دلاور حسین کے سوا اور کوئی آسرا نہ تھا۔ چنانچہ بڑی بی بی جی اپنے دونوں بچوں کو ساتھ لے کر دلاور حسین کے پاس آ گئیں۔ لیکن جو برتاؤ دلاور حسین نے ان مصیبت کے ماروں کے ساتھ کیا وہ ایک شرمناک داستان ہے اور شریف میاں کی موجودگی میں میں زبان پر لانے کی جرات نہیں کر سکتا۔ شریف میاں کو میں نے ہی فوراً واپس آنے کیلئے لکھا تھا"۔

شریف حسین سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ طاہرہ کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ صادق علی بولا۔

"شریف! مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہارے رتبے کا کماحقہ' خیال نہیں رکھا۔ میں لایا تو تمہیں زمینداری کی دیکھ بھال ہی کے لئے تھا۔ لیکن میں جھوٹ نہیں کہتا۔ تمہیں دیکھتے ہی میرا ارادہ بدل گیا تھا۔ تمہاری شکل وصورت اور تمہاری گفتگو سے مجھے یہ خیال ہو گیا تھا کہ تم ایسے گھٹیا کاموں کے لئے پیدا نہیں کئے گئے۔ اس کے بعد جب سے تم یہاں ہو تمہاری عادات خصائل اور کیریکٹر سے میرا خیال یقین میں بدل گیا۔ تاہم اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو بھئی مجھے معاف کر دو"۔

شریف حسین نے سر اٹھا کر خاں صاحب کی طرف دیکھا۔ اسکی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے منہ سے تو وہ کچھ نہ کہہ سکا لیکن شکر گزاری اور احسان مندی کا اظہار آنسوؤں نے کر دیا۔ یہ لوگ بیٹھے باتیں کر ہی رہے تھے کہ نوکر نے حاضر ہو کر دلاور حسین کے آنے کی اطلاع دی۔

"سلام بولو"۔ صادق علی نے کہا۔

"اگر اجازت ہو تو میں چلا جاؤں"۔ شریف حسین نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟" صادق علی بولا "بیٹھے رہئے"۔

اور عزیز دو ایک بار آنکھیں جھپکا کر بولا۔

"شریف میاں! دیکھئے خدا نے آپ کو شریفانہ انتقام لینے کا کتنی جلدی موقع دے دیا"۔

دلاور حسین اندر آیا لیکن شریف اور عزیز کو دیکھتے ہی اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا اور وہ دروازے میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

"شاہ جی!" صادق علی کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "تشریف لائیے۔ دروازے ہی میں کیوں رک گئے آپ؟"

دلاور حسین نے خاں صاحب سے ہاتھ ملایا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ شریف اور عزیز خاموش بیٹھے رہے۔ صادق علی خاں نے پوچھا۔

"کب تشریف لائے آپ؟"

"ابھی آ ہی رہا ہوں"۔ دلاور حسین نے جواب دیا۔ پھر قہر آلود نگاہوں سے عزیز کی طرف دیکھ کر۔ "یہ چور اور نمک حرام کب آیا یہاں۔ میں اسی کو تو پکڑنے آیا ہوں"۔

"شاہ جی!" عزیز مسکرا کر بولا۔ "چور کا ساتھی چور کو چور نہیں کہا کرتا۔ کیا چرایا میں نے آپ کا؟"

"حرامزادے خاموش رہو" دلاور حسین غصے سے بولا۔ "ورنہ ابھی......"

"ورنہ ابھی"۔ عزیز نے آنکھیں جھپکا کر کہا۔ "ایک دنیا شاہ جی کی کرامات سے آگاہ ہو جائے گی"۔ پھر ذرا مسکرا کر۔ "یہ آپ کے بھتیجے شریف میاں بھی بیٹھے ہیں۔ اچھے چچا ہیں آپ جو ان کی خیر و عافیت بھی نہ پوچھی"۔

"میں کہتا ہوں چپ رہو تم!" دلاور حسین غصے سے کانپ کر بولا۔ پھر خاں صاحب سے "مجھے آپ سے تخلیہ میں کچھ عرض کرنا ہے"۔

"یہاں بھی تو کوئی غیر نہیں"۔ صادق علی نے مسکرا کر کہا۔

شاید دلاور حسین کو اس خشک جواب کی توقع نہ تھی۔ لیکن کسی قسم کی کمزوری دکھانے کا بھی اب موقع نہ تھا۔ "آپ مجسٹریٹ ہیں۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ میرے ملازم کو گرفتار کرلیں"۔ دلاور حسین نے کہا۔

"شاہ جی!" خاں صاحب نے جواب دیا۔ "میرا کام گرفتار کرنا نہیں۔ گرفتار پولیس کرتی ہے۔ میں صرف مقدمہ سن سکتا ہوں اور قانون کے مطابق حکم سنا سکتا ہوں"۔

"تو پھر مجھے پولیس کی چوکی پر جانا چاہئے"۔ دلاور حسین نے کہا۔

"ہاں!" صادق علی نے جواب دیا۔ "گرفتار تو پولیس ہی کر سکتی ہے لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ اپنے پرانے خادم سے ناراض کیوں ہو گئے۔ کیا جرم کیا اس نے؟"

لیکن پیشتر اس کے کہ دلاور حسین کچھ جواب دے عزیز بولا۔

"خاں صاحب! میرے جرائم کی داستان بہت طویل ہے۔ چالیس سال کی طویل داستان اور میری زندگی کا کوئی ایسا واقعہ نہیں جس میں شاہ جی میرے شریک عمل نہ رہے ہوں اور......"

لیکن دلاور حسین قہر آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"بدمعاش! خاموش نہیں رہو گے تم!"

"نہیں!" عزیز نے دو ایک بار آنکھیں جھپکا کر اور اٹھ کر کہا۔ "ہاں! اگر تم چاہتے ہو کہ میں یہ قصہ پولیس کی چوکی پر چل کر بیان کروں تو

چلو میں تیار ہوں......'' پھر دلاور حسین کو کچھ تذبذب میں دیکھ کر۔''شاہ جی! اشش وپنج میں کیوں پڑ گئے آپ۔اٹھئے!''

''بیٹھ جاؤ عزیز!'' صادق علی خاں نے کہا۔عزیز بیٹھ گیا اور بولا۔

''خاں صاحب! میں بیشک ایک مجرم ہوں اور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں میرے جرائم کی داستان بہت طویل ہے۔لیکن میں نے چالیس سال کے عرصہ میں صرف ایک چوری شاہ جی سے مشورہ کئے بغیر کی ہے (دلاور حسین کیطرف دیکھ کر) کیوں شاہ جی! میں غلط تو نہیں کہہ رہا''۔

ماما آئی اور طاہرہ سے مخاطب ہو کر بولی۔''بی بی جی! آپ کے مہمان آ گئے ہیں''۔

''بڑی بی بی جی آئی ہیں؟'' عزیز نے پوچھا۔

''دونوں!'' ماما نے جواب دیا۔

''طاہرہ!'' خاں صاحب بولے'' جاؤ اپنے مہمانوں کو عزت سے بٹھاؤ''۔

طاہرہ اٹھ کر چلی گئی۔دلاور حسین بت کی طرح خاموش بیٹھا تھا۔''شریف حسین دونوں ہاتھوں سے سر تھامے فرش کی طرف دیکھ رہا تھا اور نوازش کبھی کبھی شریف کی طرف دیکھ لیتا اور صادق علی اس بات کا منتظر تھا کہ عزیز اپنا بیان جاری کرے اور وہ غالباً اس انتظار میں تھا کہ طاہرہ بھی آ جائے اور طاہرہ جو یہ قصہ سننے کی سب سے زیادہ مشتاق تھی دو چار منٹ بعد واپس آ گئی۔

''کہاں بٹھایا؟'' صادق علی نے پوچھا۔

''ساتھ کے کمرے میں بیٹھی ہیں اور آپ کو سلام کہتی ہیں''۔طاہرہ نے جواب دیا۔

اور عزیز نے پھر ایک بار دلاور حسین کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''شاہ جی! کچھ کہو تو سہی میں جھوٹ کہہ رہا ہوں یا سچ؟''

''حرامزادے!'' دلاور حسین غصے سے دانت پیس کر بولا''میں نے بہت غلطی کی جو تمہیں پھانسی سے بچالیا۔یاد ہے وہ گاموں مصلی کے قتل کا واقعہ......؟''

''قتل؟'' نوازش علی نے حیرت سے کہا۔''یہ شخص قاتل ہے کسی کا؟''

''قاتل؟'' طاہرہ نے خوفزدہ آواز سے کہا۔''توبہ''۔

لیکن پیشتر اس کے کہ عزیز کچھ کہے شریف حسین بولا۔''قبلہ! بیشک عزیز گاموں مصلی کا قاتل ہے لیکن گاموں کو قتل کروانے والا یہ دلاور حسین ہے جو بدقسمتی سے میرا چچا بھی ہے''۔

''جھوٹ بکتے ہو تم؟'' دلاور حسین نے غصے سے کہا۔''کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟ شاید تمہیں معلوم نہ ہو کہ میرے پاس اس نمک حرام کی تحریر ہے جس میں اس نے اقبال جرم کیا ہے''۔

''کہاں ہے وہ تحریر؟'' عزیز نے پوچھا۔''لائیے دکھائیے''۔

''چراؤ تم اور دکھاؤں میں!'' دلاور حسین غصے سے بولا۔''بدمعاش! بھول گئے اتنی جلدی؟''

''نہیں!'' عزیز نے جواب دیا۔ ''میں نہیں بھول رہا شاہ جی بھول آپ رہے ہیں۔ میرے پاس صرف یہی دستاویز نہیں بلکہ دو اور بھی ہیں۔ ایک معصوم بچی کو زندہ گاڑنے کا اقبال اور دوسرے بیگم غریب کا جعلی نکاح نامہ!''

دلاور حسین کے چہرے کا رنگ متغیر ہونے لگا۔

''کس نے بچی کو زندہ گاڑ دیا؟'' طاہرہ نے خوفزدہ آواز سے پوچھا۔

''شاہ جی!'' عزیز بولا۔ ''جواب دیجئے!''

''آخر یہ قصہ کیا ہے؟'' صادق علی نے تعجب سے پوچھا۔

''قبلہ!'' شریف حسین بولا۔ ''میں عرض کر رہا تھا کہ عزیز نے گاموں مصلی کو دلاور حسین کے اکسانے سے قتل کیا۔ عزیز کا جوانی کا عالم تھا۔ ہمارے گاؤں میں ایک نائن سلامت رہتی تھی۔ منہ چٹ لگتی تھی۔ عزیز کو اس سے محبت تھی لیکن دلاور حسین نے اس گاموں مصلی کے ذریعے جوان کا نوکر تھا سلامت سے ملنے کی راہ نکالی۔ کچھ روز تو چوری چھپے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ لیکن ایک روز ان چوری چھپے کی ملاقاتوں کی عزیز کو بھی بھنک پڑ گئی۔ عزیز دلاور حسین کا رازدار تھا اور دوست بھی۔ چنانچہ......''

''چنانچہ!'' عزیز بات کاٹ کر بولا۔ ''شریف میاں آپ رک جایئے باقی قصہ میں عرض کرتا ہوں۔'' ''شاہ جی کو یہ خوف ہوا کہ میں طیش میں آ کر کہیں انتقام لینے پر آمادہ نہ ہو جاؤں چنانچہ یہ ایک روز میرے یہاں آئے۔ میں نے ان سے گلہ کیا کہ آپ میرے دوست تھے۔ آپ نے جو کچھ کیا۔ آپ کو زیبا نہ تھا۔ اس پر انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ مجھ سے جو کچھ کہا گیا ہے غلط ہے اور سلامت اس مصلی سے کھیتوں میں ملتی ہے چنانچہ انہوں نے اسی رات دونوں کے ملنے کا وقت بھی بتا دیا میں نے ان کی بات کا یقین کر لیا اور رات ہوتے ہی کھیتوں کے پاس چھپ کر بیٹھ رہا۔ کچھ دیر بعد سلامت اور گاموں کی آوازیں آنے لگیں۔ سلامت چلتے چلتے ذرا رک گئی۔ گاموں چلتا چلتا میرے قریب پہنچ گیا اور میں نے اسے اسی جگہ قتل کر دیا سلامت گاؤں کی طرف بھاگ گئی۔ دوسرے روز میں نے شاہ جی سے سارا قصہ کہا اور دوستی کے نام پر ان سے مدد کی درخواست کی۔ انہوں نے مجھ سے اقبال جرم کی ایک تحریر لکھوالی۔ پولیس نے بہت چھان بین کی لیکن قتل کا کچھ سراغ نہ ملا اور میں بچ گیا لیکن یہ بچنا موت سے بھی بدتر تھا''۔

''شریف صاحب!'' نوازش علی نے پوچھا۔ ''لیکن آپ نے کیسے کہہ دیا کہ شاہ صاحب نے گاموں کو قتل کروایا تھا؟''

''خاں صاحب!'' شریف حسین نے جواب دیا۔ ''اس واقعہ کے بہت روز بعد جب ہمارا مکان جل کر تباہ ہو گیا اور ہم گاؤں چلے گئے تو سلامت نے خود ہم سے یہ واقعہ بیان کیا کہ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ عزیز کو اس کے شاہ جی سے چوری چھپے ملنے کا علم ہو گیا ہے تو اس نے مقتول کی معرفت شاہ جی سے کہلا بھیجا کہ اب وہ کچھ روز ان سے مل نہ سکے گی۔ شاہ جی کو اگر سارے گاؤں میں کسی کا خوف تھا تو وہ یہی عزیز تھا۔ اور شاہ جی اسے راستے سے ہٹانے کی فکر میں رہا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک روز انہوں نے سلامت سے کہا کہ وہ عزیز کو زہر کھلا دے لیکن سلامت رضامند نہ ہوئی۔ تو خیر! جب شاہ جی کو سلامت کا پیغام ملا تو انہوں نے مقتول کی معرفت قتل کی رات اُسے کھیتوں میں ملنے پر مجبور کیا۔ اور انکار کی صورت میں کچھ دھمکی بھی دی۔ سلامت بدنامی کے خوف سے شاہ جی سے ملنے پر رضامند ہو گئی۔ ملاقات عموماً رات کے وقت کھیتوں میں ہی ہوا کرتی تھی اور گاموں ہی گاؤں سے سلامت کو لے جایا کرتا۔ چنانچہ اس رات بھی جب وہ گاؤں سے نکلی تو گاموں گاؤں سے باہر اس سے ملا اور دونوں کھیتوں کو ہو لئے۔

سلامت کا دوپٹہ جھاڑیوں میں اُلجھ گیا وہ ذرا رک گئی اور گاموں آگے بڑھ گیا اور عزیز نے اُسے قتل کر دیا۔ یہ ہے کل قصہ!"

"توبہ ہے"۔ طاہرہ نے کہا۔

"محض سپید جھوٹ ہے"۔ دلاور حسین غصے سے بولا۔

"شاہ صاحب!" شریف حسین بولا۔ "سلامت زندہ سلامت موجود ہے۔ اُس نے یہ کل قصہ قتل کے واقعہ کے بہت روز بعد ہماری موجودگی میں گاؤں کے چودھری کی بیوی سے کہا تھا اور اگر میرے کہنے کا اعتبار نہ ہو تو سلامت سے آپ پوچھ سکتے ہیں۔ اماں اور میری بہن شریفہ دونوں یہاں موجود ہیں آپ ان سے بھی پوچھ سکتے ہیں"۔

اور عزیز آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر اور ذرا مسکرا کر بولا۔ "خدا کرے چودھری نے سلامت سے پولیس میں بھی بیان دلوا دیا ہوتا کہ اکیلا میں ہی پھانسی نہ پاؤں' بلکہ میرے دوست اور محسن شاہ جی بھی میرا ساتھ دیں۔ شاہ جی! کہئے تو آمین!"

"کوئی احمق ہی اس بیان پر اعتبار کرے گا"۔ دلاور حسین نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"شاہ صاحب!" نوازش علی بولا۔ "آپ نے عزیز سے اقبال جرم لکھوایا کیوں حالانکہ وہ آپ کا دوست تھا"۔

"اس وقت میں نے یہی مناسب سمجھا"۔ دلاور حسین نے غصہ سے کہا۔

اور عزیز نے پوچھا۔ "جب آپ نے بیگم غریب سے معصوم بچی چھین کر اسے گھر سے نکال دیا تو اس معصوم جان نے کیا خطا کی تھی جو آپ اُسے اسی رات پڑاوے کے پاس زندہ گاڑ آئے اور بھاگتے ہوئے پکڑے گئے"۔

"بیگم کون تھی؟" نوازش علی نے پوچھا اور طاہرہ بولی۔

"وہ معصوم بچی کس کی تھی؟"

عزیز نے بیگم کے اغوا کی داستان۔ پھر بچی کی پیدائش۔ دلاور حسین کے بیگم پر مظالم۔ پھر بچی کو زندہ گاڑنا اور کسی افضل کا اسے موقع پر پکڑنا اور دلاور حسین کا تحریر لکھ کر گلوخلاصی کرانا سب تفصیل وار بیان کیا۔

"توبہ! توبہ! اپنی ہی بچی کو زندہ گاڑ دیا"۔ طاہرہ نے کہا۔

"بیگم زندہ ہے کیا؟" نوازش علی نے پوچھا۔

"مر گئی بیچاری"۔ عزیز نے جواب دیا۔

"اور اس کی لڑکی؟" نوازش علی نے پھر پوچھا۔ "وہ بھی مر گئی کیا؟"

"مجھے معلوم نہیں سرکار"۔ عزیز نے جواب دیا۔

"لیکن لڑکی کو زندہ گاڑتے دیکھا کس نے؟" نوازش علی نے پوچھا۔ "افضل کون تھا؟"

"شاہ جی!" عزیز دو ایک بار آنکھیں جھپکا کر بولا۔ "یہ قصہ اب آپ ہی فرما دیجئے نا"

"نہ بیگم میری بیوی تھی' ورنہ اس کی بچی سے مجھے کچھ واسطہ تھا"۔ دلاور حسین نے جواب دیا۔ "ہاں یہ درست ہے کہ بیگم میرے پاس کچھ

روز رہی ضرور۔لیکن خاں صاحب! کس قدر تعجب ہے کہ آپ ایک ایسے بدمعاش کی بات سچ سمجھ رہے ہیں جو ابھی ابھی آپ سے یہ کہہ چکا ہے کہ اس کی تمام عمر جرائم کرتے گزر گئی"۔

"لیکن آپ بھی تو شامل رہے"۔عزیز نے آنکھیں جھپکا کر کہا۔

ساتھ کے کمرے کا دروازہ کھلا اور اچانک شریفہ کچھ شرماتی ہوئی اندر آئی اور ماتھے تک ہاتھ لا کر بولی۔

"خاں صاحب! سلام عرض کرتی ہوں"۔پھر دلاور حسین کی طرف دیکھ کر۔

"چچا جان! آداب عرض!"

سب شریفہ کی طرف دیکھنے لگے۔گو اس نے بالکل معمولی سا لباس پہنا ہوا تھا لیکن پھر بھی وہ ایسے معلوم ہوتی جیسی سوکھے پتوں والی جھاڑیوں میں گلاب کا پھول۔طاہرہ نے اسے اپنے پاس صوفے پر بٹھالیا۔

"بیٹی!" صادق علی خاں نے پوچھا۔"تم کیسے آئیں؟"

"قبلہ!" شریفہ نے آنکھیں جھکا کر کہا "مجھے بھی کچھ عرض کرنا ہے"۔

پھر اس نے بیگم کی وہ داستان جو اس نے رانی کے نام سے اس کی ماں سے یتیم خانے میں کہی تھی پوری تفصیل کے ساتھ لیکن ذرا جھجک جھجک کر سنائی۔سب خاموش بیٹھے سن رہے تھے۔ایک نوازش علی تھا جو بار بار اس کی طرف دیکھتا۔جب وہ رانی یعنی بیگم کا قصہ کہہ چکی تو دلاور حسین کی طرف جو سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا دیکھ کر بولی۔

"چچا جان!" اگر غیرت اور حجاب مانع نہ ہوتا تو میں اس وقت وہ ناروا اور نہایت غیر شریفانہ برتاؤ جو آپ نے ہم سے روا رکھا بیان کر دیتی۔میں صرف اتنا ہی کہتی ہوں کہ یاد رکھئے خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں۔مظلوموں کا انتقام خدا لے گا"۔

یہ کہنے کے ساتھ اس کی آواز بھرا گئی اور وہ دوپٹہ سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔عزیز اپنی جگہ سے اٹھا اور شریف حسین کی طرف ایک لفافہ بڑھا کر بولا۔

"شریف میاں! یہ سنبھالئے۔یہ تین دستاویزات ہیں۔ایک بیگم مرحومہ سے شاہ جی کا فرضی نکاح نامہ کا کاغذ۔دوسری میرے ہاتھ کا لکھا ہوا قتل کا اقبال اور تیسری شاہ جی کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر جس میں انہوں نے اپنے ہاتھ سے ایک معصوم بچی کو زندہ گاڑنے کا اقبال کیا ہے۔اب آپ جانیں اور آپ کا چچا"۔

پھر اس نے دلاور حسین کی طرف دیکھا اور دو ایک بار آنکھیں جھپکا کر بولا۔

"شاہ جی! اسے کہتے ہیں جیسی کرنی ویسی بھرنی! جس طرح آپ نے مجبور کر کے مجھ سے قتل کا اقبال لکھوایا تھا۔دیکھ لیجئے قدرت نے ایک بے گناہ کا آپ سے کس طرح انتقام لیا۔آپ کو بھی ایک روز اپنے ہاتھ سے ایک معصوم بچی کے قتل عمد کا اپنے قلم سے اقرار کرنا پڑا۔خدا ہم دونوں کے گناہ بخشے!"

"شریف صاحب!" نوازش بولا۔"ذرا یہ دستاویز تو پڑھئے!"

''معاف فرمایئے خان صاحب!'' شریف حسین نے جواب دیا۔''شاہ صاحب کی کمزوریوں کا قصہ آپ ابھی ابھی سن چکے ہیں۔ گو یہ دستاویزات ان کے جرائم کی شہادت ہیں اور گو شاہ صاحب نے چچا ہوتے ہوئے ہم سے ہمیشہ بے حد غیر شریفانہ برتاؤ کیا۔ میری ماں اور میری بہن کو ذلیل سے ذلیل کام کرنے پر مجبور کیا۔ وہ عورت جس کی خدمت کے لئے ایک چھوڑ دو دو مامائیں تھیں اس مظلوم کو ماما گیری کی خدمت پر مجبور کیا۔ میری بہن شریفہ سے ہوٹل میں کام کروایا اور مجھے ہر ممکن طریق سے ذلیل کیا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں اتنا کم ظرف نہیں کہ یہ شرمناک دستاویزات آپ کو پڑھ کر سناؤں''۔

پھر دلاور حسین کی طرف دیکھ کر۔'' گو مجھے آپ کو چچا کہتے ہوئے شرم آتی ہے لیکن آپ بزرگ ہیں اور میں آپ کا بیٹا ہوں اس لئے مجھے آپ کا ادب ہی کرنا چاہئے۔ غالباً ہم سب سے زیادہ ان دستاویزات کی اہمیت آپ کو معلوم ہوگی۔ آپ کو خیال ہوگا کہ آج جب یہ خوفناک دستاویزات میرے قبضے میں ہیں تو شاید میں ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں گا۔ اور آپ سے انتقام لوں گا۔ لیکن نہیں! میں اتنا کمینہ نہیں کہ اپنے والد مرحوم سید دلدار حسین کے بھائی سے انتقام لوں''۔

یہ کہہ کر اس نے تینوں دستاویزات پھاڑ کر دلاور حسین کی طرف پھینک دیں اور بولا۔'' چچا جان! ہم نے آپ کو معاف کیا خدا بھی آپ کو معاف فرمائے''۔ یہ کہنے کے ساتھ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ اس نے رومال نکال کر آنکھوں پر رکھ لیا۔

''آفریں ہے''۔ صادق علی خاں بولا۔''ہزار آفریں میاں شریف تمہاری شرافت پر''۔ پھر دلاور حسین کی طرف دیکھ کر۔

''شاہ جی! آپ جانتے ہیں کہ میں ایک مجسٹریٹ ہوں اور آپ قانون کی نگاہ میں ایک جرم نہیں بلکہ بہت سے سنگین جرائم کر چکے ہیں۔ اگر میں چاہوں تو آپ کو ابھی گرفتار کر سکتا ہوں۔ لیکن نہیں مجھے آپ سے ایک مدت سے نیاز حاصل ہے اس لئے جس طرح آپ کے بھتیجے اور بھتیجی نے آپ کو معاف کیا ہے میں بھی آپ کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا اور آپ کا معاملہ خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ خدا آپ پر رحم کرے''۔

دلاور حسین کے خوف اور ندامت سے پسینے چھوٹ رہے تھے چہرے پر ایک رنگ آتا ایک جاتا۔ سب خاموش بیٹھے تھے۔ طاہرہ جسے اس معصوم بچی سے قدرتاً ہمدردی ہو رہی تھی بولی۔

''جانے اُس بچی کا کیا ہوا۔ اگر زندہ ہے تو اب تو جوان ہوگی۔ بیگم یارانی نے اس کا کچھ حلیہ یا کوئی اور نشانی بھی تو بتائی ہوگی''۔

''ہاں!'' شریفہ نے جواب دیا۔''مرنے سے دو ایک روز پہلے اس نے اپنی کلائی پر سے کپڑا اٹھا کر سرمہ سے گدا ہوا ایک چوکلیہ پھول ہمیں دکھایا تھا اور کہا تھا کہ اگر اس کی بچی زندہ ہے تو اس کی کلائی پر بھی ایسا ہی پھول ہوگا۔ بچی کو یاد کرتے کرتے مر گئی۔ بیچاری''۔

صادق علی خاں نے کچھ اس حیرت سے شریفہ کی طرف دیکھا کہ اس کی آنکھیں خود بخود جھک گئیں۔ لیکن طاہرہ نے اچانک ایک چیخ ماری اور بیہوش ہو کر شریفہ کی گود میں گر پڑی اس کی کلائی پر بھی ویسا ہی پھول تھا۔ طاہرہ کے بیہوش ہوتے ہی سب اس کی طرف لپکے۔ دلاور حسین موقع پا کر چپکے سے نکل گیا۔ طاہرہ نکاح نامے کی رُو سے جو شریف حسین نے دوسری دو دستاویز کے ساتھ غلطی سے پھاڑ ڈالا تھا دلاور حسین اور بیگم کی بیٹی تھی۔

خوابِ جوانی

ندیم! دورِ حزن و یاس کس قدر عجیب تھا
نفس نفس عذاب و قہرو کرب کا نقیب تھا
نہ منزلوں کا ہوش کچھ نہ راہبر قریب تھا
جوانیاں غلام۔ عزم تک ستم نصیب تھا
مگر چلو کہ آج تو کھلی رہ نجات ہے
جدھر نظر اٹھایئے حیات ہی حیات ہے

(نیاز حیدر)

اب مناسب یہی ہے کہ ان الم انگیز واقعات کو گردش زمانہ کی گود میں سلا دیا جائے اور شریف حسین کے خواب جوانی کی تعبیر مختصر طور پر بیان کردی جائے۔

طاہرہ کو یہ معلوم ہونے سے کہ اس کی ماں کا نام بیگم تھا اور اسکے باپ دلاور حسین نے اس غریب پر بڑے بڑے خوفناک مظالم توڑے تھے اور اسکے سنگدل باپ نے اس کی ماں کو گھر سے نکال کر اسے جب وہ ایک معصوم جان تھی زندہ گاڑ دیا تھا کچھ ایسا صدمہ ہوا کہ وہ بیہوش ہوگئی اور جب ہوش آیا تو ماں کو پکارنے لگی۔ اسی طرح ماں کو پکارتے اور ادھر اُدھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہوئے جیسے کوئی کسی کو تلاش کرتا ہے اس پر بیہوشی طاری ہو جاتی۔ پہلے تو قصبہ کے ڈاکٹر نے آ کر دیکھا بھالا۔ پھر صادق علی خاں نے شہر سے ایک بہت قابل ڈاکٹر کو بلوایا۔ ڈاکٹر نے دیکھ بھال کر کہا کہ دماغ کو سخت صدمہ پہنچا ہے اور امید ظاہر کی کہ پانچ سات روز تک اثر زائل ہو جائے گا لیکن مریضہ کے پاس کسی قسم کا شور وغل نہیں ہونا چاہئے۔ شریفہ اور اس کی ماں بڑی محبت سے اس کی تیمارداری کرنے لگیں اگلے روز جو شہر سے اخبارات آئے تو ان میں ''گرین ہوٹل کے مالک کی خودکشی'' کے عنوان کے تحت دلاور حسین کی موت کی خبر دی گئی تھی۔ دلاور حسین نے واپس جا کر اسی رات زہر کھا لیا تھا اور صبح وہ اپنے بستر پر مردہ پایا گیا۔

دلاور حسین کے مرنے کا افسوس اگر کسی کو ہوا تو اس کی بھاوج زینب کو ہوا۔ لیکن اس کی یہ آرزو کہ ایک روز اس کے بچے اس کی جائیداد کے وارث ہوں گے پوری نہ ہو سکی کیونکہ اس کے مرنے کے بعد یہ راز کھلا کہ مرحوم کا بال بال قرض میں بندھا ہوا تھا اور تمام اثاثہ جو وہ چھوڑ مرا تھا قرض کی کفالت نہیں کرسکتا۔ طاہرہ کی علالت کے دوران میں چونکہ نوازش علی بھی مریضہ کو دن میں کئی کئی بار دیکھنے آتا تھا اور اسے شریفہ سے بھی بات چیت کرنے کا موقع ملتا تھا اس لئے دونوں میں جو ایک حجاب سا تھا وہ بھی اُٹھ گیا۔ صادق علی خاں نے حویلی ہی میں شریف اور اس کی ماں اور بہن کے

رہنے کو دو چار کمرے دیدیئے تھے۔اور کھانا بھی سب مل کر ہی کھاتے تھے اس لئے سب ایک ہی کنبہ کے افراد معلوم ہوتے......شریف حسین کو ایک روز بیچ میں چھوڑ کر شہر میں طاہرہ کے متعلق ڈاکٹر سے مشورہ کرنے جانا پڑتا۔اور وہ اب خاں صاحب کی موٹر ہی میں جاتا اور خاں صاحب کی نوازشات اس پر پہلے سے بھی زیادہ تھیں۔آخر پندرہ بیس دن کے بعد خدا نے طاہرہ کو شفا دی اور وہ پھر چلنے پھرنے کے قابل ہوگئی۔طاہرہ شریف حسین کی ماں اور بہن کی ہمدردی سے اتنی متاثر ہوئی کہ اب وہ بھی اسے ماں ہی کہتی تھی اور شریفہ سے بہن کی طرح پیار کرتی۔شریف اور طاہرہ اب بھی دونوں سیر کو جاتے۔لیکن اب وہ پہلی سی آزادی نہیں تھی کیونکہ اب نوازش اور شریفہ بھی ساتھ ہوتے اور طاہرہ دونوں سے کبھی کبھی مذاق بھی کیا کرتی۔خاں صاحب کی طرح نوازش علی بھی ایک خوش طبع اور شریف آدمی تھا اور شریف اور نوازش میں اب گہری چھنتی تھی لیکن اس خیال سے کہ نوازش علی ایک امیر کبیر آدمی کا بھانجا ہے اور غالباً وارث بھی ہو شریف ہر بات میں اس کا ادب ملحوظ خاطر رکھتا اور یہی وطیرہ شریفہ نے طاہرہ سے بھی اختیار کر رکھا تھا۔عزیز اب صادق علی خاں کی خدمت میں رہتا تھا۔مگر نوازش علی دو چار روز سے کچھ چپ سا نظر آتا۔لیکن طاہرہ ہی کو اس کی خاموشی کی وجہ معلوم تھی۔

چاندنی رات تھی اور بہار کا موسم تھا۔رات کا کھانا کھانے کے بعد طاہرہ اور شریفہ حویلی کے وسیع صحن میں چہل قدمی کر رہی تھیں اور دونوں میں کچھ راز کی باتیں بھی ہو رہی تھیں طاہرہ شریفہ سے کہہ رہی تھی۔

''شریفہ!ایک بات پوچھوں لیکن سچ بتانا''۔

''تو میں تم سے جھوٹ بھی کہوں گی کیا۔تمہارے احسانات سے میں مر کر بھی سبکدوش نہیں ہوسکتی''۔

''شریفہ!'' خدا کے لئے یہ احسانات کا قصہ اب ختم کردو۔خدا کی قسم!جب تم اس قسم کی باتیں کرتی ہو تو مجھے شرم سی آنے لگتی ہے''۔

''طاہرہ!'' شریفہ نے جواب دیا۔''جو شخص بندے کا شکر گزار نہیں وہ خدا کا بھی نہیں'پھر حفظ مراتب کو بھولنا تو کمینگی ہے۔تم جو کچھ ہو وہ مجھے معلوم ہے اور میں جو کچھ ہوں تم سے چھپا نہیں''۔

''اب کچھ اور بھی کہنا ہو تو وہ بھی کہہ لو''۔طاہرہ نے جواب دیا۔''میں تو تمہیں اپنی بہن سمجھتی ہوں لیکن تم ہمیشہ الٹی کتھا ہی سناتی ہو۔خدا کی قسم!تم نے تو میری کایا ہی پلٹ دی۔میں جو کبھی نماز کے نام سے بھاگتی تھی اب تمہاری وجہ سے یہ فرض بھی پورا ہو رہا ہے ہوسٹل میں ایک مدت رہنے کے باعث مجھے پردہ سے نفرت ہونے لگی تھی اور بابا بھی کچھ اتنا خیال نہ کرتے تھے لیکن یہ تمہاری صحبت کا ہی اثر ہے کہ میں اب ارکان اسلام کا احترام کرنے لگی ہوں میں تو تمہاری ہر بات مانوں لیکن تم بھی میری خاطر سے ہی اب یہ ہر وقت احسان مندی کی کتھا تو چھوڑ دو''۔

شریفہ نے کچھ جواب نہ دیا۔طاہرہ بولی۔

''سچ کہو تم سے نوازش نے کبھی کچھ کہا بھی تھا؟''

''ہاں مجھ سے شادی کے لئے کہا تھا''۔شریفہ نے جواب دیا۔

''کب؟'' طاہرہ نے پوچھا۔

''پانچ سات روز ہوگئے''۔

''تم نے کیا کہا؟'' طاہرہ نے پوچھا۔

''وہی جو مجھے کہنا چاہئے تھا''۔

''کیا کہا تھا؟'' طاہرہ نے پوچھا۔'' حامی بھرلی۔

''نہیں!'' شریفہ نے جواب دیا۔'' انکار کر دیا''۔

''نوازش علی تمہیں پسند نہیں کیا؟'' طاہرہ نے پوچھا۔'' کوئی بات ناگوار ہوئی ہوگی اس کی؟''

''بالکل نہیں''۔شریفہ نے جواب دیا۔''نوازش ایک بہت شریف آدمی ہے اور میں یہ تسلیم کرتی ہوں کہ میرے انکار سے اسے رنج بھی ہوا ہے لیکن فرض کے احساس نے مجھے مجبور کر دیا طاہرہ!''

''جب نوازش علی تمہیں پسند بھی ہے اور انکار کا افسوس بھی ہے تو پھر انکار کی وجہ؟'' طاہرہ نے پوچھا۔

''بس مجبوری!'' شریفہ نے آہ بھر کر کہا۔

''کوئی ایسی ہی مجبوری ہے جو تم مجھ سے نہیں کہنا چاہتیں''۔طاہرہ نے پوچھا۔گویا مجھ پر بھی اعتماد نہیں۔خدا کی قسم! تمہارے بھائی کی بھی یہی عادت مجھے پسند نہیں۔دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے لیکن وہ حضرت کبھی دل کی بات نہ کہیں گے''۔

''گویا تمہیں شریف سے بھی شکوہ ہے؟'' شریفہ نے مسکرا کر پوچھا۔

''تم دونوں سے''۔طاہرہ نے جواب دیا۔

''کیونکہ ہم دونوں مجبور ہیں''۔شریفہ نے کہا۔

''تمہارے بھائی سے تو کچھ کہنا لاحاصل ہے''۔طاہرہ بولی۔''لیکن تم سے مجھے ایسی امید نہ تھی کہ تم مجھ سے بھی رازداری سے کام لوگی''۔

''طاہرہ!'' شریفہ چلتے چلتے رک کر بولی۔کبھی مخمل میں ٹاٹ کا پیوند بھی سجتا ہے۔جو شخص بھی اپنی اصلیت کو بھول جائے وہ انسان ہی نہیں۔میں اندھی بھی نہیں اور انجان بھی نہیں۔یقین مانو! میں اور میرا بھائی دونوں مجبور ہیں ہم کوئی ایسی بات نہیں کر سکتے جو ہمارے محسن کی ناراضگی کا باعث ہو اور ہم ان کی نظروں سے گر جائیں۔جوانی اندھی ہوتی ہے طاہرہ! اور محبت بے لگام! لیکن اگر فرض کا احساس ہو تو لڑکھڑاتا ہوا قدم بھی سنبھل جاتا ہے۔تمہیں شاید معلوم نہیں' میرے بھائی کو صرف ایک ہی دھن لگی ہے۔وطن کی تو اور کھوئی ہوئی عزت کو حاصل کرنا۔یہی اس کی زندگی کا خواب ہے لیکن ابھی تک یہ خواب پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔جس نوجوان کو یہ فکر کھائے جا رہا ہو۔تم ہی بتاؤ کیا وہ قابل رحم نہیں؟''

''صرف قابل رحم ہی نہیں بلکہ قابل عزت بھی''۔طاہرہ نے جواب دیا۔''بہر کیف میں خوش ہوں کہ تم شریف سے زیادہ صاف گو ہو''۔

نکھری نکھری چاندنی۔ہوا میں بہار کی مستی۔رات کی خاموشی میں بھی پھول جو صحن کی زینت تھے کلیوں کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔یا شاید طاہرہ اور شریفہ کی بہارِ حسن پر مسکرا رہے ہوں۔

اور دوسرے روز صادق علی خاں کی خوابگاہ میں شریف ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور صادق علی خاں پلنگ پر لیٹا اس سے باتیں کر رہا تھا۔

''شریف! میں خدا کا شکر گزار ہوں کہ میرا قیاس غلط نہیں نکلا۔تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے پہلے ہی روز تم سے کہا تھا کہ میرے پاس ایک

امانت ہے اور تمہیں بھی اس امانت کی حفاظت کرنی ہوگی۔ شاباش! مجھے تم سے ایسی ہی توقع تھی۔ تم اس امتحان میں خوب پورے اُترے اور تمہارے امتحان کی کٹھن منزلوں سے بھی میں ناواقف نہیں لیکن اب مجھے بھی اجازت دو کہ میں بھی اپنا فرض پورا کروں''۔

''میں ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں''۔ شریف نے جواب دیا۔ ''آپ کے احسانات......''

''دیکھو شریف میاں!'' صادق علی خاں بات کاٹ کر بولا۔ ''یہ احسانات کا قصہ تو اب کافی پرانا ہو چکا ہے۔ شاید تمہیں معلوم نہ ہو لیکن مجھے معلوم ہے کہ کل رات میری دونوں بیٹیوں میں کیا گفتگو ہوئی تھی مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ میری بیٹی شریفہ بڑی سمجھدار لڑکی ہے''۔

''آپ کی عنایت ہے جو آپ ایسا خیال فرماتے ہیں''۔ شریف حسین نے مودبانہ طریق سے کہا۔

''تو ہاں!'' صادق علی خاں بولا۔ ''اب تم مجھے بھی اپنا فرض ادا کرنے کی اجازت دو۔ لیکن فرض ادا کرنے سے پہلے مجھے تم سے بھی ایک چیز مانگنی ہے۔ ایک ایسی چیز جو تمہیں بے حد عزیز ہے اور جس سے جدا ہونے کا تمہیں یقیناً افسوس بھی ہوگا۔ لیکن مجھے اُمید ہے کہ ایک بوڑھے آدمی کی درخواست تم رد نہ کرو گے''۔

''انشاءاللہ! مجھے انکار نہ ہوگا''۔ شریف نے جواب دیا۔

''مرحبا!'' صادق علی نے کہا۔ ''تم میری بیٹی شریفہ مجھے دے دو مجھے معلوم ہے کہ تمہیں وطن جانے کی آرزو ہے۔ جب تم چلے جاؤ گے تو میں یہاں پھر اکیلا رہ جاؤں گا۔ شریفہ میرے پاس ہوگی تو زندگی کے چار دن شاید آرام سے گزر جائیں۔ منظور ہے کیا؟''

''قبلہ!'' شریف نے صادق خاں کی طرف دیکھا۔ ''مجھے تو کوئی انکار نہیں لیکن مجھے ماں سے بھی اجازت لینی ہے''۔

''اگر اتنا ہی اعتراض ہے تو پھر تمہاری والدہ سے میں اجازت لے چکا ہوں اور انہوں نے یہ معاملہ تمہاری مرضی پر چھوڑ دیا ہے''۔ صادق علی خاں نے جواب دیا۔

''تو پھر مجھے بھی انکار نہیں''۔ شریف حسین نے ہولے سے کہا۔

''مرحبا!'' صادق علی خاں نے خوش ہو کر کہا۔ ''مجھے تم سے ایسی ہی امید تھی''۔ پھر ذرا مسکرا کر ''شریف! طاہرہ کے حالات اب تم سے چھپے نہیں۔ لیکن شاید تمہیں معلوم نہیں کہ طاہرہ مجھے ملی کیسے؟ آج سے سترہ اٹھارہ برس پہلے کی بات ہے میں اپنی بہن کے پاس گیا ہوا تھا اُس وقت میری مالی حالت کچھ ایسی اچھی نہ تھی۔ میری بہن کے پڑوس میں ایک غریب آدمی اور ایک عورت رہتے تھے۔ مرد شاید کہیں شہر میں کام کرتا تھا کبھی یہاں کبھی وہاں! ان کے پاس کوئی سال ایک کی بڑی خوبصورت بچی تھی۔ لیکن یہ دونوں اس معصوم جان کی کچھ پروا نہ کرتے۔ ایک روز میری بہن نے مجھ سے یہ ذکر کیا۔ میں نے جب اس بچی کو دیکھا تو مجھے گمان ہونے لگا کہ اتنی خوبصورت بچی ان کی نہیں ہو سکتی۔ میں نے ان سے بات چیت کی تو اُس شخص نے بتایا کہ یہ لڑکی اسے سڑک پر پڑی ملی تھی۔ تو قصہ مختصر میں نے کچھ دے دلا کر لڑکی ان سے لے لی۔ اس کی ابتدائی زندگی میری بہن کے پاس ہی گزری اور اسی نے اس کا نام طاہرہ رکھا۔ اس بچی کی کلائی پر ایک چوکلیہ پھول تھا اور میری بہن اکثر کہا کرتی تھی کہ اس پھول سے لڑکی کی ماں کا پتہ لگے گا جو آخر لگ ہی گیا۔ طاہرہ کوئی پانچ سال کی تھی کہ میں نے لڑکیوں کے ایک ہوسٹل میں اسے بھیج دیا۔ وہ تقریباً دس سال ہوسٹل میں رہی پھر خدا نے میرے دن پھیرے اور میں اسے یہاں لے آیا۔ تو یہ ہے طاہرہ کے میرے پاس آنے کا قصہ! تم سے جو واقعات پیش آئے ہیں اُنہیں میں

قدرت کا کھیل سمجھتا ہوں۔اب اگر تم مجھے اجازت دو تو میں طاہرہ کی تم سے شادی کر دوں۔میرا بھانجا نوازش علی میری بہن کا اکلوتا لڑکا ہے۔بہن کو مرے ہوئے بہت روز ہو چکے ہیں۔نوازش علی جیسے کہ تمہیں معلوم ہے بہت شریف اور نیک دل لڑکا ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ شریفہ کی اس سے شادی ہو جائے اور میں تمام جائیداد طاہرہ اور نوازش علی میں برابر تقسیم کر دوں۔تمہیں تو کچھ اعتراض نہیں"۔

"آپ کی عنایت ہے قبلہ!" شریف حسین نے ذرا دبی زبان سے کہا۔

صادق علی بولا۔"تمہارا وطن یہاں سے کچھ ایسا دور نہیں۔ایک رات کا راستہ ہے صرف! تم اگر چاہو تو یہاں رہو۔چاہو تو اپنی بیوی کے ساتھ وطن چلے جاؤ۔جائیداد کی آمدن انشاءاللہ تم دونوں کی ضروریات سے زیادہ ہو گی"۔

شریف حسین کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے اور صادق علی کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

شریف اور صادق علی کی اس گفتگو کے بعد شریفہ کی نوازش علی سے اور طاہرہ کی شریف حسین سے شادی ہو گئی اور صادق علی نے جائیداد دونوں میں تقسیم کر دی۔شادی کے بعد شریف حسین کچھ عرصہ تو صادق آباد میں ہی رہا پھر وہ بیوی اور ماں کے ساتھ اپنے وطن آ گیا اور اسی جگہ جہاں اس کا باپ رہتا تھا از سر نو ایک عالی شان مکان بنوا کر رہنے لگا لیکن فرق صرف اتنا تھا کہ جس مکان پر پہلے کانگرس کا ترنگا جھنڈا لہراتا تھا آج اُس پر پاکستان کا پرچم لہرا رہا تھا۔

اور یہ تھی شریف حسین کے خوابِ جوانی کی تعبیر!

حرف آخر:۔21 جون 1947ء

دس بجے شب

(گلشن لینڈز۔کوہ مری)